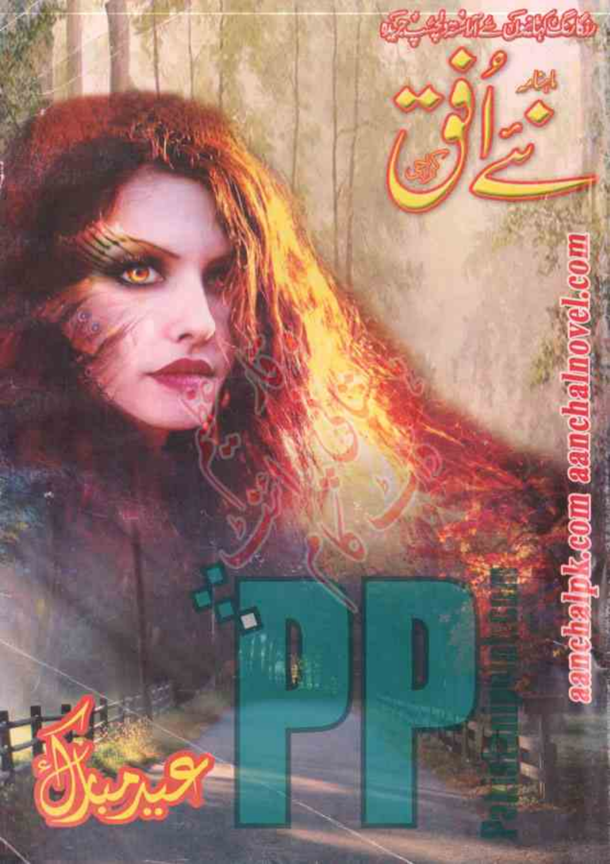

ماہنامہ
نئے افق
کراچی
aanchalnovel.com
aanchalpk.com
عید مبارک

صفحہ	عنوان	مصنف
10	دستک	مشتاق احمد قریشی
12	گفتگو	عمران احمد
18	اقرأ	طاہر قریشی
20	کیچڑ کا کنول	ڈاکٹر ایم اے قریشی
48	کاغذی رشتے	عامر زمان عامر
60	قلندر ذات	امجد جاوید
106	احساس	نیم سکینہ صدف
112	اسیر غم	مہر پرویز
122	نظر فریب	حسام بٹ
150	منک کوٹ	محمد جاذب
162	روپ بہروپ	[illegible]
216	عروس آزادی	نزہت قمر
252	ذوق آگہی	سباس گل
254	خوشبو سخن	نوشین اقبال نوشی
256	فلسطین	الماس ایم اے
289	دلی کے بانکے	مشتاق احمد قریشی

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ہم نے اپنے پیر پر خود کلہاڑی ماری ہے

گزشتہ دنوں آصف علی زرداری صاحب نے اپنے قد سے اونچا اڑنے کی کوشش کی تو منہ کے بل گرے وہ اپنی موج مستی میں بھول گئے کہ جس دھرتی پر وہ کھڑے ہیں وہاں بہت سے کان بہت سی آنکھیں انہیں دیکھ اور سن رہی ہیں ان کے حامیوں کے علاوہ بہت زیادہ ہیں انہوں نے اپنے سے بڑا لقمہ نگلنے کی کوشش کی جوان کی ہی نہیں بلکہ ان کی پارٹی کے دیگر افراد اور اراکین کے گلے میں پھنس کر رہ گیا انہوں نے بیل کے آگے بین بجانے کے بجائے بیل کے آگے سرخ ململ لہرادی انہیں گمان تھا کہ سرکاری بیل دم دبا کر بھاگ نکلے گا ان کے لیے میدان صاف چھوڑ جائے گا لیکن اس طرح الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں لینے کے دینے پڑ گئے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں گڑے مردے نہ اکھاڑ دیے جائیں۔ اسی سبب اب ان کے حواریوں نے کان دبا کر رات کے اندھیرے میں دبئی کا رخ کرلیا ہے۔ دبئی ان کا ہمیشہ سے کمیشن آفس جو رہا ہے۔

سندھ میں آج کل زرداری صاحب کے حامیوں کی نہیں بلکہ ان کے کمداروں کی حکومت ہے جو زرداری صاحب کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ زرداری صاحب آپ چاہیں ماضی دیکھیں یا حال یا مستقبل وہاں صرف دونوں ہاتھ سے دولت کا ہر نا جائز طریقے سے سمیٹنا ہی دکھائی دیتا ہے۔ لوٹ کی کمائی کو وہ اپنے خون پسینے کی کمائی تصور کرتے ہیں عاقل اور دانشمند لوگ کہتے ہیں کہ دولت جس طرح آتی ہے اسی طرح چلی بھی جاتی ہے شاید یہی سبب ہے کہ بقول ڈاکٹر شاہد مسعود کے زرداری صاحب صرف ایک رات کی موج مستی کے لیے لاکھوں ڈالر خرچ کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی پیسے کا درد تو اُنہیں ہوتا ہے جس کی حلال کمائی ہوتی ہے۔ لوٹ مار، بھتہ مافیا کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت تو اسی طرح لٹائی جاتی ہے۔ زرداری صاحب کا تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں نے لوٹ مچا رکھی ہے۔ سندھ میں گرمی کی شدت سے مرنے والوں کی تعداد سیکڑوں سے نکل کر ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن حکمرانوں کو تو بجلی کے ساتھ ساتھ ایئر کنڈیشن کمرے میسر ہیں۔ انہیں عوام جو بجلی پانی کی نایابی کا شکار ہیں کی پریشانی کا احساس تک نہیں۔ گرمی کی شدت سے ہر روز سیکڑوں لوگ مر رہے ہیں قبرستانوں میں دفن کرنے کے لیے جگہ نہیں رہی، سرد خانوں میں میتیں رکھنے کی گنجائش نہیں رہی، ایمبولینس میتوں کو لانے لے جانے کے لیے کم پڑ رہی ہیں، میت دفنانے کے گورکن منہ مانگے دام مانگ رہے ہیں۔ مرنے والوں کے لواحقین پر دہری

مشکل آن پڑی ہے نہ اُگلے بن رہی ہے نہ نگلے بن رہی ہے، لاشیں گلنے سڑنے لگی ہیں کہ کہاں اور کیسے دفنائی جائیں، ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ وفاق صوبے کو اور صوبہ وفاق کو ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے ایک دوسرے پر ملبہ ڈالا جا رہا ہے مرنے والوں کا ان کے عزیز و اقارب کا کوئی پرسان حال نہیں عوام جو پہلے ہی مہنگائی کا شکار ہیں رمضان کے روضے اور دیگر عبادات پر بھی توجہ نہیں دے پا رہے گرمی کی شدت سے مرنے والے تو مر ہی رہے ہیں لیکن ان کے پیچھے رہ جانے والوں کو گرمی کی شدت کے ساتھ ساتھ مرنے والے کی تدفین اور کفالت کی مصیبت کے عذاب کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے نہ جائے رفتن نا پائے مانند ایسے موقع پر حکومت کو چاہیے تھا کہ گرمی کی شدت کا شکار ہونے والوں کی تدفین کا بندوبست سرکاری طور پر کرتی اور کسی نئی جگہ کو قبرستان بنا کر وہاں سرکاری خرچہ پر تمام انتظامات کرتی۔ یوں عوام کو دہری مشکل تو نہ پیش آتی۔ کیا اپنے پیاروں کی موت کا صدمہ کم ہوتا ہے کہ انہیں آخری منزل پہنچانے کی پریشانی بھی کسی طرح کسی شدید صدمے سے کم نہیں اور تو اور سنا ہے کہ قبرستانوں میں گورکنوں کا سیزن لگا ہوا ہے وہ بھی دونوں ہاتھوں سے مرنے والوں کے عزیز و اقارب کو لوٹ رہے ہیں۔ خبروں کے مطابق ایک ایک قبر کی جگہ کے پچاس ہزار تک مانگ رہے ہیں لیکن حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔

کہنے والے تو کہہ رہے ہیں کہ حکمران تو اپنی مصیبت کے نکلنے کے راستے ڈھونڈ رہے ہیں زرداری صاحب نے سب کو ہی اپنے ساتھ مشکل میں ڈال دیا ہے ہر کوئی اپنی جان بچا کر ملک سے بھاگنے کے چکر میں ہے۔ وہ کیسے عوامی مشکل کی گھڑی میں عوام کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ وہ اب بھی ملک سے بھاگنے میں اپنے سربراہ جناب زرداری کا ساتھ دے رہے ہیں اور اپنی لوٹ کا مال سمیٹ کر نکلنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں اس مصیبت کی گھڑی میں اپنے بھاگ نکلنے کی راہ ہی سجائی دے رہی ہے۔ وہ کیسے کسی اور کی مصیبت کو محسوس کر سکتے ہیں ان کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں ان کے تو خود اپنے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی ہے۔ یقیناً یہ اللہ کا عذاب ہے کیونکہ عوام نے اپنے لیے ایسے بددیانت چوروں کو منتخب کر کے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی جو ماری ہے۔

❖

گفتگو

عمران احمد

> ”حضرت سفیان بن اسید حضرمی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا، بہت بڑی خیانت کہ تو اپنے بھائی سے کوئی بات کہے۔ وہ تیری خاطر اس بات کو درست سمجھے حالانکہ حقیقت میں تو اس سے جھوٹ بول رہا ہو۔“ (ابوداؤد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

تمام قارئین کو جشن آزادی اور عیدالفطر مبارک ہو۔

جب ہم یہ سطور تحریر کر رہے ہیں رمضان المبارک کا نصف ماہ مکمل ہو چکا ہے مگر اس ماہ گرمی کی شدت سے ہونے والی تقریباً ڈھائی ہزار (ایک محتاط اندازے کے مطابق) اموات نے اس ماہ مبارک کی خوشیوں کو قدرے دھندلا دیا ہے اس پر ہمارے حکمرانوں کی سیاست بازی نے عوام کے دلوں کو مزید دکھی کر دیا ہے ہمارے علما نے اسے عذاب خداوندی قرار دے کر سارا زور توبہ واستغفار پر صرف کر دیا ہے۔ ہم سیاست دانوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتے انہیں ہم نے خود ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے منتخب کیا ہے لیکن ہمیں لفظ عذاب خداوندی پر اعتراض ہے کیونکہ قدرت کے نظام میں مداخلت سے دنیا بھر کا موسمی نظام تبدیل ہو رہا ہے آلودگی نے خلا میں اوزون کی چادر میں سوراخ کر دیے ہیں جس سے سورج کی کرنیں فلٹر ہونے کے بجائے براہ براست زمین پر آ رہی ہیں اور طرح طرح کے امراض کا سبب بن رہی ہیں۔ یہ سب مصائب ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ پر الزام دھرنے سے قبل ہمیں اپنے کرتوتوں کا جائزہ لینا چاہیے۔

اب آئیے اپنے خطوط کی طرف۔

〈اس ماہ کا انعام یافتہ خط〉

ساحل ابڑو...... بلوچستان۔ قابل احترم عمران بھائی۔ السلام علیکم امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال زیر قلم ہے کہ جولائی کا تازہ شمارہ نئے افق 24 تاریخ کو ملا، بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ کہ اس بندہ ناچیز کو اتنی بڑی عزت دی اور ہماری ٹوٹی پھوٹی تحریروں کو نئے افق میں جگہ دی ایک بار پھر بہت بہت شکریہ۔ عمران بھائی ادب کیا ہے ہمیشہ کے لیے اس کو سیکھنے کی کوشش کی نئے افق کو دیکھا پڑھا اسے ہمیشہ کیلئے نزدیک پایا۔ اس سے ادب شناسی کی روشنی پائی نئے افق وہ ادبی جریدہ ہے جس کی خوشبو سے یہ ادبی محبت مہک اٹھتی ہے اور من کے اندر زمزمہ پرواز گیت گنگناتا ہے۔ اقبال بھائی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ تو پورا نہیں کر سکتا کیونکہ گرمی اف اللہ اور رمضان المبارک کا مہینہ سبحان اللہ سارا دن روزے سے محنت مزدوری کرنا اور رات کو تراویح سے فارغ ہو کر سو جانا جس کی وجہ سے میں جولائی کے شمارے پر پورا تبصرہ نہیں کر سکتا۔ البتہ چند الفاظ ضرور تحریر کروں گا جو چند دن پہلے مجھے کسی رائٹر کا ایس ایم ایس ہوا کہ ساحل آپ نے آزادی کے موضوع کا کیوں انتخاب کیا اور آپ کی تحریروں میں اکثر ناول کی جھلک محسوس ہوتی ہے تو میرے پیارے بھائی ناول بہت بڑا طویل شہہ پارہ ہوتا ہے جو میرے بس کی بات نہیں کیونکہ جہاں اردو فکشن حقایت، واقعہ یا افسانے کو نثری ادب کہا جاتا ہے انیسویں صدی میں انسانی ادب سے داستان گوئی کا رجحان ختم ہو گیا اور اس کے مقابلے میں ناول منظر عام پر آیا ناول کو ہم داستان کی

ارتقائی شکل کہہ سکتے ہیں جو اطالوی زبان کے لفظ Navella سے مشتق ہے۔ یہ ناول انگریزی ادب کے اثرات سے اردو ادب میں منتقل ہوا۔ ناول نگار کے نقطہ نظر اور نظریہ حیات کا عمل دخل ناول میں براہ راست ہوتا ہے جس سے ناول میں ناول نگار زمانے کی حقیقی زندگی اور فرد کے افعال واعمال نیز ذہنی ونفسیاتی کیفیات کی عکاسی کرتا ہے اسی طرح ناول کا کینوس بھی زندگی کے نشیب وفراز کی طرح وسیع ہو جاتا ہے۔ ناول کے پاس اظہار آزادی کا عنصر تو ہوتا ہے لیکن اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کفایت پسندی کے تحت تفصیلات سے دامن تہی ہو اور ضمنی جزئیات کو تحریری اسلوب دے اگر ایسا ہے تو ناول نگار کے لیے بصیرت اور باریک بینی کا ماہر بھی ہونا چاہیے ناول میں استاراتی تہوار زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ بھائی میں نے تو ابھی تک 26 بہاریں بھی نہیں دیکھی ہیں۔ جس میں 15 سالوں سے ادب کی خدمت کرتا آ رہا ہوں مگر اب تک ادب کو قریب سے نہیں دیکھا نئے افق کے سارے رائٹر حضرات میرے استاد محترم ہیں انکل محمد سلیم اختر کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر یہ مقام حاصل کیا تمام ڈائجسٹوں میں لکھنے کا شرف حاصل ہوا تو سلیم اختر کی وجہ سے کیونکہ ہمارا صوبہ بلوچستان پسماندہ علاقہ ہے یہاں کوئی کتابوں کی سہولت موجود نہیں سلیم اختر ہر مہینے بہت سے ڈائجسٹ ڈاک سے بھیج دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم سارے ادبی دوست اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ خلیل جبار (پراسرار قتل) بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ ریاض بٹ (ملاپ) معاشرے کی عکاس بنی۔ طاہرہ جبیں (ستم) نے تو کمال کر دیا۔ ویلڈن طاہرہ مبارک باد ہو۔ اقبال بھٹی بھائی آپ کی تحریر ہم نوجوان نسل کیلئے تعمیراتی سوچ کو روشناس کراتی ہے جو اس ملک وقوم کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے خوب صورت لفظوں کا چناؤ اور بہترین کردار۔ اقبال بھائی آپ بہترین رائٹرز میں سے ایک ہیں میں آپ کی سوچ اور خیالات کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں باقی تحریروں پر تو میں تبصرہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے ابھی تک پڑھی ہی نہیں ہیں امید ہے کہ وہ بھی نئے افق کے معیار پر ہوں گی۔ مقبول جاوید صدیقی اور کاشف بھائی آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے نئے افق کو رونق بخشی اور مزید لکھنے کی پختگی دی۔ آخر میں اتنا ضرور لکھوں گا کہ میری لکھائی بہت کمزور ہے جس کی وجہ سے تعلیم (پرائمری) پاس اور کاغذ بھی بہت پرانا استعمال کرتا ہوں جس کی وجہ ہے (غربت)۔ پلیز خدارا مائنڈ مت کرنا میں نے زیادہ تر آزادی کے حوالے سے لکھا کیا میں نئے افق کے معیار پر لکھ سکتا ہوں اگر میری تحریروں میں وزن ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ضرور بتانا آئندہ کے لیے نہیں لکھوں گا۔ میری طرف سے تمام دوست اور نئے افق کی پوری ٹیم کو عید مبارک ہو والسلام۔

☆ ابڑو صاحب خوب صورت خط کا شکریہ آپ کے لفظ سے قارئین کے لیے محبت چھلکتی ہے آپ کو جو موضوع اچھا لگتا ہے آپ اس پر لکھتے رہیں۔

ریحانہ سعیدہ ...... لاہور۔ عمران بھائی آداب۔ ماہ صیام کی آمد ہے اور جب میرا خط آپ پڑھیں گے تو شاید آدھا ماہ مقدس گزر چکا ہوگا اور عید جیسی خوشی قریب ہوگی۔ اس مقدس ماہ کے نزول کا مقصد تزکیہ نفس ہے تاکہ ہم اس مقصد کی معراج حاصل کر سکیں جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا یعنی حقوق العباد سو اپنی خوشیوں میں غریبوں کو بھی شریک کیجیے کہنے میں تو ہم اسلامی ملک میں رہتے ہیں لیکن رمضان شروع ہوتے ہی تمام تاجر حضرات شیطان بند ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ان کا کردار ادا کرتے ہوئے اتنی مہنگائی کر دیتے ہیں کہ غریب آدمی صرف نمک سے ہی روزہ کھولتا ہے۔ یہی حال عید پر ہوتا ہے جبکہ یورپئین ممالک میں کرمس اور ایسٹر آتے ہی ہر چیز کے دام کم ہو جاتے ہیں تاکہ ہر غریب خوشیوں میں شامل ہو سکے سو ہمیں کم از کم اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے اور صدقہ وفطرانے کے علاوہ بھی خاص طور پر سڑکوں ہوٹلوں میں کام کرتے بچوں کی اس طرح مدد کرنی ہے کہ ان کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو۔ اب آتے ہیں جناب رسالے کی طرف سرورق کی طرف مختلف رنگوں سے مزین ایک اسٹائلش سی لڑکی رسالے کی خوبصورتی بڑھاتی نظر آئی۔ پہلی کہانی ڈاکٹر ایم اے قریشی کی طویل مگر اچھی تھی۔ اگر یہ مختصر ہوتی تو اور اچھا تاثر دیتی۔ پراسرار قتل کا نام کچھ اور ہونا

چاہیے تھا کیونکہ قتل پر سرار نہیں تھا قاتل کا پکڑے جانا پر سرار سائے کی وجہ سے تھا سبق آموز کہانی تھی۔ اسلام اسی لیے اعتدال پسندی اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ نہ ہاتھ بندھے ہوں اور نہ انسان شیطان کا بھائی ہو اور دوسری بات اس کہانی کی یہ تھی کہ بے گناہ کا خون رنگ لاتا ہے۔ حنا سید کی تھپٹر متاثر نہیں کر سکی کیونکہ موبائل آنے کے بعد سے اب تک اس طرح کی خبریں اور کہانیاں عام ہو چکی ہیں۔ ریاض بٹ کی ملاپ حسب معمول دلچسپ تھی۔ قلندر ذات انسانی سوچ سے بڑھ کر ماورائی ہوتی جارہی ہے اسے اب اختتام کی طرف لے آئیں اور نئی کہانی شروع کریں۔ ابن حق کی بھرم بغیر سر پاؤں کے تھی۔ بس لفاظی تھی نہ کوئی مقصد نہ دلچسپ عنصر۔ کے ایم خالد کی ایجنسی دلچسپ تھی اکثر میں بھی حکومتی پالیسیوں کے خلاف لکھتی ہوں ایسی ایجنسیز کا تو میں بڑی بے تابی سے انتظار کروں گی کہ میرے بھی وارے نیارے ہو جائیں۔ اقبال بھٹی کی بیگم شیطان بس ایوریج تھی اور زریں قمر کی گمنام سپاہی طویل تھی پر زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ تکمیل تمنا میں پامسٹ صاحب کا حقیقی وجود ہے تو اس رسالے کے توسط سے مجھے ان صاحب کا نمبر دے دیں کیونکہ مجھے ایسی باتوں میں بہت دلچسپی ہے۔ فلسطین الماس صاحب کی کہانی کم اور ہسٹری جغرافیے کا باب زیادہ لگ رہی ہے۔ میں نے ہسٹری کے حوالے سے نسیم حجازی کی بہت کتابیں پڑھی ہیں وہ ہسٹری کے ساتھ اس طرح کہانی بیان کرتے ہیں کہ دلچسپی اور توازن برقرار رہتا ہے۔ اب سب لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے ماہِ صیام کے حوالے سے نیک تمنائیں اور اجازت۔

☆ ریحانہ یاد آوری کا شکریہ، آپ نے بالکل درست لکھا انسانوں کی خدمت ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نماز روزے تو معاف کر سکتا ہے لیکن حقوق العباد نہیں۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ محترم السلام علیکم! نئے گیٹ اپ میں بڑا ہی خوب صورت اور پر کشش ٹائٹل والا نئے افق سامنے آیا تو چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گیا۔ خوب صورت اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ بہترین پوز میں محترمہ عجب جلوہ دکھا رہی ہیں نمایاں فرق ہو گیا ہے ٹائٹل کی حد تک تو، فہرست دیکھ کر لگا کہ آپ لوگ اپنی پوری محبت و مشقت سے کہانیوں کا انتخاب کر رہے ہیں مثلاً پہلی کہانی ڈاکٹر ایم اے قریشی اور حسام بٹ کی دل موہ لینے والی تحریر آسٹرولوجسٹ کی کہانی، کوٹیشن اور مختصر کہانی نے بھی پرچے کو چار چاند لگا رہی ہے۔ محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک تو چشم کشا ثابت ہوئی غور و فکر کے لیے کئی در وا کر گئی۔ گفتگو میں عمران جی نے زبردست حدیث شریف بیان کی ہے اور یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ انعامات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن میں دونوں انعام یافتہ تحریریں واقعی انعام کی حقدار ہیں اور پھر اپنا تبصرہ انعامی قرار دینے پر یکدم ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ مجلس ادارت کا بے حد شکر گزار ہوں ڈاکٹر خادم حسین کا شکریہ، اللہ انہیں نیکی کرنے کا موقع بخشتا رہے آمین مگر مجید احمد جائی کے خط کا فٹ نوٹ اداریہ کی طرف سے پڑھ کر بے حد افسوس ہوا ریاض حسین قمر جی لیجیے ہم حاضر ہیں مگر آپ خوشبوئے سخن سے غائب کیوں باقی یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ ایم ایم کاشف نے نئے انکشافات کر ڈالے تبصرہ بھی اچھا تھا۔ بھائی عمر فاروق ارشد کی تجویز کے سلسلے وار ناولز کے کچھ صفحات کم کر کے خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی کو دے کر چار چاند لگ سکتے ہیں اور مقابلے کے لیے مواد بھی اچھا خاص لکھا جائے گا میں اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے محترم مشتاق صاحب عمران جی اور اقبال بھٹی صاحبان سے پر زور اپیل کرتا ہوں، ریاض بٹ جی خوب آئے اور زبردست کہانی تھی بے حد اچھی۔ میری درخواست ہے احباب مجلس ادارت سے کہ تمام کوٹیشن کو بھی انعام دینے کی فہرست میں شامل کیا جائے بے حد شکریہ۔ اجنبی بے حد اچھی کہانی ہے شروع کے صفحات پر ڈاکٹر ایم اے قریشی ایسی ہی کہانیاں لایا کریں تھپڑ اچھی تھی مگر عام سی کہانی رہی ملاپ تو ریاض بٹ کی خوب صورت کہانی رہی۔ ابن حق کی بھرم عام کہانی سے ہٹ کر تھی۔ اچھی رہی۔ ستم ہمارے معاشرے کے محروم افراد کی نفسیات اور پھر انہی لوگوں کے خلاف اٹھ کر کچھ بن کر حلال و حرام کی تمیز کے بغیر آگے

بڑھنے کا جنون آخر کار کیسے کیسے انجام تک پہنچے۔ طاہرہ جبیں تارا کی اچھی کوشش رہی۔ طنز و مزاح پر لکھی خوب رہی اور کے ایم خالد اس میں کامیاب بھی رہے ہمارے میگزین میں اس طرح کی کہانیاں بھی خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوں گی اور بھٹی صاحب کی بیگم شیطان تو پڑھ کر بے حد ہنسی بھی آئی اور ساتھ ہی کہانی بڑے ماہرانہ انداز میں بڑی اچھی پلاننگ سے لکھی گئی ہے طبع زاد کہانیوں میں زبردست رہی۔ گمنام سپاہی معلومات اور واقعات کا بہترین اظہار تھا۔ زریں قمر کی بہترین کاوش رہی۔ حسام بٹ کی تکمیل تمنا تو ہمیشہ کی طرح شروع کی اور ارد گرد سے بے خبر کہانی کے ساتھ بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ آخری لائن بھی آ گئی زبردست منفرد اور آسٹرو پامسٹری پر بالکل ہی انوکھے انداز میں یہ سلسلہ چل رہا ہے یہ چلتا رہنا چاہیے دونوں سلسلے وار کہانیاں بھی زبردست جا رہی ہیں ذوق آگہی میں آسیہ اشرف کو مبارک باد اور خوشبوئے سخن میں ایم جے قریشی کو بھی مبارک باد۔ میری کہانی کو ٹیشن کے طور پر شامل کرنے کا بے حد شکریہ۔ قارئین نے پچھلے شمارے میں بھی کہانی پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا تھا براہ کرم ضرور لکھیں ہمارا میگزین تیزی سے بہتری کی طرف بڑھ رہا ہے لامحالہ قارئین کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی ان شاء اللہ، تمام احباب مجلس کو سلام۔

☆ جاوید صدیقی صاحب، نئے افق کی پسندیدگی کا شکریہ آپ کی جانب سے ارسال کردہ کوٹیشن اور دیگر تحاریر کے منتظر ہیں۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ جولائی کا نئے افق کافی دیر سے موصول ہوا سو قلم بھی کافی دیر سے اٹھا ہے مگر امید ہے کہ تبصرہ پہنچ ہی جائے گا اب شائع ہونا یا نہ ہونا یہ تو جناب کی صوابدید پر ہے۔ خیر اس مرتبہ ٹائٹل نے بالکل بھی متاثر نہیں کیا میں بلاتردد کہہ سکتا ہوں کہ یہ ٹائٹل مکمل طور پر فلاپ ثابت ہوا کیونکہ آپ کو چاہیے تھا کہ رمضان کی مناسبت سے کوئی سادہ اور جاذب نظر سرورق ترتیب دیتے۔ یہ ماورائی اور دانت نکوستی مخلوق بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ محترم قریشی صاحب ہمیشہ کی طرح دلوں پر دستک دے رہے تھے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ، وطن عزیز پر صرف خدائے ذوالجلال کا سایہ ہے جو یہ وطن آج تک قائم ہے ورنہ اپنوں کی بے ضمیری اور غیروں کی سازشوں نے کب کوئی کسر چھوڑی ہے آج کی تازہ صورت حال کو ہی دیکھ لیں۔ کیسے کیسے شرفا کہلانے والوں کے چہروں سے شرافت کے نقاب اتر رہے ہیں اور نیچے سے کرپشن غداری اور حرام کاری کی غلاظت سے لتھڑے ہوئے چہرے نمایاں ہو رہے ہیں۔ بطور پاکستانی ہم اس تبدیلی پر خوش ہیں کہ احتساب کا عمل ہونا چاہیے مگر ڈر ہے کہ سیاہ کرتوتوں کے مالک یہ خونخوار مگرمچھ احتساب کے نرم و نازک جال کو پھاڑ کر بھاگ نہ جائیں کیونکہ 70 سالوں میں تو ان کا احتساب نہ ہو سکا تو پھر آج یہ معجزہ کیسے ممکن ہے؟ بہرحال ہم اپنی گفتگو کی محفل میں آتے ہیں۔ ابن مقبول صاحب طویل ترین تبصرے کے ساتھ شامل ہوئے بھائی نے بہت اچھی باتوں کی طرف توجہ دلائی ریاض بٹ صاحب نیک تمناؤں کا شکریہ آپ کی کہانیاں ضرور شائع ہوتی رہیں گی بس آپ کبھی دل چھوٹا مت کرنا سلسلے وار ناول بھی اچھے جا رہے ہیں مگر مجھے افسوس ہے کہ کمپوزنگ کی غلطیوں پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ اس مرتبہ ایک بہت ہی سنگین غلطی یہ ہوئی کہ الیاس ایم اے صاحب کو الماس ایم اے بنا دیا گیا گویا ہوشیار باش، جنس کی تبدیلی کا عمل نئے افق میں شروع ہو چکا ہے اللہ ہی خیر کرے۔ دوسری بات یہ کہ میں مستقل سلسلے خوش بوئے سخن کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہوں گا ان میں سے کچھ ایسی باتیں ہیں کہ جن کی طرف پہلے بھی بارہا توجہ دلا چکا ہوں مگر بے سود، پہلی بات یہ کہ اس سلسلے کے صفحات میں اضافہ کیا جائے اس مرتبہ جتنی جگہ اس سلسلہ کو دی گئی اس سے بہتر ہے کہ آپ اسے بالکل ہی ختم کر دیں چند مخصوص لوگوں کو نمائندگی دے کر آپ خانہ پری تو کر سکتے ہیں لیکن رسالے کا معیار قائم نہیں رکھ سکتے۔ دوسری بات یہ کہ ہر دفعہ نوشین صاحبہ کو مکمل تعارف اور زندگی کا زائچہ شریف پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ ایک غیر مناسب سی بات لگتی ہے اس جگہ پر غزلیں شائع ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ صفحات کم از کم اتنے ہوں کہ ساتھیوں کا کلام

ہر ماہ شائع ہوا کرے۔ یہاں یہ صورت حال یہ ہے کہ چار ماہ بعد غزل شائع کردی جاتی ہے جب بندہ اس پر فاتحہ پڑھ چکا ہوتا ہے بعض اوقات بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلے والی غزلیں شائع نہیں ہوتیں جبکہ بعد والی شائع کردی جاتی ہے۔ اس طرح لکھنے والا الجھن میں رہتا ہے کہ ان غزلوں کے ساتھ کیا حشر ہوا۔ اس کا آسان حل یہ ہے کہ ''کوشش جاری رکھیں'' کے عنوان سے ان ساتھیوں کے نام دے دیے جائیں جن کا کلام قربانی کا بکرا بنا دیا گیا ہو۔ محترم قریشی صاحب اور عمران بھیا جی یقین کریں کہ میں نہایت مجبوری اور راسخ اقدام کے طور پر یہ چند گزارشات کررہا ہوں کیونکہ جب قاری ذہنی طور پر ادارے کی پالیسیوں یا رسالے کی بناوٹ سے مطمئن نہیں ہوگا تو پھر وہ کس طرح اس کا مطالعہ کرسکے گا۔ باقی سلسلے اللہ کے فضل سے بہت اچھے جارہے ہیں کہانیوں کا انتخاب بھی عمدہ ہے اللہ تعالیٰ ہمارے نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

☆ عمر ارشد جی، آپ کی تنقید اور تعریف کا شکریہ ہم کوشش کریں گے کہ نئے افق آپ کے معیار کے مطابق بنائیں تاریخی کہانی کے خالق کا نام الماس ایم اے ہے، ایم الیاس نہیں۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ جولائی 2015ء کا شمارہ اس بار 20 جون کو مل گیا خوشگوار حیرت کا ایک جھٹکا لگا اس کو آپ بجلی کا جھٹکا نہ سمجھ لیجیے گا کیونکہ اتنی لوڈشیڈنگ ہوتی ہے کہ جھٹکے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا البتہ ماہ رمضان شروع ہوتے ہی مہنگائی نے جو جھٹکے لگانے شروع کیے ہیں اس کی بدولت غریب عوام بلکہ متوسط طبقے والوں کی بھی چیخیں نکل گئی ہیں ان چیخوں پر کان دھرنے والا کوئی نہیں ہے۔ خدا بزرگ و برتر ہمارے حال پر رحم کرے آمین، اس بار دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کلیسائی آقاؤں کی پاکستان میں دہشتگردی کے متعلق لکھ رہے ہیں یہ بات اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ امریکہ نے کبھی نہیں چاہا کہ پاکستان مستحکم ہو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو وہ یہی چاہتا رہا ہے کہ پاکستان اس کی بیساکھیوں کے سہارے ڈھونڈتا رہے وہ ایسے حالات پیدا کرتا رہا ہے اور اب بھی وہ اس ڈگر پر چل رہا ہے کہ پاکستان میں امن نہ ہو۔ مختلف فرقوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہتے ہیں جب تک کلہاڑی کے ساتھ لکڑی کا دستہ نہ ہو وہ درخت نہیں کاٹ سکتی۔ یہاں پر (پاکستان) میں ایسے حالات پیدا کیے جاتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ کلہاڑی کا دستہ بن جاتے ہیں بہرحال ہماری دعا ہے کہ پاکستان ترقی کرے اس میں استحکام ہو اور دشمنوں کو منہ کی کھانا پڑے اب بڑھتے ہیں اپنی محفل گفتگو کی طرف محترم ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب مبارک ہو آپ کا خط ماہ جولائی کے شمارے کا انعام یافتہ خط قرار پایا آپ کے خطوط ہمیشہ سے موثر مدلل اور سیر حاصل تبصرہ کے حامل ہوئے ہیں اس بار بھی بہترین خط ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میری تفتیشی کہانی ''چراغ'' پسند کرنے کا بے حد شکریہ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں لکھ رہا ہوں ورنہ کب کا کاغذ اور قلم کا رشتہ منقطع کرچکا ہوتا ڈاکٹر خادم حسین صاحب محفل میں خوش آمدید خدا آپ کو سلامت رکھے اور آپ اس طرح مریضوں کو صحت کامل دینے کا وسیلہ بنے رہیں۔ اس دور میں حقیقی مسیحا ملنا ذرا مشکل ہے لیکن اس دنیا میں اچھے لوگ موجود ہیں اور ایسے کرداروں کو میں اپنی تفتیشی کہانیوں میں اجاگر کرنے کی سعی کرتا رہتا ہوں مجید احمد جائی صاحب یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ اشفاق شاہین صاحب میری کہانی ''چراغ'' آپ کے معیار پر بھی پوری اتری، جس کے لیے یہ بندہ ناچیز مشکور و ممنون ہے۔ آئندہ بھی اپنی رائے سے مطلع کرتے رہیے گا ریاض حسین قمر بھائی کیسے ہو اس بار بھی آپ کا خط محفل کی جان ہے میری کہانی چراغ کو پسندیدگی کی سند دینے پر شکر گزار ہوں بھائی محفل سے غیر حاضری کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل اب صحت ٹھیک نہیں رہتی دعاؤں اور دوائیوں کے سہارے جی رہا ہوں کبھی کبھی لکھ نہیں سکتا آپ کی محبتیں اور عنایتیں دوبارہ ہاتھ میں قلم تھما دیتی ہیں ایم اتیچ کاشف صاحب یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ رائٹر ایک ہی کہانی مختلف رسائل میں ارسال کردے بہرحال اس کی وضاحت تو خود رائٹرز ہی کریں گے عمر فاروق ارشد بھائی

آپ کا خط اور تبصرہ ہمیشہ کی طرح سندر ہے اور آپ کے خیالات ارفع ہیں میری کہانی چراغ آپ کو بھی اچھی جو میرے لیے باعث تقویت ہے خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ میری اچھی کہانی پر میری حوصلہ افزائی کرتے رہیں، شکریہ۔ لیجیے گفتگو کی محفل تمام ہوئی قارئین خاطر جمع رکھیں میں ابھی کہیں نہیں جارہا ابھی کہانیوں اور باقی سلسلوں پر تبصرہ باقی ہے ویسے یہ باقی ہے ایسے ہی ہے جیسے ٹی وی پر کوئی بامقصد اور اچھا پروگرام چل رہا ہو اور میزبان یہ کہے کہ ملتے ہیں چھوٹی سی بریک کے بعد اور یہ بریک یعنی اشتہارات شیطان کی آنت کی طرح لمبے ہوجائیں یا کوئی کہانی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز مرحلے پر ہو اور اچانک لکھا آجائے باقی اگلے ماہ، خیر کہانیوں میں خلیل جبار کی پراسرار قتل ان کی باقی کہانیوں کی نسبت زیادہ اچھی تھی۔ دراصل کسی انسان کی جان لینا وقتی فائدے یا اشتعال کے آسان ہے لیکن بعد کے حالاست برداشت کرنا مشکل ہے تکمیل تمنا بٹ صاحب کی ایک خوب صورت کہانی ہے ہمیں خوشی ہے کہ بٹ صاحب نے ہمارے پیارے رسالے کے لیے لکھنا شروع کیا ہے اور یہ بات اس سے بھی زیادہ طمانیت اور خوشی کا باعث ہے کہ اب وہ ان شاء اللہ ہمیشہ لکھتے رہیں گے۔ اقبال بھٹی بیگم شیطان کی صورت میں ایک اچھی اور منفرد کہانی لے کر آئے عورت جب انتقام میں اندھی ہوجائے تو ناگن بن جاتی ہے اور اپنے شکار کو ڈس کر ہی دم لیتی ہے اور سیر کے لیے سوا سیر بن کر اپنا مقصد حاصل کرتی ہے کے ایم خالد کی کہانی ''ایجنسی'' طنز و مزاح کے اعتبار سے ایک اچھی اور جاندار کاوش ہے ''ستم'' طاہرہ جبیں کی بھی تعریف کے قابل ہے ان کے قلم کی کاٹ دلوں کو جھنجوڑ دیتی ہے چند ٹکوں کی خاطر انسان کا خون بہانا کبھی بھی اچھا نہیں سمجھا گیا۔ حنا سید کی مختصر سی تحریر تھپڑ پڑھ کر دل کانپ اٹھا۔ یہ آج کل کی جوان نسل کے لیے ایک سبق آموز کہانی ہے۔ مختصر ہوتے ہوئے بھی یہ کہانی کسی طویل کہانی سے کم نہیں ہے۔ آپ نے ذوق آگہی اور خوش بو سخن کے لیے بھی انعام کا سلسلہ شروع کرکے اچھا قدم اٹھایا ہے میری گزارش یہ ہے کہ ان کے صفحات بڑھا دیں بہرحال انعام کے لیے منتخب ہونے والے انتخاب کے علاوہ بھی سارا انتخاب اچھا ہے۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ خدا بزرگ و برتر ہمارے پیارے رسالے کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

☆ بٹ صاحب یاد آوری کا شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے اور ہمت دے تاکہ آپ کے قاری آپ کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کردیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7، فرید چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

تفسیر:۔ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت مبارکہ "آیت الکرسی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایسی مکمل قدرت وعظمت ارشاد ہوئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اسی باعث حدیث شریف میں اس آیت کو قرآن شریف کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں لفظ کرسی استعمال ہوا ہے جو بالعموم حکومت واقتدار کے استعارے کے طور پر بولا جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت واقتدار بلاشرکتِ غیرے پوری کی پوری کائنات بلکہ تمام عالم (کیونکہ وہ ذاتِ عالی ربِ عالمین ہے یعنی کسی ایک عالم کا نہیں تمام عالموں کا رب ہے) اُس کی ذاتِ عالی قطعی غیر فانی ہے وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ ہی زندہ رہنے والی ہے۔ اُس کی زندگی کسی کی بخشی ہوئی یا تخلیق کی ہوئی نہیں بلکہ وہی سب کو زندگی اور اسباب زندگی بخشنے والی ہستی ہے۔ وہ آپ ہی اپنی حیات سے زندہ ہے۔ اور اُس کے ہی بل بوتے پر ساری کائنات کا نظام قائم ہے۔ وہ اپنی اس عظیم ترین سلطنت کے جملہ اختیارات کا پوری طرح خود ہی مالک ومختار ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی ذات میں نہ ہی اُس کی صفات میں کسی طرح شریک ہے نہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حقوقِ الٰہی میں اور جو ایسا کرتے ہیں اللہ کے ساتھ کسی بھی طرح کسی کو شریک کرتے ہیں اس سے کسی بھی طرح کی مدد مانگتے ہیں یا اپنی حاجات روائی کی مانگ کرتے ہیں وہ سب جھوٹ اور شرک میں مبتلا ہیں اور خود اپنے آپ پر ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

آیتِ مبارکہ میں ربِ ذوالجلال نے اپنے غیر محدود اور مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے بتا دیا ہے کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس کے ہاں کسی کا ایسا زور چلتا کہ اس کی سفارش اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر کسی طرح اثر انداز ہو سکے۔ کسی کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظامِ کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکے۔ انسان ہو یا فرشتے یا دوسری مخلوقات سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات کو ان کی تخلیق کے وقت ان کی ضرورت کا جو علم عطا کیا وہ ان کی ضرورت کے مطابق ہے، ہر ایک کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ کائنات کی حقیقتوں پر کسی کی نظر محیط نہیں، اپنی مصلحتوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی پوری طرح جانتا ہے وہی تمام علوم کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اللہ کی ہدایت ورہنمائی پر عمل کیا جائے۔

انسان چاہے تو بہت بلند مرتبہ ہو سکتا ہے، وہ عظمت وسربلندی کے اونچے مدارج طے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود وقیود سے باہر نہیں نکل سکتا، اور جب قلبِ مومن میں بندگی، اطاعتِ الٰہی، توحیدِ الٰہی کا عقیدہ اچھی طرح جاں گزیں ہو جاتا ہے تو پھر وہ جذبہ وہ عمل اسے مقامِ عبودیت تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ ہر قسم کی سرکشی اور تکبر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کی طبیعت میں عجز وانکساری، نرمی پیدا ہو جاتی ہے، اس کا دل خوفِ الٰہی سے کانپتا رہتا ہے۔ جو شخص قرآنِ حکیم کے اندازِ بیان کو سمجھ لیتا ہے پھر وہ کسی قسم کے مباحث واعتراضات میں نہیں پڑتا۔

سورۃ الحشر کی آیات ۲۲ تا ۲۴ میں اور البقرۃ آیت ۲۵۵ میں ربِ کائنات کی معبودیت اس کے واحدہٗ ہونے اور اس کے سوا کوئی اور کسی طرح کسی بھی عبادت کا مستحق نہیں ہے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی کا یہ مقام ومرتبہ نہیں ہے کہ انسان اس کی بندگی وپرستش کرے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس وہ صفاتِ الٰہی اور اختیاراتِ

الٰہی نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں جو اس معبودِ حقیقی کے پاس ہیں، اس لئے عبادات وپرستش کا حق بھی اس مالک وخالق کا ہے، کسی اور کا نہیں۔ باقی تو سب اُس کی مخلوق ہیں اور کسی مخلوق کی عبادت وپرستش خالق کے ہوتے ہوئے نہیں کی جا سکتی۔

قرآنِ حکیم میں ربِ کائنات کی صفاتِ عالی کو خوب نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن ان دونوں مقامات یعنی سورۃ الحشر کی یہ آخری تین آیات اور البقرہ کی آیت الکرسی میں جو صفاتِ الٰہی بیان کی گئی ہیں اسماء الحسنیٰ کا ہی حصہ ہیں۔ اسماء الحسنیٰ یعنی اللہ کے تمام اچھے نام کیا ہیں۔ دراصل یہ وہ صفاتِ الٰہی ہیں جن سے اس کی قدرت کی مختلف صلاحیتوں، حیثیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ تفصیل آئندہ صفحات میں آپ دیکھ سکیں گے۔ ان آیاتِ مبارکہ میں جن صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ ہیں۔ "اللہ اور الٰہ" یعنی معبود جس کی پرستش وعبادت کی جائے۔ پھر دوسری صفت "الشہادہ" آئی ہے جس کے معنی جاننے والا اور ایسا جاننے والے کے ہیں جو اپنی مخلوقات کی ہر پوشیدہ اور ظاہر سے پوری طرح واقف ہو۔ اس کے ماضی، حال اور مستقبل تک سے واقف ہو۔ اس کے بعد جو صفتِ الٰہی آئی ہے وہ "الرحیم" یعنی نہایت رحم والا اور بہت ہی مہربان، اللہ کی ذاتِ عالی ایسی ہے جس کی رحمت بے پایاں ہیں جن کی وسعت تمام کائنات پر محیط ہے۔ پھر صفتِ الٰہی "الملک" آئی ہے جس کے معنی بادشاہ، حاکم، مقتدر یعنی ذاتِ الٰہی جو سارے جہانوں کی بادشاہ ومالک ہے۔ پوری کائنات اسی کی فرماں روائی پر محیط ہے۔ پھر صفت "القدوس" آئی ہے جس کے معنی ہیں تمام عیبوں سے پاک ایسی ذاتِ عالی جس میں کسی قسم کا کوئی عیب یا نقص نہیں ہے وہ ہر برائی جو ذہنِ انسانی میں آ سکتی ہے سے پاک ہے۔ آگے چل کر "السلم" کی صفت بیان ہوئی ہے جس کے معنی سلامتی کے ہیں یعنی اللہ کی ذات ایسی ذات ہے جس کو کسی قسم کی نہ کمزوری لاحق ہو سکتی ہے نہ ہی کبھی اس کے کمال کو زوال آ سکتا ہے اس کی صفات ہر نقص اور شر سے محفوظ ہے۔ پھر "المومن" کہا گیا ہے جس کے معنی امن دینے والا، خوف سے حفاظت کرنے والا، امن دینے والا یعنی اسباب امن مہیا کرنے والے کے ہیں اس کے بعد صفتِ "المھیمن" آئی ہے جس کے معنی نگہبان یا گواہ کے ہیں، حفاظت کرنے والے کے ہیں یعنی خبر گیری کرنا اور ذمے داری اٹھانے والا اس کے بعد ربِ کائنات کی صفت "العزیز" آئی ہے جس کے معنی غالب، قوی، قاہر کے ہیں یعنی ایسی زبردست ہستی جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے۔ پھر "الجبار" کی صفت بیان ہوئی ہے جس کے معنی بڑی طاقت والا یا بڑے دباؤ والا کے ہیں۔ یعنی اللہ کی یہ صفت اس کی اس قوت کا اظہار ہے کہ وہ اپنی قوت سے جس چیز کو جس طرح چاہے نافذ کر سکتا ہے اور درست کر سکتا ہے۔ پھر "المتکبر" سے خطاب ہوا ہے جس کے معنی عظمت وبزرگی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات حقیقت میں سب سے بڑی ہے اور تمام بڑائی اسی کو زیب دیتی ہے۔ وہی ہر قسم کی بڑائی کا مستحق ہے کیونکہ کائنات کی تمام چیزیں اسکے آگے حقیر وپست ہیں۔ وہی ان کا بنانے والا، انہیں قائم رکھنے والا اور ان کی نگہداشت وپرورش کرنے والا ہے۔ وہ ہر شرک سے پاک ہے، اس کا کوئی کسی بھی طرح نہ ادنیٰ درجے میں نہ کسی اور درجے میں کسی طرح بھی کوئی شریک نہیں ہے جو ایسا کہتے ہیں دراصل وہ خود پر ہی ظلم کرتے ہیں۔ پھر صفتِ الٰہی "الخالق" آئی ہے جس کے معنی ہر چیز کو پیدا کرنے والا یعنی پوری کائنات اور اس کے ایک ایک ذرّے تک کی تخلیق اور اس کی پوری پوری منصوبہ بندی سے لے کر اس کی مخصوص صورت وشکل میں پیدا کرنے تک کی یہ صفتِ الٰہی ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے ہی مخصوص وخاص ہے۔

〈جاری ہے〉

کیچڑ کا کنول

ڈاکٹر ایم اے قریشی

انسان اور حیوان میں فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اچھے اور برے کی تمیز کرسکتا ہے' اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے' یہی خوبیاں دے کر اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوق ہونے کا درجہ دیا لیکن جب یہی انسان ان خوبیوں کو منفی انداز میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ آدمیت کے درجے سے بھی گر جاتا ہے' اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

انسانوں کے جنگل میں پھنس جانے والی ایک ماں کی روداد' اس کا حسن اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن گیا تھا۔

نئے افق کی روایتوں کا امین' مغربی ادب سے منتخب ایک خوب صورت ناولٹ۔

جین وارڈ مین اس وقت کلاس لے رہی تھی جب اسے اسکول کے پرنسپل مسٹر ڈاسن کی طرف سے بلاوا آیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ پیریڈ جاری ہو اور مسٹر ڈاسن نے اسے اپنے آفس میں طلب کیا ہو۔ تاہم جین کو اندازہ ہو گیا کہ مسٹر ڈاسن کیوں اپنا یہ معمول توڑنے پر مجبور ہوئے ہوں گے۔

گزشتہ دنوں جین نے اپنے ایک شاگرد پیٹ مورگن کے بارے میں ایک خصوصی رپورٹ اس کے والدین کو بھجوائی تھی اسے یقین تھا کہ پیٹ کے والدین غصے میں بھرے ہوئے پرنسپل کے پاس پہنچے ہوں گے۔

جین کو اس امر کا خوب تجربہ تھا کہ تمام والدین دوسروں کے بچوں کو تو قواعد وضوابط کا پابند اور خوش اطوار دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اگر ان کے اپنے بچوں کو ایسا بنانے کے لیے اساتذہ سخت طرز عمل اختیار کریں تو انہیں بہت برا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے اپنے بچوں کی خامیوں کی نشاندہی کی جائے تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ جین نے پیٹ کے بارے میں جو رپورٹ لکھی تھی وہ تو خاص طور پر بہت سخت تھی لیکن جین نے تنگ آ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ پیٹ کو تعزیر اور اصلاح کی سخت ضرورت تھی۔

ہائی اسکول کے سنیئر طالب علم کے طور پر پیٹ کی عمر کچھ زیادہ ہی تھی۔ انیس سال سے کچھ اوپر...... چنانچہ دوسرے طالب علموں کو تو وہ اپنے سامنے محض بچہ ہی سمجھتا تھا۔ ہمیشہ سرکشی پر آمادہ رہتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ رسماً بھی اپنی ٹیچر کا احترام یا ساتھیوں سے رواداری کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں جین کو یہ بھی شک تھا کہ وہ بدمعاش قسم کے کچھ لڑکوں کے ٹولے کا سردار ہے جو کاؤنٹی میں مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔

جین نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی تھی کہ پیٹ مورگن کو عام عدالت میں پیش کیا جائے کیونکہ وہ اتنا کم عمر تو نہیں تھا کہ اسے بچوں کی عدالت میں پیش کیا جاتا۔ یہ سفارش بہت ہی سخت رویے کی نشاندہی کرتی تھی لیکن جین کے خیال میں اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ پیٹ کے والدین کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ جین نے اپنے شاگردوں کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ کام بتایا، دو مانیٹروں کو نگرانی پر مامور کیا اور انہیں بتا دیا کہ شاید باقی پیریڈ کے دوران وہ پڑھانے کے لیے نہ آ سکے۔

جب وہ درمیانی راستے سے گزر کر دروازے کی طرف بڑھی تو اس نے محسوس کیا کہ چوبیس کے چوبیس لڑکے لڑکیوں کی آنکھیں عقب سے اسے تک رہی تھیں اور آج ان کی نظروں میں کوئی خاص بات تھی وہ سب جیسے کسی راز میں شریک تھے۔ ایسا راز جس کا تعلق جین کی ذات سے تھا۔ اس احساس سے جین نے اپنے آپ کو کچھ بے چین سا محسوس کیا۔

اسے یاد آیا کہ آج دوپہر کھانے کے وقفے میں بھی اسے کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا۔ کیفے ٹیریا میں وہ اپنے کھانے کی ٹرے اٹھا کر اس مخصوص میز پر چلی گئی تھی جہاں وہ ٹیچرز بیٹھی تھیں جن کے ساتھ وہ روزانہ ہی دوپہر کا کھانا کھاتی اور گپ شپ کرتی تھی تب بھی محسوس کیا تھا کہ وہ تمام ٹیچرز پراسرار سے انداز میں خاموش فضا میں ایک عجیب سی نامانوسیت رچی ہوئی تھی لیکن اس وقت جین نے اسے محض اپنا وہم سمجھا تھا، مگر اس وقت وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی جب ایک ٹیچر اگنس فلائٹ اپنی میز چھوڑ کر دوسری میز پر جا بیٹھی، جین نے یہی سوچ کر استفسار نہیں کیا تھا کہ شاید اگنس کسی معاملے میں پریشان ہے۔

وارڈ مین کو لیک ویو کے ہائی اسکول میں پڑھتے

ہوئے چند سال گزر چکے تھے۔ لیک ویو جو اس کا آبائی قصبہ نہیں تھا لیکن اس کے شوہر بل وارڈ مین اور اس کے خاندان کا اس سے تعلق پرانا تھا۔ بل یہیں پیدا ہوا، یہیں پلا بڑھا اور یہیں دفن ہوا۔ وہاں کے لوگ اسے محبت اور گرمجوشی سے یاد کرتے تھے۔ وہ فوجی تھا اور میدان جنگ میں کھائے ہوئے زخموں کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ کمسن ٹیری کی شکل میں اس کی جیتی جاگتی نشانی جین کے پاس موجود تھی، بل کے انتقال کے بعد جین نے بھی زیادہ توجہ اور محبت سے ٹیری کی پرورش شروع کر دی تھی۔ اس کے خیال میں اب اس کی ذمے داریاں دگنی ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے بچے کے لیے ماں ہی کا نہیں باپ کا کردار بھی ادا کرنا تھا۔

بل کے انتقال کے بعد بھی جین نے لیک ویو میں ہی رہائش پذیر رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے خیال میں ٹیری کے لیے ایسے قصبے میں رہنا بہتر تھا جہاں لوگ محبت، احترام اور انسیت سے اس کے باپ کو یاد کرتے تھے۔ یہاں اس کے ذہن میں یہ احساس پختہ ہو گیا تھا کہ اس کا باپ ایک ایسا انسان تھا جس پر فخر کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

جین کا یہ خیال اب تک درست ہی ثابت ہوا تھا۔ لیک ویو میں ماں بیٹے کا وقت نہایت خوشگوار گزر رہا تھا۔ قصبے کے وسط میں وہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو انہیں جج ڈیلے نے معمولی سے کرائے پر دیا ہوا تھا۔ جج ڈیلے، بل کا قانونی مشیر بھی رہا تھا۔ ٹیری قصبے کے گریڈ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک مثالی بچہ تھا۔ بل اگر زندہ ہوتا تو اس کی اٹھان دیکھ کر یقیناً خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ بل کے بارے میں سوچتے ہوئے جین کی رگ وپے میں مسرت اور گرمجوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی جو اسے ایک عزم نو کے ساتھ جہد حیات جاری رکھنے کا حوصلہ دیتی تھی۔

جین جب پرنسپل کے دفتر میں پہنچی تو اس نے بیرونی حصے میں مسٹر ڈاسن کی سیکرٹری مس ولسن کو حسب معمول ٹائپ رائٹر سے کھیلتے ہوئے پایا۔ مس ولسن سے ین کی خاصی گہری دوستی تھی۔ دونوں تنہا رہنے کی عادی تھیں اور کسی مرد سے ان کی دوستی نہیں تھی۔ دونوں کے معاملے میں اس کی وجوہات مختلف تھیں۔

جین تو صرف اس لیے آج تک کسی مرد کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی کہ وہ ابھی تک بل کو بھلا نہیں پائی تھی۔ وہ اس کی محبت، اس کے ساتھ گزرا ہوا حسین دور، وہ یادیں، وہ باتیں ہی اب تک اس کا سرمایہ تھیں اور وہ انہی سے دل بہلاتی رہتی تھی۔ اسے کسی کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔

وہ بے پناہ خوبصورت تھی۔ ایک خوبصورت عورت، جو جوان ہو اور بیوہ بھی تو مردوں کو قسمت آزمائی اور شرف قبولیت کے روشن امکانات نظر آنے لگتے ہیں۔ چند ایک مردوں کے ساتھ جین نے چھوٹی موٹی تقریبات میں شرکت کی لیکن کسی کی رفاقت اور دوستی سے اس کا دل نہ بہلا۔ اسے کوئی خوشی حاصل نہ ہوئی۔ چنانچہ اس نے کسی کے ساتھ آنا جانا بالکل ہی ترک کر دیا۔

مس ولسن نے سر اٹھا کر جین کی طرف دیکھا۔ جین کو یہ دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق تک نہیں تھی۔ اس کا چہرہ اس حد تک سپاٹ تھا کہ پتھر سے تراشا گیا نظر آ رہا تھا۔

''مسٹر ڈاسن تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے

صرف اتنا کہا اور دوبارہ ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ لہجے میں دوستی کی جھلک تھی، نہ آشنائی کا شائبہ۔ صرف سرد مہری اور لاتعلقی تھی۔ جین چند لمحے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اسے احساس تھا کہ یہاں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ کوئی سنگین گڑبڑ۔ امکان یہی نظر آتا تھا کہ پیٹ مورگن کے والدین پرنسپل کے کمرے میں موجود تھے اور انہوں نے آتے ہی یقیناً خوب ہنگامہ مچایا تھا۔ مس ولسن کو تلخ کلامی، جھگڑے اور ہنگامے سے بڑی نفرت تھی ایک لمحے کے توقف کے بعد جین نے قدم بڑھایا اور ڈاسن کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا پہنچی۔ اسے یہ دیکھ کر ایک بار پھر حیرت کا سامنا کرنا پڑا کہ پیٹ مورگن یا اس کے والدین کمرے میں موجود نہیں تھے۔

پال ڈاسن کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔ عہدے کے اعتبار سے وہ جین کے لیے قابلِ احترام تھا لیکن اس احترام میں دوستی کی آمیزش تھی۔ اسکول کی چاردیواری سے باہر بھی جین کی اس سے ملاقاتیں رہی تھیں اور ابتدائی دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی پال ڈاسن نے ایک سنجیدہ سی تجویز اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، اگر جین واقعی شادی کی خواہش مند ہوتی تو پال اس کی نظر میں معقول ترین شوہر اور ٹیری کے لیے مشفق ترین باپ ہوتا لیکن وہ شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھی اس لیے انکار کے سوا چارہ نہیں تھا۔ پال نے اس کے انکار کو وقار اور متانت سے قبول کیا تھا اس کے بعد بھی بطور پرنسپل اور ٹیچر ان کے طرزِ عمل یا دوستانہ مراسم میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، کوئی ناگواری پیدا نہیں ہوئی تھی۔

پال ڈاسن اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑا تھا، جین کی آہٹ پا کر وہ مڑا۔ وہ دراز قد اور وجیہہ تھا۔ چہرے پر کہیں کہیں بڑھتی عمر کی پرچھائیاں قدم جما رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر جین کی طرف دیکھا اور فوراً ہی گویا نظر چراتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھو جین۔“

جین نے محسوس کیا کہ وہ بے حد پریشان ہے اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا ہی تاثر تھا جیسے حال ہی میں اسے کسی ایسے انکشاف سے دوچار ہونا پڑا جس نے اس کے حواس پر بجلی سی گرا دی ہو۔ جین نے بیٹھتے ہوئے حتی الامکان خوشدلی سے کہا۔ ”میرے خیال میں حالات اتنے بھی برے نہیں پال، پیٹ مورگن کے ماں باپ نے یہاں آ کر کم از کم فرنیچر تو نہیں توڑا ہمیں اسی پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ غالباً پیٹ ہی کے بارے میں بات کرنے کے لیے تم نے مجھے بلایا ہے۔“

”مسئلے کا تعلق پیٹ مورگن ہی سے ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔“ پال نے بوجھل لہجے میں کہا۔ وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا اور کچھ اس طرح گھوم گیا کہ اسے جین کی طرف نہ دیکھنا پڑے۔ ایک طویل سانس لے کر وہ بولا۔ ”جین! میں تم سے استعفا طلب کرنا چاہتا ہوں۔“ جین خاموشی سے اسے تک رہی تھی۔ پال بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”استعفا پیش کرنے کی تم کوئی بھی وجہ بیان کرسکتی ہو۔ خرابی صحت...... ترک سکونت یا کچھ اور......“

اب جین کو احساس ہوا کہ پال حد سے زیادہ سنجیدہ تھا اس کے معدے میں گرہ سی پڑنے لگی۔ پال کہہ رہا تھا۔ ”آج صبح بورڈ آف ایجوکیشن کی میٹنگ ہوئی تھی...... وہ لوگ نہیں چاہتے کہ تمہارے بارے میں کوئی اسکینڈل کھڑا ہو جائے۔ ان کی خواہش ہے کہ جس حد تک بھی ممکن ہو تم وقار سے رخصت ہو جاؤ۔“

”پال!“ جین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے

کہا۔ ”تم نے خود ہی تو پیٹ مورگن کے بارے میں رپورٹ طلب کی تھی۔ میں نے انتہائی دیانت داری سے تمہیں رپورٹ تیار کر دی۔ وہ رپورٹ بورڈ کے سامنے پیش کرنے کے لیے تو نہیں تھی۔“

”جین۔“ وہ تیزی سے بولا اور صرف ایک لمحے کے لیے اس کی طرف مڑا۔ ”کیا تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہو کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ میں کیوں تم سے استعفا طلب کر رہا ہوں؟“

”ہاں، مجھے واقعی نہیں معلوم۔“ جین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی گھما پھرا کر بات کرنے کی بجائے سیدھی طرح مجھے بتا دو کہ معاملہ کیا ہے؟“

”تفصیل میں جانا میرے لیے سخت اذیت کا باعث ہوگا۔ خصوصاً تمہارے سامنے۔“ پال نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اگر تم اصرار کر رہی ہو تو......“

”میں اصرار کر رہی ہوں۔“ جین بات کاٹ کر بولی۔

پال نے کرسی گھمائی اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ”ٹھیک ہے“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اس قصے کا پہلا باب تو یہ ہے۔“ اس نے میز سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ اٹھا کر جین کی طرف بڑھایا۔

جین نے پہلے تو تیزی سے پڑھنا شروع کیا لیکن پھر جیسے الفاظ اس کی آنکھوں میں چبھنے لگے اور دل دہشت سے ڈوبنے لگا۔ وہ دراصل جج ڈیلے، جو بورڈ آف ایجوکیشن کے چیئرمین بھی ہیں کے نام ایک خط تھا۔ چند سطریں پڑھنے کے بعد جین نے لکھنے والے کا نام دیکھنے کے لیے نیچے نظر ڈالی۔ خط کے آخر میں کوئی نام یا دستخط نہیں تھے۔ خط بھی اصل نہیں تھا، اصل کی ڈپلیکیٹ کاپی تھی۔ ”گمنام خط“ جین بڑبڑائی، خط کے مندرجات ناقابلِ یقین تھے۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جین نے پیٹ مورگن کے خلاف رپورٹ اس لیے تیار کی تھی کہ وہ اس سے مراسم استوار کرنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ اس نے پیٹ کو اپنی خواہشوں کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایک تو اس لیے اس کے دام میں نہیں آیا تھا کہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑی تھی، دوسرے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ معلمی جیسے مقدس پیشے سے وابستہ کوئی ہستی اپنے کسی شاگرد کو غیر اخلاقی مقاصد کی بھینٹ بھی چڑھا سکتی ہے۔

خط کے مطابق اپنی ناکامی اور اہانت کے احساس کے لیے اور اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کے لیے جین نے اس کے خلاف رپورٹ تیار کی تھی۔ صرف یہی نہیں، خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ صرف پیٹ مورگن ہی اس کا مطلوب نہیں رہا تھا، کئی تھے جن کی طرف اس کے جذبہ طلب نے قدم بڑھائے تھے۔ بورڈ آف ایجوکیشن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ فوری طور پر اس ٹیچر کے خلاف کارروائی کرے جس کا کردار اس حد تک پست ہے۔

جین کا اس خط پر ہنسنے کو دل چاہ رہا تھا مگر وہ ہنس نہیں رہی تھی ہنسنا تو درکنار وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ حلق میں جیسے کچھ پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس احساس سے اس کا جسم سن ہوا جا رہا تھا۔ خط کے مندرجات سے اس کے اپنے سوا باقی تقریباً پورا اسٹاف ہی واقف ہو چکا تھا۔ صبح سے اب تک لوگوں کا رویہ اس بات کا گواہ تھا۔ یقیناً اس کی ساتھی ٹیچرز اور بعض شاگردوں کو بھی بورڈ آف ایجوکیشن کے اجلاس میں طلب کیا گیا ہوگا اور ان سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔

”اس کے علاوہ بھی کچھ خطوط ہیں۔“ پال ڈاسن

نے کہا۔ ”ان میں کچھ لوگوں کے نام ہیں اور ان کے حوالے سے وقت اور تاریخوں کے ساتھ کچھ واقعات کا ذکر ہے۔“

”تم...... تم نے ان باتوں پر یقین کرلیا پال؟“ جین نے رندھی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ کرسی گھماتے ہوئے تقریباً چلا اٹھا۔ ”میں ایک ہفتے سے ان الزامات کے خلاف لڑ رہا تھا جین...... لیکن......“

”لیکن بورڈ نے تمہارے دلائل مسترد کردیے ہوں گے۔“ جین نے بات مکمل کی۔ ”لیکن پال اس سارے معاملے سے مجھے کیوں بے خبر رکھا گیا؟ مجھے بلا کر اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کیوں نہیں کہا گیا؟ یہ تو گویا گھر کی عدالت ہوگئی کہ گمنام لوگوں کے الزامات ملزم کو بتائے اور بلائے بغیر فیصلہ دے دیا گیا۔“

”تمہارے مفاد کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔“ پال بولا۔ ”کیا تم چاہتی ہو کہ بات بالکل عام ہو جائے؟“

”بات اور کس حد تک عام ہوگی پال؟ مجھے تو اب احساس ہوا ہے کہ اسکول میں تقریباً سب ہی کو علم ہے۔“ جین نے دکھ سے کہا۔

”افواہوں اور پیٹھ پیچھے ہونے والی باتوں کو نہیں روکا جاسکتا۔“ پال نے کہا۔ ”تاہم اگر تم صورت حال کو اس کی تمام تر ناگواری کے باوجود قبول کرلیتی ہو اور اپنی مرضی سے استعفادے دیتی ہو تو معاملہ یہیں دب جائے گا۔ کاؤنٹی کے اخبارات یا عدالت تک بات نہیں پہنچے گی، لیکن اگر تم باقاعدہ تفتیش اور عدالتی سماعت پر اصرار کرتی ہو تو جتنی باتیں بنیں گی وہ نہ تو بھلائی جاسکیں گی اور نہ ان کے بعد تم قصبے میں رہ سکو گی خواہ تم اپنی بے گناہی ثابت بھی کردو۔“

”کیا باقاعدہ سماعت کے دوران، جناب گمنام، آ کر میرے خلاف گواہی دیں گے؟“ جین نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

”پیٹ مورگن گواہی دے گا۔“ پال بولا۔ ”بورڈ کے سامنے تو وہ گواہی دے ہی چکا ہے۔“

”وہ جھوٹا، مکار...... غلیظ چوہا۔“ جین کی آواز شدت جذبات سے کانپ گئی پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ دیگر معززین جن کے نام لیے گئے ہیں؟“

”بورڈ نے ان میں سے کسی کو طلب نہیں کیا۔“ پال بولا۔ ”اگر ہم ہر ایک کو بلانا شروع کردیں گے تو اس قصبے کی تاریخ کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اسکینڈل اٹھ کھڑا ہوگا۔ بورڈ کو توقع ہے کہ؟“

”لعنت ہے اس بورڈ پر۔“ جین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے اپنا موقف پیش کرنے کا حق ہے۔ مجھے یہ بھی حق حاصل ہے کہ میں اپنے اوپر الزام لگانے والوں کا سامنا کروں۔ بشرطیکہ ان کا واقعی کوئی وجود ہو۔“ پھر اس کے لہجے میں تلخ تجسس در آیا۔ ”اور کیا میری ساتھی ٹیچرز نے بھی نوجوان پیٹ مورگن کے الزام کی تائید کی تھی؟“

پال نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”ان کا کہنا ہے کہ تمہارے کردار پر شبہہ کرنے کا وہ دل میں خیال بھی نہیں لاسکتیں لیکن......“ اس کا لہجہ طنزیہ سا ہوگیا اور اس نے گویا دوسروں کے الفاظ دہرائے۔ ”حالات حقائق اور الزامات کی روشنی میں امکانات پر غور کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے اور بات ادھوری رہنے دی۔

جین ایک لمحے کے لیے خاموش رہی پھر مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں ان الزامات کا مقابلہ کروں گی۔ تم مجھے ملازمت سے برخاست نہیں کرسکتے۔ معاملے کی باقاعدہ سماعت کے بغیر ٹیچرز یونین بھی

اس کی اجازت نہیں دے گی۔“

پال کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہیں ٹیری کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔“

ٹیری کے تصور نے جین کو گویا ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے چشم تصور سے ٹیری کو گریڈ اسکول میں اپنے کلاس روم میں بیٹھے دیکھا۔ شاید بات اس کے کلاس فیلوز تک بھی پہنچ چکی ہو، جین نے سوچا۔

پال کہہ رہا تھا۔ ”اگر تم استعفادے دیتی ہو تو تم اور ٹیری کسی بھی ایسی جگہ جا کر سکونت پذیر ہوسکتے ہو جہاں افواہیں تمہارا تعاقب نہیں کریں گی۔ اس کے برعکس اگر تم مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہو تو اخبارات صفحہ اول پر تمہاری بڑی بڑی تصویروں کے ساتھ اس معاملے کو اچھالیں گے۔ اخبارات کو خوبصورت عورتوں کے چھوٹے چھوٹے اسکینڈل سے بھی بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر تم جیت بھی گئیں اور تم نے اپنی بے گناہی ثابت بھی کردی تب بھی اس وقت تک تم پر اتنی کیچڑ اچھالی جاچکی ہوگی کہ کم از کم اس قصبے کے ماحول میں تمہارا رہنا دشوار ہوگا۔“

”محض ایک بے نام خط کی بدولت......“ جین نے جملہ ادھورا چھوڑ کر قہقہہ لگانا چاہا مگر قہقہے کی بجائے اس کے حلق سے ایک سسکی سی برآمد ہوئی۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔

پال اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اگر بچے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں بھی یہی مشورہ دیتا کہ مقابلہ کرو لیکن...... کیا عمر ہے اس کی؟ غالباً گیارہ سال...... کیا اثرات مرتب ہوں گے اس کے ذہن پر؟ جب وہ چھوٹی موٹی شہادتوں کی تفصیل سنے گا۔“

”تمہارا اشارہ میرے گھناؤنے ماضی میں مدفون لرزہ خیز واقعات کی طرف ہے؟ مثلاً میرا چند ایک مرتبہ تمہارے ساتھ سیر کو جانا...... یا ایک مرتبہ غلطی سے میرا جارج ہمفرے سے لفٹ لے لینا اور اس کا راستے میں دست درازی پر اتر آنا...... شہادتوں سے یہی مراد ہے نا تمہاری؟“

”ہاں۔“ پال نے ناخوشی سے کہا۔ ”عدالتوں میں چھوٹی سے چھوٹی شہادت بھی زیر بحث آتی ہے۔ جج ڈیلے تمہارے آنجہانی شوہر کا وکیل رہا ہے۔ اس کی زمین اور جائیداد وغیرہ کے معاملات وہی طے کرتا تھا لیکن وہ بورڈ آف ایجوکیشن کا چیئرمین بھی ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمہارا ہمدرد اور بہی خواہ ہے۔ جا کر اس سے مشورہ کرو۔“

جین کو اچھی طرح یاد تھا۔ بل نے بھی اسپتال میں بستر مرگ پر یہی کہا تھا۔ ”جین، جج ڈیلے ہمارا سچا ہمدرد اور بہی خواہ ہے، میرے بعد زندگی میں تم اس کی ذات پر اعتماد کرسکتی ہو۔“

پال بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کے بعد بھی اگر تم مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہو تو......“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہرحال میں تمہارا ساتھ دوں گا خواہ اس کے لئے مجھے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں۔“

”تم نے یہ کہنے کی ہمت تو کی۔“ جین اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میرے لیے یہی کافی ہے۔ اب غالباً تم یہ تو نہیں چاہو گے کہ میں کلاس کو مزید پڑھاؤں؟ میں تو اب چھوت کی مریضہ ہوچکی ہوں نا...... کہیں بچوں پر میرا سایہ نہ پڑ جائے۔“

”جین پلیز۔“ پال نے بے چارگی سے کہا۔ جین تیزی سے مڑی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ مس ولسن پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں اسٹور کیپر سے کہتی ہوں کہ جراثیم کش دوا

کی دو بوتلیں یہاں بھیج دے۔" جین نے اس کی میز کے قریب رک کر تلخ لہجے میں کہا۔"میری بدکرداری کے جراثیم یہاں پھیل گئے ہوں گے نا...... کہیں تمھیں متاثر نہ کرنے لگیں۔"

مس ولسن کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ جین تیزی سے دفتر سے نکل آئی۔

✿......☾......✿

جج ڈیلے ان لوگوں میں سے تھا جو لیک ویو میں ہی پیدا ہوئے تھے اور یہیں ان کا بچپن اور جوانی گزری۔ وہ ہر اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا جو اس کے باپ کے زمانے سے لے کر اب تک لیک ویو میں رہ چکا تھا۔ اس کا باپ بھی جج ہی تھا اور ڈیلے صحیح معنوں میں باپ کا جانشین ثابت ہوا تھا۔ وہ پچاس کے پیٹے میں تھا اور اس کی گہری نیلی آنکھوں سے بلا کی چالاکی چھلکتی تھی۔ جین سے اس کا رویہ مشفقانہ رہا تھا تاہم جین اس شخص کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی لیکن آج مجبوراً وہ اس کے پاس چلی آئی تھی۔

"مجھے معلوم ہے مسٹر ڈیلے۔" جین نے گفتگو کے دوران کہا۔"کہ بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے تمھیں اپنی ذمے داریاں پوری کرنی ہیں لیکن تم میرے آنجہانی شوہر کے قانونی مشیر رہے ہو اور اب بھی اس کی زمین وغیرہ کے منتظم ہو چنانچہ میری طرف سے بھی تم پر کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔"

"ہم اس مسئلے پر بالترتیب بات کرتے ہیں جین۔" ڈیلے نے رومال سے اپنا پھولا پھولا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔"بورڈ آف ایجوکیشن کسی عدالت کا سا طریقہ کار اختیار نہیں کرسکتا۔ ہمیں محض شک وشبہے کی بنیاد پر بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں کیونکہ ہمیں سیکڑوں بچوں کی حفاظت کرنی ہوتی ہے۔"

"کیا انہیں مجھ سے خطرہ لاحق ہے؟" جین نے رودینے کے سے انداز میں پوچھا۔

"بورڈ کو جو فیصلہ کرنا ہے کرچکا ہے۔" جج ڈیلے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"اب اگر تم اس معاملے کو خاموشی سے دبانے میں تعاون نہیں کرتیں تو بورڈ مجبوراً اپنی شہادتیں اور دلائل پیش کرے گا۔ ضروری نہیں کہ تم قصوروار قرار پاؤ لیکن معاشرے میں کہا جاتا ہے کہ جہاں دھواں اٹھے گا وہاں آگ ضرور لگی ہوگی۔ پس منظر کے ساتھ بورڈ کسی ٹیچر کو تدریس جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"اب تم میرے وکیل کی حیثیت سے بات کرو مسٹر ڈیلے۔" جین نے گہری سانس لے کر کہا۔

جج ڈیلے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔"تم پر جو الزام لگایا گیا ہے کیا وہ درست ہے جین؟"

"مجھے سخت افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے یہ سوال کیا۔" جین نے برہمی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تحمل سے کام لو جین۔" ڈیلے نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔"یہ سوال میں بطور وکیل اپنے ہر کلائنٹ سے کرتا ہوں۔ اب تم مجھے مزید واضح الفاظ میں بات کرنے پر معاف کردینا۔ کیا تم نے کبھی اس لڑکے پیٹ مورگن پر التفات کا مظاہرہ کیا تھا؟"

"اس خبیث...... بدمعاش پر......؟" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی پھر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جج خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب اس کے دل کا غبار نکل چکا اور وہ کچھ پرسکون ہوچکی تو جج نے سمجھانے کے سے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"فطری تقاضے ہر انسان کی ذات کا ایک حصہ ہیں لیکن بہت سے لوگ ان معاملات میں کجرو ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ سوچتے ہیں کہ تم جوان ہو، بیوہ ہو، لازماً فطرت کے تقاضے تمھیں بھی پریشان کرتے ہوں گے اس لیے...... تمہارے دل کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تم اپنی تمام تر معصومیت اور سادہ دلی کے ساتھ کسی کی طرف مسکرا کر بھی دیکھ لو تو وہ اسے ایک دعوت سمجھ سکتا ہے کہ تم کچھ زیادہ ہی قریب آرہی ہو۔ وہ اسے ایک دعوت تصور کرسکتا ہے اور اگر تم مردوں کے ساتھ رکھائی اور سرد مہری کا رویہ اپنائے رکھو تب بھی وہ یہی سمجھیں گے کہ تم بن رہی ہو اور درحقیقت تمہارے دل میں طلب کروٹیں لے رہی ہے۔ ایک حسین بیوہ ہونے اور کسی مرد کی دوست نہ ہونے کی صورت میں عورت کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مانا کہ آخر کار تم اپنی بے گناہی ثابت کردو گی لیکن اس وقت تک کسی کو بھی تمہاری نیک چلنی کا سو فیصد یقین نہیں رہے گا۔ شک کی پرچھائیاں ہر ذہن میں رینگتی رہیں گی، تم مقدمہ تو جیت سکتی ہو لیکن باعزت طور پر یہاں رہنے کی جنگ نہیں جیت سکتیں۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہو؟"

جین اچھی طرح سمجھ رہی تھی، جج ڈیلے کا مفہوم بھی کم وبیش یہی تھا جو پال ڈاسن کا تھا۔ جج نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"سب سے بڑا مسئلہ ٹیری کا ہے۔ ہمارے قصبے میں شکی مزاج اور تنگ ذہن عورتوں کی کمی نہیں جو اپنے بچوں کو ٹیری کے ساتھ کھیلنے سے منع کریں گی۔ بچے ٹیری پر فقرے کسا کریں گے۔ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی تمھیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

چند لمحے خاموشی کے بعد جین فیصلہ کن لہجے میں بولی۔"کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں ساری صورت حال ٹیری کے سامنے رکھوں گی۔"

"گیارہ سال کے بچے کے سامنے؟" جج کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"بعض بچوں کو وقت سے پہلے جوان ہونا پڑتا ہے۔" جین نے بوجھل لہجے میں کہا۔"ویسے بھی یہ صرف میری نہیں اس کی زندگی کا بھی مسئلہ ہے۔ لوگوں نے تو ابھی سے میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھنا شروع کردیا ہے۔ ممکن ہے بات ٹیری تک پہنچ بھی چکی ہو۔ اگر میں اسے اعتماد میں نہیں لوں گی تو جانے کیا سوچے۔ میں اسے بھی فیصلہ کرنے کا حق دینا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کے محسوسات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔"

وہ اپنی چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر جج ڈیلے کے دفتر سے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس کا مکان ایلم اسٹریٹ میں واقع تھا اور اس کی طرف لوٹ کر آنا اسے ہمیشہ ایک خوشگوار عمل محسوس ہوا تھا۔ یہ اس کی اپنی گلی تھی۔ یہاں کی فضا میں ہمیشہ اسے گرمجوشی رچی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن شاید یہ اس کے تصور کا شاخسانہ تھا کہ آج وہ خود کو اپنی گلی میں اجنبی محسوس کررہی تھی۔ ہر گھر کے دروازے گویا اس پر بند ہوچکے تھے اور ہر شخص نے جیسے اس سے منہ موڑ لیا تھا۔

مکان کے سامنے گاڑی روکتے ہی ٹیری اسے پورچ کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ چند لمحے گاڑی میں ہی بیٹھی، اپنی توانائی مجتمع کرنے کی کوشش کرتی رہی اور ٹیری کو دیکھتی رہی۔ پورچ کی سیڑھی پر سر جھکائے بیٹھا وہ کچھ زیادہ ہی تنہا تنہا اور ناتواں نظر آرہا تھا۔ اس کا وجود بے حد چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔ آخر وہ بچہ ہی تو تھا۔ تاہم اپنے طرز عمل سے وہ

ناسمجھ بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوش مزاج اور ہنس مکھ ضرور تھا لیکن بیشتر معاملات میں اس پر اپنی عمر سے کہیں زیادہ متانت طاری رہتی تھی۔ وہ جو کچھ بھی تھا بہر حال وہی جین کا سب کچھ تھا۔ جین اندر پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر سیڑھیوں سے اتر آیا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر جین کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ سب کچھ سن چکا ہے؟

جین نے اسے پیار کیا تو وہ بولا۔ ''اچھا ہوا آپ آ گئیں ممی! میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟''

''کس سلسلے میں؟'' جین نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''عجیب سی بات ہے۔'' ٹیری نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں جب گھر پہنچا تو یہ کاغذ مجھے کیل سے دروازے پر لگا ہوا نظر آیا...... آپ کو دکھاتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

جین نے کاغذ پر ایک نظر ڈالی' اس پر ایک عورت کا فحش خاکہ تھا اور نیچے جلی حروف میں لکھا تھا 'طوائف'

کراہیت سے جین کو ابکائی سی آ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ٹیری لفظ' طوائف' کا مطلب سمجھتا ہے یا نہیں لیکن ٹیری کا پریشان چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت کچھ سمجھتا ہے۔ جین نے اذیت کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ گرد و پیش کا منظر اس کی نظر میں دھندلانے لگا تھا۔

❀......☾......❀

رات کے کھانے کے لیے وہ ٹیری کو لیک ویو سے باہر لے گئی۔ اپنا مکان اسے شیشے کا مرتبان محسوس ہونے لگا تھا جس میں وہ اور ٹیری رنگین مچھلیوں کی طرح تیر رہے تھے اور پورا قصبہ گویا ارد گرد کھڑا انہیں تک رہا تھا۔ وہ ایک قریبی قصبے کے ریستوران میں آ چکے تھے۔ ٹیری نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے اور اس کی ممی پریشان ہیں لیکن اس نے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ریستوران کے پرانی طرز کے ہال میں بہت کم گاہک تھے۔ کھانے کے دوران بالآخر ٹیری بول اٹھا۔ ''ممی! بہتر ہوگا آپ مجھے بتا دیں کہ آخر آپ کیوں پریشان ہیں؟ آپ کی پریشانی کی وجہ صرف وہ خاکہ نہیں' کچھ اور بھی ہے۔''

تب جین نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا اور جب جین خاموش ہوئی تو بولا۔ ''ہم مقابلہ کریں گے ممی' ان گندے لوگوں کو اپنے الزامات واپس لینے پڑیں گے اور اس ساری شرارت کے نتیجے میں پیٹ مورگن کو جیل جانا ہوگا۔''

تب جین نے اسے وہ سب کچھ سمجھایا جو پال ڈاسن اور جج ڈیلے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اس کے جواب میں ٹیری نے اپنی عمر سے کہیں بردباری اور سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بات کہی اسے سن کر جین فخر و مسرت سے سرشار ہو گئی۔

ٹیری بولا۔ ''ممی اگر ہم راہ فرار اختیار کریں گے تو ہم خود بھی اپنے آپ کو چور چور سا محسوس کریں گے۔ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے بعد بے شک ہم یہاں سے چلے جائیں' تب ہمارے ضمیر پر کوئی بوجھ تو نہیں ہوگا...... میں ہر حال میں' الزام تراشی کرنے والوں کا مقابلہ کرنا چاہوں گا۔ انہیں اپنی بدمعاشی کی سزا ملنی چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی بے گناہی کے باوجود چوروں کی طرح منہ چھپا کر فرار ہو جائیں۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے ٹیری ڈارلنگ۔'' جین

نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہیں ٹیری کو سینے سے لگا لے مگر اسے معلوم تھا کہ ٹیری اس کی اس حرکت سے شرمندہ سا ہو جائے گا۔ ''اب میرا دل ہلکا ہو گیا ہے ٹیری۔'' وہ بولی۔ ''آج ہم سکون سے سوئیں گے اور صبح اس مسئلے پر مزید بات کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ٹیری بولا۔ ''آپ بہر حال جو بھی فیصلہ کریں وہ مجھے منظور ہوگا۔''

کھانے کے بعد جب باہر آ کر جین نے پارکنگ لاٹ سے اپنی چھوٹی سی کار نکالی اور وہ واپس روانہ ہونے لگے تو جین نے سڑک کے پار ایک شخص کو دیکھا۔ وہ موٹر سائیکل پر تھا اور اس نے ان کی گاڑی کے ساتھ ہی اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تھی۔ وہ چمڑے کی سیاہ جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر سیاہ ہی ہیلمٹ تھا اور آنکھوں پر رنگین شیشوں کی عینک۔ اس حلیے میں اس کی صورت دیکھنا یا اسے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی پارکنگ لاٹ کی سڑک پر روشنی بہت کم تھی۔ تاہم جین کی چھٹی حس اسے احساس دلا رہی تھی کہ وہ پیٹ مورگن تھا۔

پیٹ اور اس کے ٹولے کے پاس موٹر سائیکلیں تھیں۔ بہر حال جین نے ٹیری کی توجہ اس طرف مبذول نہیں کرائی اور خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی لیکن عقب نما آئینے میں ایک ہیڈ لائٹ کو حرکت کرتے دیکھ کر اس کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ موٹر سائیکل اس کے تعاقب میں چل پڑی۔ تب اسے یہ بات ٹیری کو بتانا پڑی۔

''میں نے بھی اسے پارکنگ لاٹ سے نکلتے ہی دیکھ لیا تھا۔'' ٹیری نے کہا۔

''میں کار کی رفتار کم کرتی ہوں تاکہ وہ آگے نکل جائے۔'' جین نے کہا۔

''ٹیری نے سیٹ پر پہلو بدل کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے بھی رفتار کم کر دی ہے ممی۔''

جین کے اعصاب منتشر سے ہونے لگے۔ اس قصبے اور لیک ویو کے درمیان خال خال ہی آبادی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی اسے کسی گھر میں روشنی نظر آئے گی وہ گاڑی روک لے گی اور پولیس کی مدد طلب کر لے گی۔

''ممی۔'' دفعتاً ٹیری نے قدرے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''سڑک کے کنارے ایک اور موٹر سائیکل نکل آئی ہے اور...... اور اب اور...... وہ تین ہو گئے ہیں۔''

جین نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا اور کار ایک جھٹکے سے مزید تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے عقبی آئینے پر نظر ڈالی۔ اس کے تعاقب میں اب چار ہیڈ لائٹس متحرک نظر آ رہی تھیں اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان میں پانچویں بھی شامل ہو گئی۔

''یہ چاہتے کیا ہیں ممی؟'' ٹیری نے جاننا چاہا۔

جین نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

''معلوم نہیں۔'' وہ مرتعش لہجے میں بولی۔

اس وقت کار کی رفتار ساٹھ کے قریب تھی جب ٹیری پیچھے دیکھتے ہوئے تقریباً چلا اٹھا۔ ''ان میں سے ایک ہم سے آگے نکلنے کے لیے آ رہا ہے ممی۔''

جین نے موٹر سائیکل کا شور قریب آتے ہوئے محسوس کر لیا تھا۔ پھر ایک موٹر سائیکل سوار کھڑکی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گزرنے لگا۔ اس کا چہرہ ہیلمٹ اور چشمے میں چھپا ہوا تھا مگر ہونٹ نظر آ رہے تھے اور ان ہونٹوں پر نہایت نفرت انگیز مسکراہٹ تھی۔

''طوائف۔'' وہ پوری قوت سے چلایا اور کار سے آگے نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرا موٹر

سائیکل سوار آیا۔ اس نے بھی اسی انداز میں یہ لفظ دہرایا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا موٹر سائیکل سوار بھی اسی طرح جین کی سماعت پر انگارے برساتا ہوا گزر گیا۔

جین سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ چاروں موٹر سائیکلوں کی عقبی بتیاں اگلے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ پانچویں موٹر سائیکل اب بھی اس کے تعاقب میں تھی۔ اگلا موڑ عبور کر کے جین کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چاروں موٹر سائیکلوں کی عقبی بتیاں غائب ہو چکی تھیں۔

''وہ لوگ جا چکے ہیں ممی۔'' ٹیری نے کہا لیکن چند لمحے بعد ماں بیٹے کو احساس ہوا کہ یہ محض ان کی خوش فہمی تھی۔ وہ چاروں اپنی موٹر سائیکلیں سڑک سے...... اتار کر انجن بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے اور جیسے ہی جین کی کار آگے نکلی وہ ایک بار پھر اس کے تعاقب میں چل پڑے تھے۔ عقب نما آئینے میں جین کو اب پھر پانچ ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد دوبارہ وہی عمل شروع ہو گیا۔ ایک ایک کر کے موٹر سائیکل سوار اس کی کار کو تقریباً چھوتے ہوئے اور اس کے کان کے عین قریب گلا پھاڑ پھاڑ کر وہی مکروہ لفظ بار بار دہراتے ہوئے گزرنے لگے۔

جین کے ہاتھ تشنج کی سی کیفیت میں اسٹیئرنگ وہیل پر جمے ہوئے تھے لیکن ان آوازوں سے گویا اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہ سیٹ پر ترچھی ہوئی جا رہی تھی جیسے اس طرح اس کی سماعت پر انگارے برسنا بند ہو جائیں گے۔

''ممی!'' دفعتاً ٹیری چلایا۔ جین کو احساس ہی نہیں ہو سکا تھا کہ غیر ارادی طور پر وہ گاڑی کو سڑک کے عین کنارے پر لے آئی تھی۔ پھر اس کے دو پہیے کچے میں اتر گئے۔ زمین کچھ زیادہ ہی نرم تھی۔ گاڑی ایک نالے کے معمولی سے جنگلے کو توڑتی ہوئی نشیب میں لڑھک گئی تھی۔ اس نے جبلی طور پر ٹیری کو تھامنے، اسے بچانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ذہن میں ٹیری کے تصور کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس تصور پر بھی تاریکی غالب آ گئی۔ اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

❀......☾......❀

پہلی آواز اسے ٹیری ہی کی سنائی دی وہ پکار رہا تھا۔ ''ممی! ہوش میں آیئے۔''

جین کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کسی نرم اور آرام دہ چیز پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے منہ میں برانڈی کا ذائقہ باقی تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اس کے چاروں طرف ایسی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی پھر اسے ٹیری اپنے اوپر جھکا ہوا نظر آیا۔ جین مسکرا دی۔ اور ٹیری نے سکون کی سانس لی۔ ''آپ نے تو مجھے دہشت زدہ ہی کر دیا تھا ممی۔'' وہ شکوہ آمیز لہجے میں بولا پھر اس نے گردن گھما کر گویا کسی کو اطلاع دی۔ ''ممی کو ہوش آ گیا ہے مسٹر بیومونٹ۔''

جین نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہ ایک طویل و عریض رہائشی کمرہ تھا، کھڑکیوں پر بھاری بھاری عنابی پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف بڑا سا آتش دان نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر پکاسو کی پینٹنگز آویزاں تھیں جو اصلی تو نہیں تھیں لیکن نقل بہ مطابق اصل ضرور تھیں۔ جین ایک آرام دہ کاؤچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ''آپ کچھ اور برانڈی پینا پسند کریں گی مسز وارڈ مین۔'' جین نے یہ آواز سن کر گردن قدرے ترچھی کر کے دیکھا۔ اس کے سرہانے ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا صرف ایک ہی رخ جین کو نظر آ رہا تھا اور وہ ایسا ہی تھا جیسے کسی یونانی سکے پر ابھری ہوئی حسن و محبت کے دیوتا

کی تصویر۔ جین نے زندگی میں بہت کم ایسے وجیہہ مرد دیکھے تھے۔ اس کے بال سنہرے تھے، گلے میں اسکارف تھا اور اس کی ٹویڈ کی جیکٹ بے حد قیمتی نظر آ رہی تھی۔

جین کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولا۔ ''آپ بڑی خوش قسمت ہیں کہ حادثے میں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچی تاہم اطمینان کے لیے میں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا ہے۔'' اس کے لہجے میں برطانوی تلفظ کی جھلک تھی۔ اس کا نام جین کو کچھ مانوس سا محسوس ہوا تھا۔

''میں ہوں تو بالکل ٹھیک۔'' جین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تاہم تھوڑی سی مزید برانڈی سے شاید طبیعت مزید بہتر محسوس ہو۔''

جب وہ برانڈی کا گلاس جین کو دینے کے لیے آگے آیا تو جین کو اس کے چہرے کا دوسرا رخ نظر آیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس کا آدھا چہرہ گویا اس کا اپنا نہیں کسی عفریت یا بلا کا تھا جسے اس کے چہرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ آدھا چہرہ اتنا خوبصورت اور آدھا چہرہ اتنا ڈراؤنا۔ اس طرف کا ہر نقش مسخ شدہ تھا۔

''اپنی چیخ مت روکو۔'' بیومونٹ نے قدرے تلخی سے کہا۔

جین کے کچھ کہنے سے پہلے ٹیری بول اٹھا۔ ''ممی! آپ کو یاد ہے جون بیومونٹ مشہور ترین فلمی ہیرو ہوا کرتے تھے۔ ہم ان کی ہر فلم بڑے شوق سے دیکھنے جایا کرتے تھے۔ ان کی کار کو حادثہ پیش آ گیا تھا جس میں ان کا آدھا چہرہ تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم نے سن تو رکھا تھا کہ انہوں نے یہیں کہیں قریب ہی مکان لے رکھا ہے۔ لیکن غالباً یہ کہیں آتے جاتے نہیں۔ اس لیے ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بتا رہے تھے کہ شاید کچھ عرصے بعد سرجن ان کا چہرہ ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔''

''میں معافی چاہتی ہوں مسٹر بیومونٹ۔'' جین نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''معذرت کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ کھردری سی آواز میں بولا۔

''میرا پورا چہرہ دیکھ کر تقریباً ہر شخص کی چیخ نکل جاتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹیری کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر جین کے سامنے اس کے چہرے کا پرکشش رخ آ گیا۔ یہ وہی چہرہ تھا جس نے بیومونٹ کی کامیابی کے مختصر دور میں امریکا کی آدھی عورتوں کو اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ بیومونٹ ٹیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''حادثے کے بعد سے آج تک میں نے یہ پہلا لڑکا دیکھا ہے جس نے میرے پورے وجود پر نظر پڑنے کے بعد نہ تو چیخ ماری اور نہ ہی جھرجھری لی۔ بلکہ اس طرح پرسکون رہا جیسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

ٹیری، جین کو بتانے لگا۔ ''مسٹر بیومونٹ کا مکان سڑک سے کافی ہٹ کر ہے لیکن انہوں نے ہماری کار الٹنے کی آواز سن لی تھی اور یہی آپ کو اٹھا کر یہاں لائے تھے۔''

''نشیب میں آ کر تمہاری کار حیرت انگیز طور پر سیدھی ہو گئی تھی۔'' بیومونٹ اب دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''اور یہ تقریباً ایک معجزہ ہی ہے کہ اس کا ایک شیشہ تک نہیں ٹوٹا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں اٹھا کر یہاں لے آیا جائے۔''

جین کو اب سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ موٹر سائیکلوں کا شور، ان لڑکوں کی شیطانی مسکراہٹ اور وہ غلیظ لفظ...... بیومونٹ کی آواز اب جیسے بازگشت کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ ''ٹیری نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا

ہے جو آج تمہارے ساتھ پیش آیا ہے۔ میں اسے ایک بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں کہ اس بچے نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اس حد تک اعتماد کے قابل سمجھا کہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی' میرا خیال ہے تم ان بدمعاشوں میں سے تو کسی کو نہیں پہچان سکتیں' جنہوں نے تمہیں گاڑی سڑک سے اتارنے پر مجبور کر دیا تھا اور حادثے کا سبب بنے تھے؟''

جین نے نفی میں سر ہلایا۔

''گو کہ تم نے میری رائے طلب نہیں کی لیکن میں یہی کہوں گا کہ میں ٹیری سے متفق ہوں۔'' بیومونٹ بولا۔ ''تمہیں مقابلہ کرنا چاہیے۔ خواہ اس کے لیے تمہیں کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

عین اسی لمحے شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا سنائی دیا۔ کھڑکی کا پردہ مرتعش ہوا پھر اس کے عقب سے ایک بڑا سا پتھر اور شیشے کی ڈھیروں کرچیاں قالین پر آ کر گریں۔ باہر ایک بار پھر کوئی چڑانے کے سے انداز میں چلایا۔ ''طوائف......!'' اور پھر وہ اسی انداز میں اس لفظ کی تکرار کرنے لگا۔

''لائٹ آف کر دو ٹیری۔'' بیومونٹ نے پرسکون لہجے میں کہا۔

چند لمحے بعد کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ بیومونٹ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا۔ پردہ اس نے سمیٹ دیا تھا باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے جین کو کھڑکی میں اس کا ہیولا نظر آ رہا تھا' باہر ایک بار پھر وہی آواز کسی بدروح کی پکار کی طرح گونجی۔ بیومونٹ پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر گلدان نما ایک برتن اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔ اس میں ایک ......کئی چھڑیاں کھڑی تھیں' بیومونٹ نے موٹے سے دستے والی ایک چھڑی نکالی اور دوسرے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ وہ جیسے ہی اپنے باغیچے کا گیٹ کھول کر باہر آیا' ایک موٹر سائیکل بیدار ہونے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے موٹر سائیکل سڑک کی طرف جاتی دکھائی دی۔ آس پاس کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیومونٹ غصے سے اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا۔ برسوں کی محرومیوں.........؟ آج شاید امڈ پڑتا لیکن موقع ہی ہاتھ سے نکل گیا۔ کمبخت' بدمعاش بھاگ گیا۔

غصہ جانے کتنی باتوں پر بیومونٹ کے وجود میں اندر ہی اندر پیدا ہو رہا تھا۔ حادثے کے بعد اس نے شو بزنس کی دنیا میں جو تھوڑا بہت عرصہ گزارا تھا وہ بڑی اذیت کے عالم میں گزرا تھا۔ فنکار جو اس کی دوستی کا دم بھرتے نہیں تھکتے تھے' اس کی پیٹھ پیچھے قہقہے لگاتے ہوئے کہتے تھے۔ ''اب دیکھیں گے حسینائیں کس طرح اس کے گرد منڈلاتی ہیں۔'' اور یہ باتیں بیومونٹ کے کانوں میں بھی پہنچ ہی جاتی تھیں۔

وہ اداکارائیں جو اس کی الفت میں مری جاتی تھیں' فون کر کے کہتی تھیں۔ ''معاف کرنا ڈارلنگ میں' اسپتال میں تمہاری مزاج پرسی کے لیے ضرور آتی لیکن شوٹنگز سے فرصت ہی نہیں ملی۔ اس کے حادثے کے بارے میں بھی طرح طرح کے افسانے تراشے گئے تھے۔ افسانے تراشنے والوں میں اس کی دوستی کے دعویدار ہی پیش پیش رہے تھے۔ کسی نے کہا وہ اس وقت نشے میں دھت تھا۔ جب اس کی کار پہاڑی راستے پر قابو سے باہر ہوئی' کسی نے انکشاف کیا کہ وہ تو خطرناک منشیات کا عادی ہے۔ اخباروں نے خوب خوب سرخیاں جمائیں۔

بیومونٹ کو اس دنیا سے نفرت ہو گئی تھی جہاں تمام جذبے ساری خیر خواہی انسان کی کامیابی کے گرد گھومتی تھی ادھر آپ کو زوال آیا اور ادھر سب جذبے

ہوا ہوئے۔ صرف نفرت وحقارت رہ گئی۔ بیومونٹ کے تحت الشعور میں وہ سب آوازیں اسی طرح گونجتی تھیں جس طرح آج میدان میں یہ بدمعاش چلا رہا تھا۔ ''طوائف...... طوائف......'' بیومونٹ کو اچھی طرح جین کے کرب کا اندازہ تھا' اسے معلوم تھا کہ یہ آوازیں سن کر جین پر کیا گزری ہو گی۔ وہ واپس اندر جانے کے لیے مڑنے ہی لگا تھا کہ ایک کار کی ہیڈ لائٹس اسے مکان کی طرف گھومتی نظر آئیں۔ غالباً ڈاکٹر آ رہا تھا۔ اس ڈاکٹر کا فون نمبر ٹیری ہی نے بیومونٹ کو دیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ ان کا فیملی ڈاکٹر ہے اس کا نام اسٹیفن گرانٹ تھا۔

اسٹیفن گرانٹ کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ لیک ویو کی آدھی آبادی نے اسی کے سامنے دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس نے یقیناً انسانی زندگی کو بڑی بڑی ڈراؤنی شکلوں میں دیکھا ہو گا لیکن بیومونٹ کو دیکھ کر وہ بھی ہڑبڑائے بغیر نہ رہ سکا تاہم دوسرے ہی لمحے وہ پرسکون اور قدرے معذرت خواہ نظر آنے لگا۔ بیومونٹ اسے اندر لایا۔

جین اب تکیے کے سہارے بیٹھی تھی اور ٹیری کو پیار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ بولی۔ ''مجھے تو امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے ڈاکٹر اسٹیفن۔''

''اب ایسی بھی کیا بات تھی جین۔'' ڈاکٹر قدرے کھسیانے سے لہجے میں بولا۔

جین نے بیومونٹ کو بتایا۔ ''ڈاکٹر اسٹیفن گرانٹ بھی بورڈ آف ایجوکیشن کے رکن ہیں۔''

بیومونٹ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رک گیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اس ڈاکٹر کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتا۔''

''مسٹر بیومونٹ......'' ڈاکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔

''صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔'' بیومونٹ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ مسز وارڈ مین کا معائنہ کیجیے۔''

وہ اس کی کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا جس کا جہازی سائز کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ ٹیری نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ شیشہ تو خاصا مہنگا رہا ہو گا مسٹر بیومونٹ؟''

''بے شک۔'' بیومونٹ نے جواب دیا۔ ''اور اگر وہ بدمعاش مجھے دیکھ کر بھاگ نہ جاتا تو میں نہ صرف اس سے قیمت وصول کر کے چھوڑتا بلکہ اسے ایسا سبق بھی دیتا کہ آئندہ وہ کسی کی کھڑکی کا شیشہ توڑنے کی جرات نہ کرتا۔''

ڈاکٹر اسٹیفن نے معائنے سے فارغ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم خوش قسمت ہو جین' کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ البتہ اچھی طرح سونے کے لیے تمہیں مسکن دوا کی ضرورت ہو گی۔ صبح اگر تم جسم کے کسی حصے میں درد یا کھنچاؤ محسوس کرو تو میرے پاس چلی آنا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ ''تم ان لوگوں کو پہچانتی ہو جو حادثے کا سبب بنے تھے؟''

جین خاموش رہی۔ شاید اس تاسف کے تحت کہ ڈاکٹر جیسے جہاندیدہ شخص کو بھی یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

بیومونٹ تلخ لہجے میں بولا۔ ''مسز وارڈ مین کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ پیٹ مورگن اور اس کا ٹولا تھا جو موٹر سائیکلوں پر ان اطراف میں ہنگامہ برپا کرتا پھرتا رہتا ہے لیکن وہ یہ بات اس لیے آپ کو نہیں بتا رہی ہیں کہ شاید آپ پھر یہی سوچنے لگیں کہ وہ پیٹ پر اس لیے الزام تراشی کر رہی ہیں کہ اس نے ان کی شیطانی خواہشات کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ مجھ پر کیوں برہم ہیں

مسٹر بیومونٹ۔" ڈاکٹر نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو بتادوں کہ......"

"آپ مجھے کچھ مت بتایئے ڈاکٹر۔" بیومونٹ نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "البتہ میں آپ کو بتادیتا ہوں کہ مسز وارڈ مین نے اگر درد وغیرہ محسوس کیا تو وہ اس کے علاج کے لیے آپ کے پاس نہیں آئیں گی۔ یہ تو بڑی ستم ظریفی ہے کہ انسان انہی کے پاس دوا کے لیے جائے جنہوں نے درد دیا ہو۔ اگر آپ اور آپ کے معزز ساتھی مل کر مسز وارڈ مین کے متعلق یک طرفہ فیصلے نہ کرتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جارہا تھا۔ وہ گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کررہا تھا تاہم اس کے چہرے پر سرخی برقرار رہی' اس نے بیومونٹ کو جواب دینے کے بجائے جین کو مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے جلد یا بدیر تمہیں مجھ سے ملنے آنا ہی پڑے گا جین' تب ہی ہم اس سلسلے میں بات کریں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مسٹر بیومونٹ کو اس معاملے میں بولنے کا حق حاصل ہے۔"

"آپ کا خیال قطعی غلط ہے ڈاکٹر۔" بیومونٹ نے تیزی سے کہا۔ "میں اسی کاؤنٹی کا باشندہ ہوں۔ لیک ویو کی آبادی میں میرا بھی شمار ہوتا ہے گو کہ کسی نے کبھی اس حقیقت پر توجہ دینے کی زحمت نہیں کی۔ میں باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ جس میں تعلیمی ٹیکس بھی شامل ہے۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بورڈ آف ایجوکیشن بغیر کسی شہادت اور بغیر کسی ثبوت کے محض چند گمنام خطوط کی بنیاد پر دو انسانی زندگیوں کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے......"

"مورگن کے لڑکے نے شہادت دی تو ہے۔" ڈاکٹر بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "بورڈ کی نظر میں یہی ثبوت کافی تھا۔"

"مورگن کا لڑکا......" بیومونٹ نے حقارت اور غصے سے دہرایا۔ "اسے لڑکا کہنے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر' وہ انیس سال کا ہے' یعنی فوج میں بھرتی ہونے کے قابل ہوچکا ہے' کوئی بھی شخص جسے تم عمر کے لحاظ سے پورا جوان مرد ہونے کا سرٹیفکیٹ دے سکو اگر پیٹ' مورگن کے مقابلے پر آئے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ پیٹ' مورگن اس پر غالب آجائے گا۔ قانونی نکتہ نظر سے بھی وہ لڑکا نہیں ہے مردوں کی صنف کے لیے باعث شرم ہی سہی لیکن بہرحال وہ ایک مکمل جوان مرد ہے۔"

ڈاکٹر نے وہی تمام باتیں' وہی تمام مشورے بیان کرنے شروع کردیئے جو جین اس سے پہلے پال ڈاسن اور جج ڈیلے سے بھی سن چکی تھی۔ بورڈ آف ایجوکیشن کے عہدیداروں وغیرہ میں شاید اتنی ہم آہنگی آج سے پہلے کبھی کسی مسئلے پر نہیں پائی گئی تھی۔

"تم تو ہمارے فیملی ڈاکٹر ہو مسٹر اسٹیفن۔" جین روہانسی ہوکر بولی۔ "ہم سب کی رگ رگ سے محاورتاً نہیں عملاً واقف ہو۔ کیا تم نے بھی ان الزامات پر یقین کرلیا تھا؟"

"میں نے صرف ایک طبی ماہر کے طور پر اپنی رائے دی تھی۔" ڈاکٹر کے لہجے میں خفیف سی معذرت خود ہی جھلک آئی۔ "تم جوان ہو' چھ سال سے بیوگی کی زندگی بسر کررہی ہو۔ تنہائی پسند ہو' بعض حالات میں فطرت انسان کے ذہن پر ایسا بوجھ ڈالتی ہے اور اس کی نفسیات پر ایسے اثرات مرتب کرتی ہے کہ اس سے بعض حرکات کا سرزد ہوجانا ممکن ہوتا ہے۔ میں نے صرف امکان ظاہر کیا تھا۔"

"اور اب تم لوگ صرف امکانات' شبہات اور ایک بدمعاش کے لگائے ہوئے الزامات کی بنا پر مسز وارڈ مین کو مجبور کررہے ہو کہ وہ استعفا دے کر' ٹیری کو لے کر یہاں سے چلی جائیں تاکہ بورڈ آف ایجوکیشن کو کسی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے؟" بیومونٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پانچ اور مردوں کے نام بھی سامنے آئے ہیں جنہیں جج ڈیلے نے خفیہ رکھا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "لیکن اگر اشد ضرورت آن پڑی تو وہ انہیں شہادت کے لیے بلانے پر مجبور ہوگا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "کیا میں تمہیں اور ٹیری کو اپنی کار میں تمہارے گھر تک لے چلوں جین؟ میرا خیال ہے کہ تمہاری کار تو استعمال کے قابل نہیں ہوگی۔"

"اس زحمت کی ضرورت نہیں۔" بیومونٹ بدستور تلخ لہجے میں بولا۔ "کہیں جناب گمنام تمہیں بھی مسز وارڈ مین کے عاشقوں کی فہرست میں شامل کردیں اور لوگ کہیں کہ دیکھو بڑھاپے میں ڈاکٹر کو کیا سوجھی۔ میں خود مسز وارڈ مین کو چھوڑ آؤں گا' لفظوں کی جتنی بھی کیچڑ اچھالی جائے گی میں اسے نہ صرف اپنے وجود پر برداشت کرلوں گا بلکہ اس کا جواب بھی دوں گا۔ اور بورڈ کے رکن کی حیثیت سے بھی اگر تم میری جوابی کارروائی کی زد میں آگئے تو شکوہ نہ کرنا۔"

❀......☾......❀

ہفتے میں پانچ دن وہ آنکھ کھلتے ہی تیزی سے اٹھنے' تیار ہونے' اپنا اور ٹیری کا ناشتہ تیار کرنے اور پھر تیزی سے اسکول کی طرف روانہ ہونے کی عادی تھی لیکن آج یہ معمول ٹوٹ گیا تھا۔ بیدار ہونے کے بعد بھی وہ مضمحل انداز میں بستر پر ہی لیٹی رہی۔ کھڑکی سے موسم بہار کی دھوپ اندر آرہی تھی' جین اپنے آپ کو شکست خوردہ اور غلیظ غلیظ سا محسوس کررہی تھی' جیسے کسی نے اس کے وجود پر کیچڑ مل دی ہو۔

تنہائی کا احساس اس کے سوا تھا۔ آج تک وہ یہی سمجھتی آئی تھی کہ اس کے بہت سے دوست ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔ جج ڈیلے' پال ڈاسن اور ڈاکٹر اسٹیفن پر تو وہ آنکھیں بند کرکے بھروسا کرتی تھی مگر اب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کا تو کوئی دوست نہیں تھا جو اس کے سامنے کھڑا ہوکر کسی کا وار سہتا...... ہاں صرف ایک اجنبی اس کا دوست تھا۔ آدھے چہرے والا ایک اجنبی جو اس کی خاطر ہر وار سہنے کو سینہ سپر ہوگیا تھا۔ جو غصے میں جین کے جذبات کی ترجمانی کرچکا تھا۔ وہی کچھ کہہ چکا تھا جو جین کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی تھی۔ بیومونٹ ہی گزشتہ رات انہیں گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی باتوں سے جین کو بڑا حوصلہ ملا تھا لیکن اب اس میں مقابلہ کرنے کی خواہش دھیمی پڑ چکی تھی۔ فائدہ کیا تھا؟ بیومونٹ اس کی کیا مدد کرسکتا تھا؟ بادل نخواستہ وہ اٹھی' نہائی اور کپڑے بدل کر نیچے پہنچی' اسے ٹیری کے سامنے جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہورہی تھی۔ اس میں ٹیری کو یہ بتانے کا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی ہمت ایک ہی روز میں جواب دے چکی ہے۔

اسے کچن کا دروازہ بند نظر آیا ایسا صرف چھٹی کے روز ہوتا تھا۔ کیونکہ ٹیری اس روز بھی صبح جلد ہی اٹھتا تھا اور اپنا ناشتہ خود ہی تیار کرنے کے لیے کچن میں گھس جاتا تھا تاکہ ناشتے سے فارغ ہوکر بچوں کا ریڈیو پروگرام سن سکے۔ جین نے کچن کا دروازہ کھولا تو سامنے ہی اسے بیومونٹ کافی کا مگ تھامے کچن ٹیبل پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا کہ دروازہ کھولنے والے کو اس کے چہرے کا صرف اچھا رخ نظر آئے۔ ٹیری چولہے کے قریب کھڑا انڈے پھینٹ رہا تھا۔ جین کو یہ احساس تو ہوچکا تھا کہ بیومونٹ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا لیکن پھر بھی اسے سامنے پاکر اسے تقویت سی محسوس ہوئی۔ شاید

اس لیے کہ وہی ایک شخص تھا جسے اس کی ذات پر کوئی شک نہیں تھا اور جسے اجنبی ہوتے ہوئے بھی جین کی باتوں پر اعتبار تھا۔

جین نے مضمحل سی آواز میں اسے صبح بخیر کہا۔ بیومونٹ نے خوشدلی سے جواب دیا۔ ٹیری بولا۔

''آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی ممی کہ مسٹر بیومونٹ نے رات ہمارے گھر کے سامنے اپنی کار میں گزاری ہے۔ صبح میں نے دروازہ کھولا تو انہیں دیکھا۔ ظاہر ہے اس صورت میں انہیں ناشتے کے لیے مدعو کرنا میرا اخلاقی فرض بنتا تھا۔''

''بے شک۔'' جین نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے مسٹر بیومونٹ کو اس تکلیف کی ضرورت نہیں۔''

''میں تمہاری آنکھوں میں شکست کی پرچھائیاں دیکھ رہا ہوں۔'' بیومونٹ بولا۔ 'غالباً تم نے اس مسئلے پر بہت سوچا ہے۔ میں بھی سوچتا رہا ہوں۔ یہ درست ہے کہ اگر تم اس معاملے کی باقاعدہ تحقیقات اور سماعت میں حصہ لیتی ہو تو کارروائی بہت دیر میں جا کر مکمل ہوگی اور اس وقت تک تمہاری شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہوگا۔''

''اچھا ہوا تم بھی اس خیال سے متفق ہو گئے۔'' جین نے قدرے تلخی سے کہا۔

''میں اس خیال سے متفق ہوں لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہار دیا ہے۔'' بیومونٹ کے لہجے میں ہلکی سی تندی آ گئی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ باضابطہ کارروائیوں سے مظلوم کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمہاری بے گناہی کم سے کم وقت میں ثابت ہو۔ اس سے پہلے کہ افواہیں اور شکوک وشبہات کا زہر فضا میں پھیلے' جناب گمنام کی شخصیت بے نقاب ہو جانی چاہیے اور پیٹ مور گن سے اس کا تعلق بھی سامنے آ جانا چاہیے۔''

''پیٹ مور گن سے تعلق؟'' جین نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے وضاحت کرنے دو۔'' بیومونٹ بولا۔ ''تمہارے خلاف یہ ہنگامہ اس رپورٹ کے بعد شروع ہوا ہے جو تم نے پیٹ مور گن کے بارے میں تیار کی۔ وہ رپورٹ اب بے وقعتی کے ساتھ پال ڈاسن کے دفتر میں محفوظ ہوگی جہاں تک پیٹ مور گن کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انسان نما حیوان ہے اور اپنے ہی جیسے بدمعاشوں کے گروہ کی سربراہی کرتا ہے لیکن ہمیں انسانی نفسیات کا یہ پہلو مدنظر رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے لوگ لڑائی جھگڑا' گالی گلوچ وغیرہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس طرح چالاکی کے ساتھ کسی کے خلاف سازش تیار نہیں کر سکتے۔ میں بڑی سے بڑی شرط لگانے کو تیار ہوں کہ کسی نے اس کی مدد کی ہے۔ اسے راستہ دکھایا ہے' جناب گمنام نے اس گمنام کو سامنے لانے کا طریقہ یہی ہے کہ اسے کسی طرح کھل کر پیٹ مور گن کی مدد کرنے پر مجبور کر دیا جائے اور پیٹ مور گن ہی وہ ہستی ہے جو اسے بے نقاب کر سکتی ہے۔''

''لیکن یہ کام کس طرح ہوگا؟'' جین نے مایوسی سے پوچھا۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' بیومونٹ بولا۔ ''اس کے لیے ہمیں غیر روایتی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ اگر میں بھی تھوڑا سا ہنگامہ کھڑا کر دوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

جین نے تذبذب سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے ٹیری نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''آپ مسٹر بیومونٹ کو ہر ضروری کارروائی کرنے کی اجازت دے دیجیے ممی! اگر پاپا زندہ

ہوتے تو وہ بھی ہر ضروری قدم اٹھاتے۔ وہ خاموشی سے کبھی شکست تسلیم نہ کرتے۔''

جین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے' مسٹر بیومونٹ' آپ جو بہتر سمجھتے ہیں کیجیے۔''

بیومونٹ ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ وہ خوشدلی سے مسکرایا اور اٹھ کر مطمئن انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر رک کر وہ مڑتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اور ٹیری کو فی الحال اس گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا ہوگا۔ اگر تم کوئی ہنگامہ' شور شرابا یا موٹر سائیکلوں وغیرہ کی آواز سنو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے اوسان بحال رکھنے ہیں۔ میری بھی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں گوریلا جنگ میں شریک رہا ہوں اور ایسا نرم اور نازک مزاج نہیں ہوں جیسے کہ عموماً فلمی دنیا کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں بہت سخت جان ہوں اور پھر میرے پاس کھونے کے لیے ہے ہی کیا؟ سوائے دو نئے دوستوں کے۔'' وہ مسکرایا اور رخصت ہو گیا۔

❀……☾……❀

پیٹ مور گن کا کنبہ تین افراد پر مشتمل تھا جو سب کے سب ایک دوسرے سے ناخوش تھے۔ اس کا باپ فریڈ مور گن بڑھئی تھا اور ایک مقامی ٹھیکیدار کے پاس ملازم تھا۔ عرصہ ہوا کہ گھر بار سے اس کی حقیقی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ بس وہ گویا گھر کی سرپرستی کر کے ایک فرض نبھا رہا تھا۔ اس کی بیوی بدزبان تھی اور بیٹا سرکش ونافرمان۔

اس روز بھی وہ خاموشی سے میز پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ فریڈ مور گن کو نارنگی کا جوس کھٹا محسوس ہو رہا تھا۔ تلخی شاید جوس میں نہیں تھی بلکہ اس کے محسوسات میں تھی۔ اس کی بیوی نے کچھ رقم کا مطالبہ کیا تھا جو اس کے پاس نہیں تھی۔ اس کا بیٹا حسب معمول گزشتہ رات بھی دیر سے آیا تھا۔ غالباً ہمیشہ کی طرح کہیں کسی بدمعاشی میں مصروف رہا تھا۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی اور فریڈ مور گن بیٹے کی طرف دیکھ کر غرایا۔ ''دیکھو کون ہے؟''

پیٹ مور گن دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قد میں اپنے باپ جتنا ہی تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا' اس کا جسم کسرتی اور وزن ایک سو اسی پونڈ تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک وجیہہ شخص سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ قد میں پیٹ کے برابر' لیکن وزن میں غالباً اس سے کچھ کم تھا۔ وہ ترچھا کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کا لباس بیش قیمت تھا۔ پیٹ نے اندازہ لگایا کہ وہ غالباً چھٹیاں گزارنے کے لیے قصبے میں آنے والا کوئی آسودہ حال شہری ہے جسے اس کے باپ کی خدمات کی ضرورت آن پڑی تھی۔

''پیٹ مور گن تمہارا ہی نام ہے؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''ہاں۔'' پیٹ نے جواب دیا۔ ان کے درمیان مکالمہ بس یہیں تک محدود رہا۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد اجنبی کا بازو بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور ایک زوردار گھونسا پیٹ کی ناف پر پڑا تھا۔ جیسے ہی وہ دہرا ہونے لگا' دوسرا گھونسہ ہتھوڑے کی طرح اس کی تھوڑی پر اور ساتھ ہی کنپٹی پر کراٹے کا ایک ہاتھ۔ پیٹ مور گن آلوؤں کی بوری کی طرح فرش پر لڑھک گیا۔ اس کی ماں مسز مور گن چیختی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اجنبی اب بھی پیٹ کے سر پر کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا' وہ پرسکون لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں پیٹ مور گن کہ آج سے تم مجھے جہاں بھی نظر آؤ گے میں اسی طرح تمہاری درگت بناؤں گا۔ میں تمہیں پورے قصبے میں فٹ بال کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکاتا پھروں گا۔ اگر تم اپنی جان بچانا

چاہتے ہو تو پولیس اسٹیشن جاکر میرے خلاف باقاعدہ رپورٹ درج کراؤ۔ پھر میں وضاحت کروں گا کہ میں نے تمہارا یہ حشر کیوں کیا۔'' پھر وہ مسٹر اور مسز مورگن کی طرف مڑا جو کچن ٹیبل کے قریب دم بخود کھڑے تھے۔ ''گڈ مارننگ مسٹر اینڈ مسز مورگن۔'' اس نے تعظیماً جھکتے ہوئے کہا پھر وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور انہیں ششدر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔

پرنسپل کی سیکرٹری مس ڈورس ولسن وقت سے کچھ پہلے ہی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتی تھی تاکہ اپنے کاغذات وغیرہ درست کر سکے۔ اس روز وہ کام کے لیے تیار ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ ایک اجنبی آفس میں داخل ہوا۔ وہ بے حد وجیہہ تھا۔ کسی یونانی دیوتا کی طرح..... لیکن جب اس کا چہرہ پوری طرح سامنے آیا تو خون مس ولسن کی رگوں میں گویا منجمد ہو گیا۔

''مسٹر پال ڈاسن اندر ہیں؟'' اجنبی نے پوچھا۔ مس ولسن نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ اجنبی نے اندر جانے کی اجازت طلب نہیں کی گویا اسے پال ڈاسن سے ملنے کے لیے رسمیات کی پابندی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھا اندر چلا گیا۔

پال ڈاسن اپنی میز پر موجود تھا۔ اس نے بغیر اطلاع کے کسی ملاقاتی کی آمد پر حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا لیکن نووارد کو پہچان کر گویا اس کی حیرت دور ہو گئی۔ ''تم یقیناً بیومونٹ ہو۔'' پال نے کہا۔ ''ڈاکٹر اسٹیفن گرانٹ نے مجھے رات تم سے ملاقات کے بارے میں بتایا تھا۔ جین اب کیسی ہے؟''

''تمہیں تو اچھی طرح اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ کیسی ہو گی۔'' بیومونٹ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''میں حادثے کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔'' پال بولا۔

''میرے خیال میں تو جین کو پیش آنے والا کوئی واقعہ حادثاتی نہیں۔'' بیومونٹ نے کہا۔ ''خیر ان باتوں کو چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ جین کے خلاف گمنام کا جو خط موصول ہوا ہے کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس کا اختیار حاصل نہیں کہ میں بورڈ کے اور اجازت کے بغیر تمہیں وہ خط دکھاؤں۔'' پال نے جواب دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ پیٹ مورگن نے بورڈ کے سامنے اپنی کہانی کس طرح سنائی تھی؟''

''اسے جو کچھ کہنا تھا اس نے پہلے تنہائی میں جج ڈیلے سے کہا تھا۔ جج نے بورڈ کے سامنے اس سے سوال و جواب کیے تھے۔'' پال نے بتایا۔

''بہت خوب۔'' بیومونٹ نے کہا اور کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے وہ چند لمحے بعد بولا۔ ''ذرا ایک منٹ کے لیے تم یہاں آنا پسند کرو گے؟''

پال اس کے برابر جا کھڑا ہوا۔ نیچے گراؤنڈ میں سیکڑوں بچے جمع ہو رہے تھے اور اسمبلی کے لیے گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک طرف پیٹ مورگن پانچ چھ لڑکوں کے حلقے میں کھڑا تھا۔ وہ لڑکے عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ان کے سامنے کچھ ڈینگیں مار رہا تھا۔

''فرض کرو......'' بیومونٹ بولا۔ ''میں نیچے جا کر اس لڑکے کی پٹائی شروع کر دوں تو تمہارا ردعمل کیا ہو گا؟''

''میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ پیٹ مورگن ایسا تر نوالہ نہیں ہے۔''

''مخلصانہ مشورے کا شکریہ۔'' بیومونٹ نے کہا۔ ''لیکن مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔''

''میں پولیس کو اطلاع دے کر تمہیں گرفتار کراؤں

گا۔'' پال نے کہا۔

''کیا یہ تمہاری ذمے داری ہے؟'' بیومونٹ نے پوچھا۔

''ذمے داری تو بورڈ کی ہے لیکن میں اسی کی خاطر یہ فریضہ انجام دوں گا۔ لیکن میرے خیال میں جین والے معاملے کی وجہ سے پیٹ مورگن کی پوزیشن کچھ ایسی ہو چکی ہے کہ تمہیں اس کے بارے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بورڈ کے چیئرمین سے مشورہ کر لینا چاہیے۔'' پال ڈاسن نے کہا۔

''تمہاری یہ تجویز میری نظر میں خاصی معقول ہے۔'' بیومونٹ نے تسلیم کیا۔

''اب چند منٹ کے لیے تم یہیں کھڑے رہنا۔ یوں سمجھو کہ تمہیں کسی تھیٹر میں اسپیشل باکس ملا ہوا ہے۔ ابھی تمہارے سامنے خاصا دلچسپ تماشا پیش کیا جائے گا۔'' بیومونٹ نے کہا اور آفس سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پال نے اسے نیچے گراؤنڈ میں پیٹ مورگن کی طرف بڑھتے دیکھا بچے اس کی صورت دیکھ کر راستہ چھوڑتے جا رہے تھے۔ پیٹ کے سامنے پہنچ کر بیومونٹ بولا۔ ''میں نے تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ آئندہ تم مجھے نظر آئے تو تمہارا کیا حشر ہو گا؟''

''ہاں..... مجھے گرانے کے بعد بکواس کی تھی تم نے۔ غیر متوقع طور پر حملہ کیا تھا۔ اب میری باری ہے۔'' پیٹ غرایا۔

''اکیلے آؤ گے یا تمہارے یہ ساتھی بھی.....؟'' بیومونٹ نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔'' پیٹ نے دانت پیس کر کہا۔ اور بیومونٹ پر جھپٹا۔ بیومونٹ پہلے ڈانسر کی طرح حرکت کرتا نظر آیا۔ پیٹ اسے پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور چند سیکنڈ میں ہی اسے تابڑ توڑ کئی ہاتھ کھانے پڑے۔ وہ لڑکھڑایا اور پھر بیومونٹ نے اس کی کنپٹی پر پیشہ ور باکسر کی طرح گھونسا رسید کیا۔ وہ اوندھے منہ گرا اور پھر نہیں اٹھا۔ اس کے کم عمر دوست اب محض خوفزدہ بچے نظر آ رہے تھے۔

بیومونٹ نے منتظر نظروں سے ان کی طرف دیکھا لیکن ان میں سے کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ تب بیومونٹ مڑا اور اسکول کی عمارت سے باہر چلا گیا۔ اوپر کھڑکی میں کھڑے ہوئے پال ڈاسن کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنی میز پر آیا اور فون اپنی طرف کھسکا کر جج ڈیلے کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

جج ڈیلے نے مسکراتے ہوئے اپنے آفس میں بیومونٹ کا استقبال کیا۔ بیومونٹ رومال سے اپنے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ ''خوش آمدید بیومونٹ۔'' جج نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے زحمت سے بچا لیا ورنہ مجھے خود تم سے ملاقات کے لیے آنا پڑتا۔ سنا ہے اسکول میں تم نے چھوٹا سا ہنگامہ برپا کر ڈالا۔ پال نے مجھے فون کیا تھا۔ بیٹھ جاؤ نا۔''

''تم نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے یا نہیں؟'' بیومونٹ نے قدرے اشتیاق سے پوچھا۔

''نہیں.....نہیں۔'' جج نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''میں ذرا پرانے خیالات کا آدمی ہوں۔ میں پہلے معاملات کو اپنے طور پر سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے گزشتہ رات کے واقعے کا بھی علم ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر اسٹیفن سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''یہ ڈاکٹر اسٹیفن کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملاقات کرنے کا کافی شوقین معلوم ہوتا ہے۔'' بیومونٹ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' جج نے دوبارہ ہلکا

ساقہقہہ لگایا۔ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔

’’پیٹ مورگن کے متعلق تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے شامت کودعوت دے رہا ہے لیکن کسی شخص میں اس کوسبق دینے کی ہمت ہی نہیں تھی۔اپنی نجی حیثیت میں، میں تمہیں مبارک باد دیتاہوں۔ جب تک اس کے والدین اس سلسلے میں شور نہیں مچائیں گے تب تک میں کچھ نہیں کروں گااورامکان یہی ہے کہ وہ شور نہیں مچائیں گے۔‘‘

’’تم تو قانونی کارروائیوں کے بغیر کام چلانے کے ہی عادی معلوم ہوتے ہو جج ڈیلے۔‘‘ بیومونٹ نے خشک لہجے میں کہا۔

’’تو کیاتم لازماً گرفتار ہونا چاہتے ہو؟‘‘ جج نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’ارادہ تو یہی تھا۔‘‘ بیومونٹ نے جواب دیا۔’’دراصل میں چاہتاہوں کہ کوئی چیز ریکارڈ پر آئے۔اب تک تمہارے بورڈ کی میٹنگ جس میں مسز وارڈمین کوقصور وار ٹھہرایا گیا‘ کی کوئی کارروائی ریکارڈ پر نہیں ہے۔شہادتیں اگر کوئی ہیں تو وہ تمہاری میز کی دراز میں ہیں۔جین نے پیٹ مورگن کے متعلق جو رپورٹ تیار کی وہ بھی کہیں کونے کھدرے میں پڑی ہے۔ساراکام بس افواہوں اوراندازوں پر چل رہا ہے۔اس لیے میں چاہتاہوں کہ کوئی چیز ریکارڈ پرآجائے۔‘‘

ایک گہری سانس لے کراس نے سلسلہ کلام جوڑا۔’’اگر مجھے پیٹ مورگن کو پیٹنے کے الزام میں حراست میں لے لیا جاتا ہے تومیں اس کی وجوہات بیان کروں گا اور سب سے پہلے میں مطالبہ کروں گا کہ تمہیں نااہل قرار دے کرجج کے منصب سے ہٹایا جائے کیونکہ تم نے اس لڑکے پیٹ مورگن کی بہت ہی پردہ پوشی کی ہے۔‘‘

جج ڈیلے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی۔وہ بے انتہا سنجیدگی سے بولا۔’’اس معاملے کومنظرعام پرلاکرتم جین کی مدد نہیں کررہے‘ بیومونٹ! تم اس کے لیے مشکلات کھڑی کررہے ہو۔‘‘

’’میں یہ فلسفہ سن چکاہوں۔‘‘ بیومونٹ تلخی سے بولا۔’’یہ بتاؤ کہ تم نے گمنام خط لکھنے والے کاسراغ لگانے کی کوئی کوشش کی؟‘‘

’’نہیں‘ کیونکہ کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔کوئی سراغ موجود نہیں تھا۔‘‘ جج نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

’’بورڈ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے تم نے پیٹ مورگن سے تنہائی میں ملاقات کی تھی۔اس نے جو کچھ کہا کیاتم نے وہ بھی بورڈ کے سامنے بیان کیاتھا؟‘‘ بیومونٹ نے دوسرا سوال کیا۔

’’نہیں۔‘‘جج اب بھی پرسکون تھا۔’’اس نے بہت سے لوگوں کے نام لیے تھے اور اول فول بکتا رہاتھا۔میں نے اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا تھااور کارروائی صرف اسی کی ذات تک محدود رکھی تھی۔ باقاعدہ عدالتی کارروائی کے دوران بھی میں یہی کروں گا بشرطیکہ مجھ پر دعویداروں کی طرف سے دباؤ نہ ڈالا جائے۔‘‘

جج سے سوال جواب کرنا دیوار سے ٹکریں مارنے کے مترادف تھا۔اس کے پاس ہر عمل کا جواز‘ ہر سوال کا جواب موجود تھا جو کچھ بیومونٹ معلوم کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اسے کچھ اور کرنے کی ضرورت تھی۔

بیومونٹ جج کے دفتر سے نکل آیااور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی کنورٹیبل کادروازہ کھول رہاتھا جب کسی نے عقب سے اسے پکارا۔وہ مڑااور یہ دیکھ کراسے قدرے حیرت ہوئی کہ پیٹ مورگن کاباپ فریڈاس کی طرف چلاآرہاتھا تاہم اس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت نہیں تھی کہ وہ بیومونٹ سے انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔

’’مسٹر بیومونٹ میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔‘‘ فریڈ قریب آکر ہانپتے ہوئے بولا۔’’مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس لیے پیٹ پر برہم ہیں۔ بہرحال کوئی نہ کوئی معقول وجہ ہی ہوگی‘ میں اور میری بیوی خوداس لڑکے سے عاجز ہیں۔‘‘

’’مجھ سے کیا چاہتے ہو؟‘‘ بیومونٹ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

’’ہمیں نصیحت حاصل ہوگئی ہے مسٹر بیومونٹ۔‘‘ فریڈ بولا۔’’میرے بھائی کا ریاست کے شمالی حصے میں ایک فارم ہے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پیٹ کو فارم پر بھیج دیا جائے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو بھی مطلع کردیا جائے کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ایک بار پھراس کی تلاش میں گھر پہنچیں گے اوراس کی ماں میں اب کچھ دیکھنے اور سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔‘‘

’’کب بھیج رہے ہواسے؟‘‘ بیومونٹ نے پوچھا۔

’’میں تو اسے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ بھی آیا ہوں۔‘‘ فریڈ نے جواب دیا۔’’بیس منٹ بعد ٹرین آنے والی ہے۔‘‘

اس کے بعد بیومونٹ نے کچھ نہیں سنااور کار میں بیٹھ کرآندھی طوفان کی طرح اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔پلیٹ فارم پر پیٹ مورگن اسے سامان ڈھونے والی ایک ٹرالی پرساکت بیٹھا نظرآیا۔ایک پراناساسوٹ کیس اس کے پیروں کے پاس رکھاتھا۔ بیومونٹ کودیکھتے ہی وہ اٹھااوردوڑ پڑا۔ بیومونٹ اس کے پیچھے تھا۔پیٹ ویٹنگ روم میں گھس گیا۔ بیومونٹ نے اس کے پیچھے پیچھے اندرآکرادھرادھر دیکھا۔ویٹنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ پیٹ یقیناً باتھ روم میں گھسا تھا۔ بیومونٹ نے باتھ روم کادروازہ کھولا تو وہ اسے دیوار سے چپکا ہوانظرآیا۔اس کے ہونٹ کھنچے ہوئے تھے اور وہ کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکوس رہاتھا۔چھوٹے لیکن خطرناک نظرآنے والے پھل کاچاقواس کے ہاتھ میں تھا۔

’’تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھابیومونٹ۔‘‘ وہ غرایا۔’’یہاں تمہاری اچھل کود کے لیے جگہ نہیں ہے۔‘‘

وہ ہاتھ پیچھے لے جاتے ہوئے وار کرنے کے لیے بیومونٹ پر جھپٹا۔ بیومونٹ کی نظراس کے چاقو والے ہاتھ پر تھی۔اس بازو پر کراٹے کاوار کرتے ہوئے اس نے پیٹ کے پیٹ میں ٹھوکر رسید کی اور جیسے ہی وہ دہرا ہوابیومونٹ نے ایک سواسی پونڈ کے اس نوجوان کوایک خاص انداز سے فٹ بال کی طرح اٹھایااور سامنے کی دیوار پردے مارا۔وہ فرش پر گرااور بےحس وحرکت ہوگیا۔

بیومونٹ نے ٹونٹی سے پانی لے کراس کے چہرے پرچھڑکااور کہا۔’’ہوش میں آؤ بدمعاش مجھے تم سے دودو باتیں کرنی ہیں۔‘‘

پیٹ کسمسایااور بیومونٹ اس پر جھک کراسے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔’’تمہیں کس نے قصبے سے چلے جانے کامشورہ دیا تھا؟ کس نے دیاتھا؟ بتاتے ہو یاتمہیں اٹھا کر ایک بار پھر دیوار پر دے ماروں......؟‘‘

❀......☾......❀

ٹیری دوڑتاہوا کچن میں آیا جہاں جین برتن دھو رہی تھی۔

’’ممی!‘‘ وہ خوفزدہ آواز میں بولا’’بہت سے لوگ ہمارے گھر کی طرف آرہے ہیں۔آٹھ دس کاریں ہیں جو باری باری سڑک کے کنارے رک رہی ہیں۔‘‘

جین نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ٹیری سچ

کہہ رہا تھا۔ کاریں ایک قطار میں رک چکی تھیں اور لوگ ان سے اتر کر دروازے کے قریب جمع ہو رہے تھے۔ وہ تقریباً بیس عورتیں اور چھ سات مرد تھے۔ وہ سب کندھے سے کندھے جوڑے گیٹ کی طرف بڑھے۔ جین نے باہر آ کر ان کا استقبال کیا۔ سب سے آگے مسز سلیٹر تھیں انجمن خواتین کی صدر۔

''ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں مسز وارڈ مین۔'' مسز سلیٹر نے کہا۔ ان کے چہرے پر بلا کی کرختگی اور سرد مہری تھی۔ جین نے ٹیری کو اپنے سے چمٹا لیا۔ اس کے معدے میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ مسز سلیٹر اسے ایک طرف ہٹاتی ہوئی بلا اجازت کمرے میں گھس آئی۔ باقی لوگ بھی کسی نہ کسی طرح اندر آ ہی گئے۔ کشادہ کمرہ بھر گیا۔

''میں حتی الامکان اختصار سے کام لینے کی کوشش کروں گی۔'' مسز سلیٹر نے نخوت سے کہا۔ ''ہمیں نہیں معلوم کہ بورڈ آف ایجوکیشن تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور ہم اب اس کے فیصلے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے۔ ہم اسکول میں پڑھنے والے بچوں کے والدین ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ تم آج اور ابھی یہ قصبہ چھوڑ دو۔ اگر تم انکار کرو گی تو ہم طاقت بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مسز مورگن کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ بھی تمہاری بدکرداری کی شہادت دینے پر تیار ہیں اور اگر ان کا الزام درست ثابت ہو گیا تو تمہیں خود اپنے بچے کو بھی ساتھ رکھنے کا حق حاصل نہیں رہے گا۔''

جین کا دم گھٹ رہا تھا، اس کا دل چاہا کہ ٹیری کو سینے سے چمٹا کر بھاگ کھڑی ہو لیکن یہ تو کھلا اعتراف شکست تھا اور پھر دروازے پر بھی لوگ کھڑے تھے۔ ''اگر میں آپ لوگوں کے اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر بھی دوں۔'' جین نے اپنی آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تب بھی مجھے اور ٹیری کو اپنا پروگرام بنانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔''

''ہم ذرا بھی انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' مسز سلیٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''قصبے میں تمہارے آنجہانی شوہر بل کے چچا چچی موجود ہیں، وہ بعد میں تمہارا سامان پیک کروا کے تمہیں بھجوا دیں گے۔ تم جہاں بھی جاؤ انہیں اطلاع دے دینا۔''

جین کا گلا رندھ گیا اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ لوگوں کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا رہے تھے۔ اس نے ٹیری کو زیادہ سختی سے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ دفعتاً اسے اپنے کندھے پر کسی مضبوط ہاتھ کی گرفت کا احساس ہوا۔ اس نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ وہ پال ڈاسن تھا۔ اس کا چہرہ سپید نظر آ رہا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں غصے کی سرخی تھی۔

''میں جس قدر جلد ممکن ہو سکا یہاں پہنچا ہوں۔'' وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ ''مجھے پتہ چلا تھا کہ لوگ جمع ہو کر تمہارے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔'' پھر وہ پتھرائے ہوئے سے چہروں کے ہجوم کی طرف مڑا اور برہمی سے بولا۔ ''تم سب کس قسم کے انسان ہو؟ ابھی تو مسز وارڈ مین کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں ہوا ہے حتیٰ کہ ابھی تو اس کے خلاف الزامات کی کوئی باقاعدہ سماعت بھی نہیں ہوئی ہے کیا تم لوگ اسے اس معمولی حد تک بھی انصاف فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو؟''

سب خاموش رہے ان کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ انصاف کا کوئی تقاضا پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، عورتوں کی آنکھوں میں جین شکوک و شبہات کی پرچھائیاں دیکھ سکتی تھی۔ شاید میرا شوہر بھی اس عورت

کی زلفوں کا اسیر رہ چکا ہے، ان میں سے ہر ایک یقیناً یہی سوچ رہی تھی۔

''میرے خیال میں تو بہتر یہی ہو گا کہ پہلے تم خود اپنی پوزیشن پر غور کر لو مسٹر ڈاسن۔'' مسز سلیٹر نے کہا۔

''کر لیا ہے غور میں نے۔'' پال ڈاسن تقریباً چلا اٹھا۔ ''میں نے بورڈ کو اس کی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنے دیا...... کوئی احتجاج نہیں کیا...... اب مجھے اس پر افسوس ہو رہا ہے...... لیکن کم از کم اب میں کسی کو وحشیانہ طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت نہیں دوں گا خواہ اس کے لیے مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ اس لیے مجھے برطرفی کی دھمکی سے ڈرانے کی ضرورت نہیں۔ کسی نہ کسی کو تو بہرحال انصاف، شائستگی اور انسانیت کی حمایت میں آواز بلند کرنی ہی چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ اعزاز میرے حصے میں آ رہا ہے۔''

مسز سلیٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دہشت زدہ سی نظروں سے پال ڈاسن کے پیچھے کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ پال نے مڑ کر دیکھا۔ دراصل بیومونٹ کمرے میں آ چکا تھا۔

بیومونٹ نے یوں سب کی طرف دیکھا جیسے وہ سرکس کے مسخرے ہوں پھر وہ گویا انہیں ذرا بھی اہمیت دیے بغیر جین سے مخاطب ہوا۔ ''سب ٹھیک ہو گیا ہے جین! سازش کی دھند صاف ہو گئی ہے۔ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے۔'' پھر اس نے ٹیری کا کندھا تھپتھپایا۔ ''اب مزید پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ننھے دوست۔'' پھر وہ مجمع سے مخاطب ہوا۔ ''میں اس امید پر تم سے بات کر رہا ہوں کہ شاید تمہارے اندر انسانیت اور انصاف پسندی کی رمق باقی ہو۔ تم سب مسز وارڈ مین کو برسوں سے جانتے ہو اور میری اس سے واقفیت کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے لیکن میں اسے تم سب سے بہتر طور پر جان گیا ہوں۔ برسوں کی شناسائی کے بعد بھی تم اس کی فطرت و کردار کو نہیں سمجھ سکے اور چند گھنٹوں کے اندر اندر بغیر کسی ٹھوس وجہ کے تم سب نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اسے سن کر میرا خون کھول اٹھا تھا اور چونکہ کوئی اس کی مدد کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا اس لیے میں نے تھوڑی سی زحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تم لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی یہیں کا رہنے والا ہوں۔'' وہ تلخ انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے تفصیلات سنتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسز وارڈ مین بے قصور ہے۔ اس قسم کی سازش کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا تھا جو ذہنی طور پر غیر متوازن ہو اور انتقام کا مارا ہوا ہو۔ پیٹ مورگن اس معیار پر پورا اترتا تھا۔ مسز وارڈ مین نے اس کے بارے میں جو رپورٹ تیار کی تھی وہ اسے جیل بھی بھجوا سکتی تھی لیکن میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اپنے طور پر باقاعدہ اس قسم کی سازش تیار کرنا اس کی ذہنیت سے ذرا بالاتر تھا اس کی طرف سے ردعمل کے اظہار کے طریقے کچھ اور ہی ہو سکتے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے توڑنا، گالیاں دینا، چیخنا چلانا، اور راستے میں مسز وارڈ مین کو تنگ کرنا تو اس کا ردعمل ہو سکتا تھا لیکن اتنے نپے تلے انداز میں سازش تیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔'' وہ سانس لینے کے لیے ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ سب دم بخود کھڑے تھے۔ ''چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی پیٹ مورگن کو استعمال کر رہا ہے۔'' بیومونٹ نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''ظاہر ہے اس شخص کے ذہن میں یہ خیال پیٹ مورگن کے بارے میں رپورٹ پڑھنے کے بعد ہی آیا ہو گا۔ اگر میرا نظریہ درست تھا تو مجھے زیادہ اشخاص کے درمیان اپنے مطلوبہ شخص کو تلاش نہیں کرنا تھا۔ ظاہر ہے وہ

رپورٹ زیادہ لوگوں کی نظروں سے نہیں گزری تھی۔ پال ڈاسن اس کی سیکریٹری مس ولسن اور بورڈ آف ایجوکیشن کے ارکان اور چیئر مین۔ انہی تک وہ رپورٹ محدود رہی تھی کیونکہ اس پر ایکشن لیے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ انہی میں سے کوئی پیچ ذہن شخص مسز وارڈ مین کو رسوا کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ کوئی ایسا شخص تھا جسے صورت حال پر اختیار حاصل تھا جس نے وہ گمنام خطوط وصول کیے تھے جو پیٹ مورگن کے بارے میں رپورٹ کو غیر موثر بنانے کے عوض پیٹ سے سودے بازی کر سکتا تھا۔ اسے استعمال کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس شخص نے اس وقت بھی کوئی باضابطہ کارروائی نہیں کی جب میں نے اسکول میں سب کے سامنے پیٹ مورگن کی پٹائی کی۔ کیونکہ پیٹ مورگن ہی اسے بے نقاب کر سکتا تھا۔ بہر حال اب وہ شخص بے نقاب ہو گیا ہے۔ پیٹ مورگن اس وقت اسٹیٹ پولیس کو اپنا تفصیلی بیان لکھوا رہا ہے۔"

"تمہارا اشارہ جج ڈیلے کی طرف ہے؟" جین نے دہشت زدہ انداز میں سرگوشی سی کی۔

"منطقی طور پر یہی ممکن نظر آتا تھا۔" بیومونٹ بولا۔ "اس کی حیثیت سب سے زیادہ مستحکم تھی۔ صورت حال اس کے ہاتھ میں تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ دوست کا روپ دھارے اپنے کچھ مذموم مقاصد پورے کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ بالکل غلط تھا۔ وہ صحیح معنوں میں مسز وارڈ مین کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا اور اس کے لیے جس حد تک بھی ممکن تھا وہ مسز وارڈ مین کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنے طور پر معاملے کی تہ تک پہنچنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ جج ڈیلے بلاشبہ ایک اچھا اور مخلص انسان ہے۔"

"اس رائے کے اظہار کا بہت بہت شکریہ۔" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔" جج ڈیلے اندر آ رہا تھا۔

بیومونٹ نے بات جاری رکھی۔ "میں نے بہت دیر تک ایک بہت بڑے امکان کو نظر انداز کیے رکھا اور وہ یہ کہ شاید مسز وارڈ مین نے کسی کو ٹھکرایا ہو، کسی کو مسترد کیا ہو، کسی کی کوئی اہم پیش کش قبول کرنے سے انکار کیا ہو اور وہ صحت مندانہ ذہنیت کے ساتھ اس انکار کو قبول نہ کر سکا ہو۔ ایسے شخص کے لیے یہ ایک سنہرا موقع ہو سکتا تھا کہ جین کو کانٹوں میں گھسیٹا جائے۔ اس پر کیچڑ اچھالی جائے اور عین نقطہ عروج پر وہ شخص آگے آئے اور جین کے آگے دیوار بن کر کھڑا ہو جائے...... ہیرو بن جائے...... جین اس کی ایسی شکر گزار ہو کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ یہ منصوبہ ظاہر ہے ہمارے معزز اور قابل احترام پرنسپل صاحب...... جناب پال ڈاسن کا تھا جو اس وقت انصاف پسندی، شائستگی اور ایثار کا علم اٹھائے جین کو اپنی پناہ میں لیے کھڑے ہیں، خدا ہماری حالت پر رحم کرے...... ہمارے محافظ، ہمارے معلم، ہماری نئی نسل کے امین اپنی عام سی خواہش کی تکمیل کے لیے کیا کیا راستے اختیار کرنے لگے ہیں۔"

اس نے حقارت بھری نظروں سے پال ڈاسن کی طرف دیکھا جس کا چہرہ کچھ اور سپید پڑ چکا تھا۔ اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

"جب پال ڈاسن نے دیکھا کہ ایک اجنبی نتائج کی پروا کیے بغیر اس معاملے میں کود پڑا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ پیٹ مورگن سے حقیقت اگلوا لے تو اس نے پیٹ کے والدین کو فون کر کے مشورہ دیا کہ وہ فوراً اپنے بیٹے کو قصبے سے کہیں دور بھیج دیں۔" بیومونٹ نے بتایا۔ "بے چارا سادہ لوح فریڈ مورگن

چونکہ اس کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکا تھا اس لیے اپنے بیٹے کو اسٹیشن چھوڑ کر واپس آتے وقت اس نے راستے میں مجھے دیکھا تو بڑی سادگی سے یہ بات بھی بتا دی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ پیٹ کو ٹرین پر سوار ہونے سے پہلے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ وہ پیش منظر سے غائب ہو جاتا اور حقیقت کا سراغ لگنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔" بیومونٹ نے قہر آلود نظروں سے پال ڈاسن کی طرف دیکھا۔ "باہر دو پولیس والے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر تم اپنی ٹانگوں پر چل سکو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ ورنہ میں تمہیں اٹھا کر لے چلوں گا لیکن اس صورت میں تم ہوش و حواس میں نہیں رہو گے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی ایک عرصے تک تمہاری ہڈیاں فریاد کرتی رہیں گی۔"

اس کے بعد بیومونٹ باقی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور غصے سے تقریباً لرزتے ہوئے بولا۔ "اب براہ کرم آپ سب لوگ بھی تشریف لے جائیں اور یہ بتانے کی کوشش نہ کریں کہ آپ اپنے طرز عمل پر بہت شرمندہ ہیں۔ اب جین کو آپ کی کھوکھلی معذرتوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

سب لوگ گردنیں جھکائے باہر چلے گئے۔ جج ڈیلے کمرے میں ہی رہا۔ وہ مسکراتے ہوئے بیومونٹ سے مخاطب ہوا۔ "آخر تم پیٹ مورگن کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔"

"پیٹ جیسے لوگ صرف ایک ہی زبان سمجھتے ہیں اور اتفاق سے وہ مجھے آتی ہے۔" بیومونٹ بولا۔

جج بولا۔ "میں چند منٹ بعد اسکول جا کر اسپیشلی اسمبلی بلاتا ہوں اور مختصر سی تقریر کر کے صورت حال سے سب کو آگاہ کرتا ہوں۔" وہ خاص طور پر جین سے مخاطب ہوا۔ "تم جلدی سے تیار ہو کر اسکول پہنچ جاؤ۔"

جج کے جانے کے بعد بیومونٹ بولا۔ "اب میں بھی چلتا ہوں۔"

"ابھی مت جاؤ مسٹر بیومونٹ۔" جین کے لہجے نے جیسے بیومونٹ کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

"ابھی مت جائیں بیومونٹ۔" ٹیری بھی بول اٹھا۔

بیومونٹ بولا۔ "تم دونوں کو میرا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو یونہی گھر سے نکل کر ہاتھ پاؤں ہلانے کا بہانہ ڈھونڈا تھا۔ دو سال تک گھر کی چار دیواری میں مقید رہنے کے بعد آج زندگی کا کچھ لطف آیا ہے۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

"مجھے معلوم ہے......" جین سر جھکا کر بولی۔ "لیکن میں تمہیں اس لیے رکنے کو نہیں کہہ رہی کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔"

"اچھا...... ٹھیک...... ہے......" بیومونٹ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے ٹیری کی کمر پر تھپکی دی۔ "اگر مجھے رکنے کی دعوت دے ہی رہے ہو تو ایک کپ کافی تو پلاؤ ننھے باورچی۔"

"ابھی لایا۔" ٹیری نے مستعدی سے کہا اور کچن کی طرف دوڑ گیا۔

کاغذی رشتے

عامر زمان عامر

رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ یہ جملہ ہر دوسرے گھر میں بیٹی یا بیٹے کی شادی کے وقت عام بولا جاتا ہے مگر ہم میں سے کوئی اس کے معنی پر غور نہیں کرتا کہ ہم یہ کہتے ہوئے اللہ تعالٰی کو اپنے غلط فیصلوں کا ذمہ دار قرار دے رہے ہوتے ہیں۔ اللہ انسان کو پورے عقل و شعور کے ساتھ دنیا میں بھیجتا ہے تاکہ وہ جو بھی قدم اٹھائے سوچ سمجھ کر حالات کے تقاضوں کے مطابق اٹھائے اور پھر تقویٰ کرے اور اللہ کے فضل وکرم کا انتظار کرے۔

ان لمحوں کی روداد' جب انسان اپنے فیصلوں پر خود سے نگاہیں چرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''آبیاری اگر یکسوئی اور صدق دل سے کی جائے تو خزاں رسیدہ جھاڑی بھی ہری ہو سکتی ہے انسان تو پھر انسان ہے لگاتار گرنے سے پانی کا ننھا قطرہ مضبوط چٹان میں چھید کر سکتا ہے تو تمہاری امید کی کرن مایوسی کے گھپ اندھیرے کو اجالے میں کیوں نہیں بدل سکتی۔'' اس نے بھرپور دل جوئی سے اپنی سہیلی کے منتشر خیالات کو یکجا کر کے اسے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔

''دل کے بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔'' زنیرہ نے لہجے میں تنی بے یقینی کو شعر میں ڈھال کے پیش کیے۔

''بہت خوب محترمہ! شاعری میں بھی دلچسپی رکھنے لگی ہیں واہ......واہ کیا کہنے۔'' اس نے خوب صورت داد سے موضوع بدلنا چاہا۔

''آہ......'' شاعری جیسے انمول جذبے تو زندہ دل لوگوں کے اوڑھنے بچھونے ہوتے ہیں اور ہم تو کب کے زندوں کی فہرست سے خارج ہو گئے۔

''جو بھی ہے آج تم نے اپنے دل کی وضاحت شاعرانہ انداز میں کی ہے تو مجھے ایسے لگا کہ اگر تم خود میں تھوڑی ہمت پیدا کرو تو تمہارے اجڑے ہوئے چمن میں پھر سے بہار آ سکتی ہے۔ دیکھو زنیرہ! مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے مگر دل و دماغ پر یہی غمگین کیفیت طاری رکھو گی تو مستقل ذہنی مریض بن جاؤ گی۔ ناامیدی خود پر حاوی کرو گی خوشیوں سے بھرے زندگی کے تمام رنگ اور احساس جیسے جذبے تم بہت پیچھے چھوڑ جاؤ گی۔ اپنے جذبوں کی عمارت کو اپنے ہاتھوں سے مسمار مت کرو ورنہ گرے ہوئے مکان کی ایک ایک کر کے لوگ اینٹیں بھی اٹھا کے لے جاتے ہیں۔''

عنارہ نے انٹر کے بعد پڑھائی کو خیر آباد کہہ ڈالا اس کے والدین کی بہت خواہش تھی کہ وہ آگے پڑھے مگر اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو چکا تھا اس لیے اس کے والد نے ازدواجی بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کیا مگر وہ ابھی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھی اس نے اس فیصلے کے خلاف شدید احتجاج کیا۔

''امی! مانا کہ میں بڑی آپی کی طرح ذہین اور کتابی کیڑا نہیں ہوں نہ ہی میں پڑھائی میں لائق ہوں مگر دنیا میں بہت ساری لڑکیاں اپنے والدین کی خواہش کے مطابق تعلیم حاصل نہیں کر پاتی تو کیا تعلیم ادھوری چھوڑنے کی سزا میں ان سب کی شادی

کر دی جاتی ہے۔ ماں مجھے نہیں کرنی شادی اور ویسے بھی آپی مجھ سے بڑی ہیں ناں پہلے اس کی پھر بعد میں میری باری۔'' عمارہ نے بڑے لاڈ سے ماں کی ممتا بھری آغوش میں لیٹتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ بھئی کرے کوئی اور بھرے کوئی' یہ کیا بات ہوئی انصاف کے تقاضے تو یہ کہتے ہیں کہ سزا صرف اسے ملنی چاہیے جس نے جرم کیا ہو۔ آج تک کبھی سنا ہے کہ مجرم کے بھائی یا بڑی بہن کو سزا ملی ہو' بھئی ابو امی سمیت سب کی کتنی خواہش ہے کہ ہماری گڑیا پڑھے لکھے اسی گھر میں راج کرے مگر اب پڑھائی تجھی نہیں کرنی تو اس کی سزا بھی تو تجھے ملے گی ناں' آپی کو کوئی قربانی کا بکرا سمجھ رکھا ہے۔''

ماں کے جواب سے پہلے ہی زنیرہ نے اسے چھیڑنے کے لیے ٹانگ اڑائی جو اسے سخت ناگوار گزری اور جواب میں اس نے زنیرہ کو بھی کھری کھری سنا دیں کہ تم ہی رہو کتابی کیڑا' مجھے فضول مشورے مت دو' شادی کا اتنا شوق ہے تو خود کرا لو۔ عمارہ نے چڑھاتے ہوئے منہ بنا کے جواب دیا تو اس کی بڑی بہن کے ساتھ ماں بھی کھلکھلا کے ہنس دی۔

''عمارہ بیٹا! تمہاری آپی صحیح کہہ رہی ہیں یہ تمہارے ابو کا حتمی فیصلہ ہے اور بیٹیاں والدین کے گھر ہمیشہ تھوڑی بیٹھی رہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو بابل کا گھر چھوڑنا ہوتا ہے بس ہر والدین کی دعا ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی کے خدا نصیب اچھے کرے۔ تمہارے ابو نے رشتے کی بات بہت سوچ سمجھ کے کی ہے' تمہاری آپی ابھی پڑھ رہی ہے جب تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس کی باری آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو تمہارے بڑے بھیا اور تمہارے ابو

تمہارے سسرال کے گھر رشتے کی بات پکی کرنے اسی ہفتے سمندری جارہے ہیں۔ ہماری آرزو ہے کہ ہماری گڑیا کو اپنی سسرال میں اپنے والدین سے بڑھ کے سکھ نصیب ہوں' اچھا شریف خاندان ہے لڑکا پڑھا لکھا سلجھا ہوا ہے سب سے اہم بات اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ ہماری گڑیا راج کرے گی وہاں......" ماں نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اور ماں جی سنا ہے دلہا بھائی بڑے خوب صورت بھی ہیں۔" زنیرہ نے تنگ کرنے کے لیے پھر مداخلت کی۔

"ہونہہ...... جیسا بھی ہو مجھے کیا لینا دینا۔" عمارہ نے اٹھ کے معصومیت بھری ادا سے کندھے اچکائے بڑی بہن کو چڑھاتے ہوئے ٹھینگا دکھایا اور پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

❀......❀......❀

"مما' پاپا' آپی! بھئی کہاں ہو سب لوگ ذرا باہر تو آ کے دیکھو کون آیا ہے؟" علی کے چلانے پر سب سے پہلے اس کی ماں باورچی خانے سے باہر نکلی وہ اسے بازو میں تھام کے دائرے میں گھماتے ہوئے خوشی سے ناچنے لگا۔

"ارے علی کیا بات ہے...... ارے کیا کررہے ہو میرے ہاتھوں پر لگا آٹا تمہیں نظر نہیں آرہا ہے۔" سب شور سے باہر صحن میں جمع ہو کے اس کی خوشی کو حیرت سے تکنے لگے۔

"پاپا جی' مما جی بات ہی ایسی ہے کہ آپ سنو گے تو خوشی سے جھوم اٹھو گے' میرا رزلٹ آ گیا ہے آج سے ہمارے گھر میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ تین تین ڈاکٹر ہیں۔ آج چوہان ہاؤس میں ایک اور ڈاکٹر کا اضافہ ہو گیا۔" اس خوش خبری کے بعد خالد نے اپنے ہونہار بیٹے کو فخر سے گلے لگالیا۔

❀......❀......❀

خالد چوہان میانوالی کا مشہور ڈاکٹر تھا خالد کے علاوہ اس کا سب سے بڑا بیٹا بھی اسی پیشے سے وابستہ تھا وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی اس مقدس پیشے سے جوڑنا چاہتا تھا۔ علی کی کامیابی کی صورت میں اس کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔

سمندری سے واپس آنے کے دوسرے ہفتے ہی اس نے عمارہ کے ہونے والے سسرال کو میانوالی بلا کے شادی کی تاریخ پکی کردی۔ ایک ماہ کے اندر اپنے گھر کی ہو گئی لمحے اپنی رفتار سے سرکتے رہے' عمارہ نے پھول سی بیٹی کو جنم دے کے اپنے سسرال کے سونے آنگن کو خوشیوں سے بھر دیا۔ انتہائی مختصر عرصے میں ناصرف اس نے سب کے دل جیت لیے بلکہ وہ سب کی آنکھ کا تارا بن گئی' اسے والدین کی توقع اور اپنی سوچ سے بڑھ کے سکھ اور خوشیاں ملیں۔

❀......❀......❀

"ناں مجھے چھوڑو' تم بتاؤ بارش نہ آندھی آج تم کیسے ہمارا گھر کا راستہ بھول گئی؟" زنیرہ نے بجائے جواب کے پرشکوہ انداز میں الٹا سوال داغا۔ نگہت نہ صرف زنیرہ کی ماموں زاد بہن تھی بلکہ اس کی بچپن کی سب سے پکی سہیلی بھی تھی۔

"زوبی یار! ہم آپ کی طرح لائق پڑھاکو تو ہیں نہیں' ہمیں گھر کے کاموں سے فرصت ہی کب ملتی ہے۔ طعنہ تو ایسے مار رہی ہو جیسے تم نے ہمارے گھر آتے جاتے اپنے جوتے گھسا دیئے ہوں۔ ہمارے درمیان کون سا دریا پڑتا ہے جسے تم عبور نہیں کرسکتی تھیں آپ کو تو گھر سے کالج' کالج سے گھر کے علاوہ کون سا کوئی کام ہوتا ہے' اچھا چھوڑو کہیں جارہی ہو؟"

"کیوں آپ کو نہیں پتا کیا آپ لوگ شادی میں نہیں جارہے ہو؟" اس نے نگہت کے تجسس میں اور

اضافہ کیا۔

"کیا مطلب...... کون سی شادی' کس کی شادی؟" نگہت نے ہتھیلی کی ساری انگلیاں حیرانی سے گھما کے اشارے سے پوچھا۔

"لاہور پھوپو فاطمہ کی بیٹی نائلہ کی شادی پر جارہے ہیں' کیا آپ لوگوں نے نہیں جانا ہے؟"

"اوہ ہاں مگر اس کی شادی میں تو پورے پانچ دن پڑے ہیں' ابو کہہ رہے تھے ہم تو ہفتے کی رات کو نکلیں گے مگر آپ شاید ان کے خاص مہمان ہیں اس لیے ہفتہ پہلے آپ کو بلایا ہے۔"

"نہیں خاص عام والی کوئی بات نہیں دراصل ابو اور بڑے بھیا کو لاہور کوئی اپنا کام ہے وہ ہمیں سمندر عمارہ کے گھر چھوڑتے جائیں گے۔ کافی دنوں سے عمارہ اور اس کے شوہر فیصل ضد کررہے تھے ہم بھی عمارہ' فیصل کے ساتھ جمعے کی شام یا ہفتہ کی صبح ہی پہنچیں گے تب تک ابو اور بھیا بھی آجائیں گے۔"

"اچھا زوبی پھر تو لاہور ہی میں ملاقات ہوگی۔" اس نے چائے کا خالی کپ واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

❀......❀......❀

"پروین' فاطمہ آپا سے نائلہ کی شادی پر آپ کی کوئی بات ہوئی تھی یا ان سے آپ نے کوئی وعدہ کیا تھا؟"

"وعدہ کیا وعدہ......" اس نے جملہ دہرایا۔

"آج آپا کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے تم سے زنیرہ کے رشتے کی بات کی تھی اور تم نے بھی آمادگی ظاہر کی تھی۔"

"ہاں خالد آپ کو بتانا بھول گئی' آپا سے میری بات ہوئی تھی۔"

"پھر تم نے جواب میں کیا کہا آپا کو؟" خالد اٹھ کے پلنگ سے ٹیک لگا کے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

لڑائی

میاں بیوی کی لڑائی ہوگئی کئی دن بات چیت بند رہی' ایک دن میاں کو صبح سویرے کہیں جانا تھا اس نے رات کو سوتے ہوئے ایک پرچہ پر لکھا۔ "مجھے صبح سویرے پانچ بجے جگادینا۔" اور پرچہ بیوی کے سرھانے رکھ دیا۔

وہ صبح اٹھا تو دس بج رہے تھے اور اس کے سرھانے ایک پرچہ رکھا ہوا تھا اس پر لکھا تھا۔ "اٹھ جائیں پانچ بج چکے ہیں۔"

توقیر احمد...... کاموکی

"ہاں میں نے کہا کہ اس سے بڑھ کر ہمیں اور کیا چاہیے وہ تو بات آگے بڑھانے اور ہمارے گھر آنے کی بھی خواہاں تھی مگر میں نے کہا کہ میں آپ کے بھائی اور زنیرہ سے بات کروں گی اس سلسلے میں زنیرہ اور اعظم سے بھی بات کی ہے' سب بچوں کی یہی رائے ہے کہ زنیرہ اپنی بڑی پھوپو کی بہو بنے مگر زنیرہ کا اعتراض ہے۔"

"اعتراض...... اسے کیا اعتراض ہے اور کیوں؟" خالد کی بھویں سکڑ گئیں' ماتھے کے بل گہرے ہو گئے۔

"اسے آپ اعتراض کہو یا...... وہ فی الحال شادی کے حق میں نہیں ہے دراصل وہ مزید پڑھنا چاہتی ہے۔ بہر حال حتمی فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے ہمارے لیے تو خوشی کی بات ہے آپ کی بڑی بہن ہے اپنا خون ہے کسی چیز کی کمی نہیں اس گھر میں بلکہ میں تو کہتی ہوں ہماری بیٹی اس گھر میں عمارہ سے بھی زیادہ سکھی اور خوش رہے گی۔ سب سے بڑھ کے طارق

شریف اور برسر روزگار ہے باقی جو آپ بہتر سمجھیں۔"
تمام صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے گیند خالد کے کورٹ میں ڈال دی۔

"ہونہہ...... تو یہ بات ہے اچھا کچھ سوچتے ہیں۔" خالد نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

اس کے بعد تو خالد کی بڑی بہن کے فون کے لامتناہی سلسلے شروع ہو گئے ایک روز فاطمہ نے میانوالی آنے کی خواہش ظاہر کی تو خالد نے کہا۔

"آپا ایسی بھی کیا جلدی ہے گھر والی بات ہے۔ گھر کے بچے ہیں پروین نے سب سے بات بھی کی ہے تقریباً سبھی راضی بھی ہیں بس ذرا زنیرہ کی پڑھائی کا مسئلہ ہے اس لیے کچھ دن آپ صبر سے کام لیں اس کے امتحان بالکل قریب ہیں۔ اس کے بعد اسے راضی کرنا مشکل نہیں ہے اس کا یہ عذر بھی جائز اس سے پہلے میں آپ کو ہاں یا ناں میں کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتا ہوں۔" خالد کے دوٹوک الفاظ کے بعد فاطمہ نے اپنی خواہش پر فل اسٹاپ لگاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے خالد! زنیرہ کے امتحان کے فوراً بعد بات ہو گی، مجھے انتظار رہے گا۔"

امتحان کے بعد خالد نے زنیرہ سے بات کی تو زنیرہ نے ایک بار پھر انکار کرتے ہوئے کہا۔

"ابو جی! مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے' میرا مستقبل' میرے خواب جس کے لیے میں اتنی محنت کر کے آج یہاں تک پہنچی ہوں۔" مگر خالد نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"زوبی بیٹا! مجھے علم ہے کہ میری بیٹی بہت قابل ہے لائق ہے' مجھے تم پر فخر ہے۔ تمہارا گریجویشن اچھے نمبروں سے ہو گیا ہے۔ میں آپ کے جذبات سمجھ سکتا ہوں مگر جب سے تمہاری بڑی پھوپھو نے تمہیں نائلہ کی شادی میں دیکھا ہے وہ تب سے تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے بضد ہیں میں کافی عرصے سے اسے ٹالتا آ رہا ہوں مگر اب مزید اسے میں نہیں ٹال سکتا۔ بیٹا! ہر کام کا ایک مقررہ وقت ہوتا ہے میں تمہاری پھوپو کو زبان دے چکا ہوں اس لیے وہ اسی ہفتے منگنی کرنے آ رہے ہیں کیونکہ وقار بھی انگلینڈ سے تین ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے اس لیے وہ جلدی کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے تمہیں اپنے پاپا کے انتخاب اور فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے چلا گیا مگر زنیرہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کا باپ اس کی رائے جاننے کے لیے آیا تھا یا اپنا حکم صادر کرنے آیا تھا۔

اس رات وہ ایک پل بھی سکون سے نہ سو سکی' وہ جاتی آنکھوں سے اپنے ٹوٹتے ہوئے خوابوں کی کرچیاں روح تک محسوس کر رہی تھی۔ بظاہر تو انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے اس اعتبار سے اسے جینا اپنی مرضی سے' اپنی زندگی کے اچھے بُرے فیصلے کرنے کا پورا حق حاصل ہے مگر روزمرہ کے معاملات میں اسے محرومی اور غلامی کا احساس تب ہوتا ہے جب بعض معاملات میں اس سے اس کی رائے کو مسترد کر دیا جاتا ہے اور زبردستی اس پر اپنا فیصلہ مسلط کیا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے۔ اس کے باپ کے ایک فیصلے سے اس کے مستقبل کے سنہری سپنے لمحوں میں چکنا چور ہو گئے اس قدر محرومی اور مایوسی کا احساس اسے اندر سے مسلسل توڑ رہا تھا۔ آج تک اس کے باپ نے اس کی ہر بات مانی تھی' اس کی ہر خواہش کا احترام کیا تھا۔ وہ تین بھائیوں اور ایک چھوٹی بہن کے باوجود گھر بھر میں سب کی لاڈلی تھی۔ سب کو اس کی قابلیت' مستقبل کی منصوبہ بندی اور ذہین ہونے پر ناز تھا مگر کسی کے خواب اور ارمان رشتوں کے تقدس

پر قربان کر دینا سب سے بڑی خرابی ہے ہمارے معاشرے میں نازک رشتوں کی بات ہو یا گھریلو معاملات کا مسئلہ قربانی ہمیشہ عورت کے حصے آتی ہے۔ زنیرہ اپنے باپ کے فیصلے کو مقدر سمجھ کے اپنی تمام آرزوئیں مشرقی اطوار کی نذر کرتی ہوئی اپنے ہونٹوں پر صبر کی مہر لگائے بدن پر والدین کا عطا کردہ لباس فاخرہ زیب تن کر کے طارق کی دلہن بن کے بابل کے گھر سے رخصت ہو گئی۔

❀......❀......❀

خالد چوہان کے تین بیٹے' دو بیٹیاں کل متاع حیات تھی۔ ایک بیٹے اور عمارہ کا فرض وہ پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ زنیرہ کی رخصتی سے وہ اس اہم فریضے سے سرخرو ہو گیا' بیٹیاں جواب جوان ہو جائیں تو والدین کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی ان کے جیتے جی اپنے گھر کی ہو جائے۔ اسے اچھا سسرال ملے' اسے سکھ نصیب ہو اس لیے زنیرہ کے والدین نے جو فیصلہ کیا اس کے بہتر مستقبل اور بھلائی کے لیے کیا تھا۔ فاطمہ' خالد چوہان کی سب سے بڑی بہن تھی جو پنڈی بھٹیاں میں مقیم تھی۔ فاطمہ کے خاوند کا انتقال ہو چکا تھا اس کے دو بیٹے طارق' وقار اور ایک بیٹی کشمالہ تھی۔ طارق کا اپنے ہی شہر میں اپنا کاروبار تھا وقار گزشتہ تین سال سے انگلستان میں تھا۔ کشمالہ ابھی پڑھ رہی تھی' وقار ہر سال کے آخر میں دو ماہ کے لیے پاکستان آتا تھا مگر اس بار اپنے بھائی کی شادی کے لیے اس نے ایک ماہ کی چھٹی زیادہ لے لی تھی۔ طارق عام شکل وصورت' سانولے رنگ کا پکی عمر کا مرد تھا جبکہ زنیرہ گورے چٹے رنگ کی' تیکھے نقوش کی خوب صورت لڑکی تھی۔ طویل قامت' لانبے گھنے سیاہ بال اس کے خوب صورت حسن میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔

طارق اور اس کا کوئی جوڑ نہ تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں کی خوشی کی خاطر زہر کا گھونٹ آنکھیں بند کر کے پی لیا۔ آج زنیرہ کی اس گھر میں پہلی رات تھی گو کہ پہلے بھی اس کا اس گھر سے گہرا رشتہ تھا مگر نجانے کیوں آج ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تنہائی کے صحرا میں اتر گئی ہو۔ فاطمہ اسے مسہری پر بٹھا کے مہمان خواتین کے جھرمٹ میں گھل مل گئی ابھی وہ ٹھیک سے سنبھل کے بیٹھ بھی نہیں پائی تھی کہ اس کی اکلوتی نند کشمالہ اپنی سہیلیوں کی فوج کے ساتھ آ پہنچی۔

نو بیاہتا دلہن کو دیکھنے کا اشتیاق خواتین' کم عمر لڑکیوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کشمالہ کی سہیلیاں بھی منہ دکھائی کی ادائیگی کے لیے سب سے پہلے وارد ہو چکی تھیں۔ خواتین میں دلہن کو دیکھنے میں پہل کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے وہ پورے محلے میں بعد میں یہ خبر بڑے ناز سے بیان کرتی ہیں کہ فلاں کی بہو اور فلاں کی دلہن کو سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا' سب سے پہلے تحفہ میں نے دیا تھا۔ لڑکیوں کی محفل زعفراں جاری تھی مگر ان کے حصار میں زنیرہ کا دم گھٹنے کے قریب تھا۔

وہ دلہن کے بھاری بھرکم سرخ جوڑے میں بیٹھی تھک چکی تھی وہ کشمالہ اور اس کی سہیلیوں کو منع بھی نہیں کر سکتی۔ ابھی ان کی شرارتیں اور تبصرے جاری تھے' رشتہ دار اور محلے کی دیگر خواتین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمالہ تو اپنی نئی نویلی بھابی کے ساتھ چمٹ کے بیٹھ گئی' اس کا زنیرہ کو اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس سے پوچھے گئے سوالات میں سے بیشتر کے جوابات کشمالہ ہی دیتی رہی۔ یہ سلسلہ رات گئے جاری رہا' ہر گزرتے لمحے خواتین کی تعداد میں اضافہ

اور کمی ہوتی رہی مگر کشمالہ اس کے ساتھ چپکی رہی۔ وقار کے آنے سے خواتین سے اس کی خدا خدا کر کے جان چھوٹی' اس کے اندر آتے ہی خواہش اٹھ گئیں۔ اس نے کشمالہ پر بھی رعب جھاڑتے ہوئے اسے اٹھا دیا۔

''بھئی بھابی تھکی ہوئی ہیں اسے تھوڑی دیر آرام بھی کرنے دو' اب اس نے ہمیشہ اسی گھر میں تمہارے ساتھ رہنا ہے۔''

''یہ نمونہ کہاں سے ٹپک پڑا' بس اس کی کمی رہتی تھی۔'' وقار کے بڑھتے قدم دیکھ کے وہ ناگوریت سے بڑبڑائی۔

''بھابی کہیے کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں' آپ نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا۔ گھر والوں کی یاد آرہی ہے یا طبیعت......'' وہ سامنے کھڑا کن اکھیوں سے مسلسل گھور رہا تھا جواباً وہ خاموش رہی۔ وقار بھرپور کوشش سے اسے متوجہ کر رہا تھا اس سے پہلے کے اس کی خاموشی کا سکوت ٹوٹتا' ماں کی آواز پر وہ چونک گیا۔

''وقار تم یہاں کھڑے ہو اور میں تجھے پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ جاؤ مہمانوں کے پاس بیٹھو اور اپنے بھائی کو اندر بھیجو۔'' وقار سعادت مندی سے نظریں جھکائے ''جی امی'' کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

رات سبک رفتاری سے نقطہ انجام کی جانب رواں تھی۔ ٹھہرے ہوئے لمحے پانی کی طرح مدہم روشنی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو وہ پلنگ پر نیم دراز ہو گئی مگر اس کی نگاہیں بدستور دروازے پر مرکوز تھیں۔ پھولوں سے سجی خوب صورت مسہری پر اس کا مخملی بدن کسی آہٹ کا منتظر تھا۔ اس قدر تھکاوٹ کے باوجود اسے نیند بھی نہیں آرہی تھی' دھیمی سی آہٹ سے وہ چونک اٹھی اور سہم کے اٹھ بیٹھی۔ اپنے ماضی کے سنہرے خواب وہ اپنے والدین کی خوشی پر نچھاور کر چکی تھی۔ دل و دماغ سے اس گھر اور طارق کو اپنا مان کے نئی زندگی کے سفر پر پہلا قدم رکھ چکی تھی۔ آج اس کی سہاگ رات تھی یہی وہ خوش نصیب رات تھی جس کا خواب ہر لڑکی دورِ بلوغت کی سیڑھیاں چڑھ کے اپنے من میں سجاتی ہے۔ یہ لمحے اور پُر کیف تصورات کی مٹی سے خواہشات کے ویرانے میں چاہت کے آشیاں تعمیر کرتی ہیں' جس کے کشادہ آنگن میں نت نئے حسرتوں کے پھول کھلتے ہیں' کلیاں مہکتی ہیں جس کی معطر خوشبو سے آرزوئیں مچلتی ہیں۔ وہ جوانی کے تپتے تنور میں جل بھن کے ٹھنڈے ہو کے آہیں بھر رہی تھی' انتظار کی گھڑیاں تلوار بن کے آنکھوں میں لٹک رہی تھیں۔ انتظار کرتے اس کی آنکھیں بند ہونے لگی' رات کے نجانے کون سے لمحے آرزوؤں سے لپٹے بند کمرے کا دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا جیسے مدتوں اور بدنصیب گھر کا دروازہ کھلتا ہے۔ طارق کپڑے تبدیل کر کے جونہی پلٹا زنیرہ نے حیرت سے اپنی آنکھیں کھول دیں اسے دیکھتے ہی خود میں سمٹ کے اٹھ کے بیٹھ گئی۔

''میں دوستوں کے پاس بیٹھا تھا وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' پاس بیٹھتے ہی اس نے سلام کے بعد جیب میں ہاتھ ٹٹولنے لگا۔ ''یہ آپ کے لیے میری طرف سے پہلا تحفہ ہے۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ کوئی ردعمل نہ پا کر خود ہی شرمندہ ہو کے اس کی کلائی پکڑ کے اسے انگوٹھی پہنا دی۔ اس کے چھوتے ہی بجلی کی طرح کرنٹ کی ایک لہر زنیرہ کے رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ اس نے شرما کے فوراً آنکھیں موند

لیں' کچھ دیر کی یک طرفہ رسمی گفتگو کے بعد اس نے اٹھ کے دروازہ اور لائٹ بند کر دی اور اس کے ساتھ پلنگ پر لیٹ گیا وہ دلہن کے بھاری لباس سے آزاد ہو کے نارمل کپڑے پہن کے ہلکی پھلکی ہو کے سونا چاہتی تھی مگر وہ اپنی خواہش کا اظہار کیسے کرتی باہم لہجوں میں اجنبیت کی فضا تنی تھی۔ وہ چپ سادھے لیٹی رہی کہ شاید طارق کو خود ہی احساس ہو جائے۔ عورت فطرتاً شرم و حیا کے لبادے میں لپٹی رہتی ہے مگر بہ طور خاص کچھ ایسے مواقع ہوتے ہیں جن پر وہ شرماہٹ کی دیوار کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔

عمل اور ردعمل دونوں صورتوں میں اس کا لہجہ منتظر ہوتا ہے اس کے بعد ان دونوں کے درمیان رسمی غیر رسمی کوئی بات نہ ہوئی۔ زنیرہ کو مرد کا یہ پہلا روپ اور شادی کی پہلی رات کا منظر بڑا انوکھا لگا تھا۔ کچھ دیر گہرے سکون نے زنیرہ کو عجیب کیفیت سے دوچار کر دیا' اسے محسوس ہوا کہ طارق کا پورا جسم بُری طرح کانپ رہا ہے' اس نے تشویش سے کروٹ بدلی اس کا دل چاہا۔ وہ اس سے بات کرے مگر اندر کی بات حلق میں ہی اٹک کے رہ گئی۔ زنیرہ نے جونہی منہ اس کی طرف کیا اس نے بھی کروٹ بدلی اور اس کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گیا۔ ایک لمحے کے لیے زنیرہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے پکڑ کے گھپ اندھیری قبر میں اتار دیا ہو جہاں زندگی نہ ہی زندگی کا تصور جہاں خواہشات کا کوئی مول تھا نہ جذبات کی کوئی قدر و قیمت بس کال کوٹھڑی کے اندھیرے پنجرے میں اس کا وجود قید ہے۔ دل میں ہزار طرح کے وسوسے ناگ کی طرح اسے ڈس رہے تھے۔ آنکھوں میں اشکوں کے طوفان امڈ امڈ کے پلکوں کے ساحل سے ٹکرا کے سوچوں کے سمندر میں گر رہے تھے۔ ایک چھت تلے دو اجنبی بظاہر ازدواجی بندھن میں بندھ کے ارمانوں کی سیج پر خوب صورت مسہری کی آغوش میں لیٹے تھے مگر دونوں کے درمیان غیر محرم کی دیوار اب بھی حائل تھی۔ زبانیں گنگ ہو چکی تھیں بہت ساری ان کہی باتیں اور دل کے سندر جذبے اندر ہی دم توڑ رہے تھے۔ الفاظ کے کتنے موتی لبوں کے کنارے اظہار کے لیے پر تول رہے تھے۔ زنیرہ کو کیا خبر تھی جس شخص کے ساتھ اس کا رشتہ ازدواج جوڑا گیا تھا' وہ رسم و رواج کا پاسدار تھا مگر حقیقت میں ان تلوں میں تیل نہ تھا۔ وہ اس حقیقت سے ناآشنا تھی کہ جسے سایہ دار درخت سمجھ کے اس کی چھاؤں تلے پناہ ڈھونڈ رہی تھی' وہ اجڑی ہوئی وہ جھاڑی تھی جس پر نہ کبھی بہار آسکتی تھی نہ اس سے سبز پتوں یا پھل' پھول کی امید کی جاسکتی تھی۔ رات کے گزرتے ہوئے لمحے اس کے جیون بھر کی خوشیاں سمیٹ کے اپنے ساتھ لیے جارہے تھے' سوگواریت سے بھرے پل اس کی ناگواریت میں اضافہ کر رہے تھے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے زنیرہ نے جوانی کے خمار کو انگڑائی میں ڈھالا' نیم مردہ آرزوؤں کا پہلا سورج طلوع ہوا جس کی جھلملاتی سنہری کرنیں اس کے چہرے کی معدوم تمازت کو بحال نہ کر پائیں۔

''ارے زنیرہ باجی! آپ کا میک اپ تو بالکل اسی طرح ہے' تمہاری تو لالی بھی نہیں اتری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب مزید ٹپ ٹاپ (میک اپ) کی ضرورت نہیں ہے۔'' بیوٹی پارلر والی مائرہ نے اسے دیکھ کے بھونڈے انداز میں فقرہ کسا۔ زنیرہ نے مرجھائے ہوئے چہرے سے خود پر جبر کرتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ سجائی اور کہا۔

''ہاں بہن! میک اپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے' آپ چائے پانی پی کے جاسکتی ہو۔''

کچھ دن اپنے والدین کے گھر گزارنے کے بعد طارق کا چھوٹا بھائی وقار اور اس کی ماں اسے واپس اپنے گھر لے آئے۔ آج اسے اس گھر میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا' طارق گھر میں نہیں تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دہری اذیت میں گرفتار تھی شام کے سائے گہرے ہونے لگے مگر طارق ابھی تک نہ آیا اس کی کوئی خبر وہ رات بھی اس نے کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ آخر ایک رات اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی گیا' زنیرہ اپنے کمرے میں سوئی ہوئی تھی وہ چوروں کی طرح چپکے سے دروازہ کھول کے جونہی اندر داخل ہوا اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیران کن نظروں سے اسے دیکھنے لگی اس سے پہلے کہ اس کی برداشت دم توڑ جاتی وہ اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے بے بسی سے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور عورتوں کی طرح زار و قطار رونے لگا۔

''زنیرہ مجھے معاف کردو' میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں' میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے میری غلط کاریوں اور غلط کاموں کی سزا مل رہی ہے' میں تو مرد کہلانے کا بھی حق دار نہیں ہوں۔ میں تمہارا مجرم ہوں مجھے.....'' زنیرہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے' وہ بُت بنی بیٹھی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں' آنسو آنکھوں میں جم کے رہ گئے مگر اندر سے وہ مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں خون نہ ہو۔ تقدیر نے اس کے ساتھ کتنا بھیانک مذاق کیا تھا۔ وہ مسلسل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی' وہ اپنی عزت اور والدین کی خوشی کے لیے ہر دکھ سہہ گئی' طارق کی نامردی کا عقدہ پورے گھر پر کھل چکا تھا۔ اس کی ماں اپنی بہو کے سامنے ممتا کا دامن پھیلائے اپنے بیٹے کی غلطیوں پر معافی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

''دیکھو زنیرہ! ایک عورت ہونے کے ناتے میں تمہارا درد اور پریشانی سمجھ سکتی ہوں' سچ پوچھو تو تمہاری اصل مجرم تمہاری پھوپو ہے۔ میں نے اتنی ضد اور منت سماجت کر کے اپنے بھائی سے اس بے شرم کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا تھا' مجھے کیا خبر تھی۔ میں خود ارمانوں کا گلہ گھونٹ کے تمہیں ایسے شخص کے پلے باندھ رہی ہوں جو تمہیں ازدواجی خوشیاں دے سکتا ہے نہ وہ تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہے' بہرحال میرے لیے تم کوئی غیر نہیں ہو میرے چھوٹے بھائی کی بیٹی ہو ایسے میں تم اگر گھر چھوڑ کے جاتی ہو تو بھائی پر کیا گزرے گی۔ میں اسے کیا جواب دوں گی جہاں اتنے دن والدین کی خوشی اور اس گھر کی عزت کے لیے تم نے اتنی بڑی قربانی دی ہے وہاں کچھ دن اور صبر سے ہمارا ساتھ دینا ہوگا اس بے غیرت نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اپنے ساتھ ہم سب کی زندگی عذاب میں ڈال دی ہے' دیکھو رشتے کہہ دینے سے ختم نہیں ہو جاتے۔ اس راز کے کھل جانے سے جہاں معاشرے میں ہماری ناک کٹے گی' وہاں تم پر بھی انگلیاں اٹھیں گی۔ کوئی ہمیں بُرا کہے گا تو کوئی تم پر کیچڑ اچھالے گا۔ اس لیے ہم سب کی عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں جانتی ہوں جب سے ہمیں پتا چلا ہے ہم اس کے علاج کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں بیٹا! یقین کرو مجھے اس کے کرتوتوں کا علم ہوتا تو میں تجھے کبھی اس آگ میں نہ جھونکتی۔ دیکھو وہ پیدائشی بیمار نہیں تھا' بچپن کے غلط کاموں اور بری صحبت نے اسے ناکارہ بنا دیا ہے اب جس حکیم سے دوا لے رہیں اس نے یقین دلایا ہے کہ چند ماہ کی بات ہے اس کے علاج سے بہت جلد اس کی کھوئی

ہوئی قوت اور شباب لوٹ آئے گا۔ تم دل چھوٹا مت کرو بہت جلد تمہاری اجڑی ہوئی زندگی میں پھر سے بہار آئے گی۔''

زنیرہ کو سمجھاتے ہوئے اس کی ساس کچھ اضافے کے ساتھ حکیموں کے رٹے رٹائے جملے دہرا کے روز اس کے سامنے حوصلے کی دیوار کھڑی کرتی رہتیں۔ زنیرہ کو محرومیت کے احساس نے اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا اس کے نزدیک خوشیاں بالکل خواب بن کے رہ گئی تھیں۔ بالکل ایسے جیسے زندگی ایک جھٹکے سے ایک نئے موڑ پر آ کے رک گئی ہو جیسے کسی بند گلی میں زندگی کی شام ہو گئی ہو جہاں آگے بڑھنے کا راستہ نہ واپس لوٹنے کا حوصلہ ہو۔ اس کے اندر اٹھنے والے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ہر رات آہوں کی سیج پر سسکیوں میں ڈوب کے آنکھوں میں رات گزار کے اس امید کے ساتھ اٹھتی شاید آج سورج کی پہلی کرن اس کے لیے مسرتوں کی نوید بن کے پھوٹے گی۔ سوالوں کا کیا ہے' بعض آنکھوں میں لپے ہوئے خوابوں کی طرح ہوتے ہیں جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔ کچھ سوال ذہن میں قطرہ قطرہ ٹپک کے ذہن کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس کا ذہن بھی ایسے ہی بوجھ تلے دبا تھا اسے اس گھر اور ماحول کا حصہ بنے سال سے زائد عرصہ بیت چکا تھا اس کی پریشانی کی گتھیاں سلجھانا ناممکن تھیں' آنسوؤں اور آہوں کا حجم روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اس کے پاس بظاہر تو سب کچھ تھا' دولت' عیش و عشرت گھر میں سب تھا اگر کمی تھی تو وہ تھی سکون کی دولت جو کسی بھی قیمت پر دنیا کے کسی بازار سے بھی خریدی نہیں جا سکتی ہے۔

وہ ازدواجی خوشی سے محروم تھی جس کے بغیر عورت خود کو غیر محفوظ اور ادھوری سمجھتی ہے۔ عورت اپنے سہاگ اور گھر کی خوشی کے لیے سب کچھ سہہ جاتی ہے' ہر بات پر سمجھوتہ کر سکتی ہے مگر ازدواجی راحت چھن جانے پر نہیں کیونکہ یہ اس کا بنیادی شرعی حق ہے۔ عورت اس درخت کی مانند ہوتی ہے جس کی جڑ زمین کے اندر چھپی ہوتی ہے مگر سارے درخت کے وجود کو مٹی میں اپنے اندر سموئے ہوتی ہے۔ مرد اس درخت کا تنا اور بچے اس کا پھل پھول ہوتے ہیں مگر زنیرہ کی مثال خزاں رسیدہ سوکھی اجڑی ہوئی جھاڑی کی تھی جو تنے' پھل پھول سے محروم تھی۔ عورت کی ذات میں یہ خلا نہ برداشت ہوتا ہے اسی محرومی کا دیمک اسے اندر سے کھوکھلا کر رہا تھا۔

''ارے شبنم وہ عمارت تو کب کی زمین بوس ہو چکی اب لوگ اس کی اینٹیں اٹھا کے لے جائیں یا اس کا تمام خام ملبہ اٹھا کے لے جائیں' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ مجھے تو اس ہیجڑے نے کہیں کا نہیں چھوڑا' جی سکتی ہوں نہ مر سکتی ہوں۔ اگر والدین کو اصلیت سے آگاہ کرتی ہوں تو خون کے رشتے پر اعتبار اٹھ جانے کا ڈر ہے۔ یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے بھائی بہن کے رشتے میں کوئی دراڑ پڑے مگر اپنے ناتواں کندھوں پر اتنا بھاری بوجھ لاد کے زندگی کے کٹھن راستوں پر چلتے رہنا بھی محال ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کس کی ہتھیلی پر اپنی حسرتوں کا خون تلاش کروں۔ میرے ابو کی ہتھیلی پر جس نے ایک بہن سے اپنا وعدہ اور رشتہ نبھایا یا اپنی پھوپو کو کوسوں جس نے ایک نامرد کو میرے پلّو سے باندھ دیا یا طارق کو قصوروار ٹھہراؤں جس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے میری زندگی کو دکھوں کی دلدل میں دھکیل دیا۔''

''ہاں زنیرہ! تیری بات ٹھیک ہے' تو سچ کہتی ہے پتا تو تمہارے مرد کو بھی تھا اپنی کارستانیوں کا اس نے

واقعی جان بوجھ کے تمہاری ہنستی مسکراتی زندگی کو عذاب بنادیا ہے۔" زنیرہ کے جواب پر اس نے بھی ہاں میں ہاں ملادی۔

"مرد...... تم اسے مرد کہہ رہی ہو؟ مرد ایسے ہوتے ہیں، مرد تو ایسا لفظ ہے جس کے لبوں پر آجانے سے ایک سہاگن کے تن بدن سے سرشاری پھوٹتی ہے۔ لفظ مرد سے ایک تحفظ کا احساس ہوتا ہے اس سے آنکھوں کی جھیل کے گرد ان گنت امیدوں کے جگنو چمکنے لگتے ہیں۔ مرد تو عورت کی چار دیواری کے لیے ستون ہوتا ہے جس سے اس کی زندگی کی عمارت مکمل ہوتی ہے۔ مرد تو عورت کی حفاظت کرتا ہے، عورت کو خوش رکھتا ہے اس کے خواب، اس کے ارمان پورے کرتا ہے۔ اس کے جذبے اس کی قوت اور حوصلہ بڑھاتا ہے۔ وہ اسے دنیا کے مقابلے کے لیے اپنے برابر لا کھڑا کرتا ہے۔ مرد تو وہ لفظ ہے جس کے ادا ہونے سے ہر چیز اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے ہر شے خود مرد کی طرف سفر کرتی ہے۔ اصل مرد وہ نہیں ہوتا جو چاند تارے توڑنے کی بات کرے بلکہ مرد وہ ہے جو زمین آسمان عورت کے قدموں میں لا کے رکھ دیتا ہے پھر خود اس کا آسمان بن جاتا ہے ایسے بزدل کو انسان کہنا مردانگی کی توہین ہے۔" زنیرہ نے جی بھر کے اپنے دل کا ابال نکال لیا تھا۔

❁......❁......❁

دھیرے دھیرے جب اس کے سسرال کو پختہ یقین ہوگیا کہ اس نے اپنے ہونٹ ہمیشہ کے لیے سی لیے ہیں تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا معاملہ بن گیا۔ وہ اچانک گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے اس کے گرد زندگی کا دائرہ تنگ کرنے لگے کیونکہ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ طارق کسی طور بھی ٹھیک ہونے والا نہیں ہے اس کے بعد وہی پھوپھو جو سگے رشتوں کے حوالے دے کر صدقے واری جاتی تھیں وہ ہی روایتی ساس بہو کے انداز اپنانے لگی، بات بات پر گالی گلوچ، لڑائی جھگڑے معمول بن گیا۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ سونے، اوڑھنے، بچھونے سے لے کر کھانے پینے پہننے تک ہر بات میں کیڑے نکالنے شروع ہوگئے۔ ہر روز کی تکرار نے اس کی الجھنوں میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس کی اچھائیاں، صبر سب کچھ بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے زندگی اجیرن بنادی۔ اگلے سال کے آخر میں وقار ایک ماہ کی چھٹی منانے واپس آگیا جو اس کی جملہ پریشانی میں ایک اور اضافہ تھا۔ اس نے زنیرہ سے ایک کپ چائے لانے کی فرمائش کی اس وقت گھر میں ان کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا اس کی امی طارق کے ساتھ دوا لینے گئی تھیں، کشمالہ ٹیوشن پڑھنے گئی تھی، وہ چائے رکھ کے واپس پلٹنے لگی تو وقار نے اس کا راستہ روک لیا عجیب نظروں سے اس کا سرتاپا جائزہ لینے لگا۔

"وقار بھائی یہ کیا بدتمیزی ہے...... ہٹیے میرا راستہ چھوڑیئے۔ مجھے ایسا واہیات مذاق بالکل پسند نہیں۔"

"یہ مذاق نہیں ہے میں کتنے دنوں سے موقع کی تلاش میں تھا آج مشکل سے موقع ملا ہے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"شرم کرو، کیا بک رہے ہو۔ تمہاری بڑی بھابی ہوں، تمہاری ہمت کیسے ہوئی ایسے بات کرنے کی۔"

"بھابی...... کون بھابی...... کیسی بھابی...... مجھے تمہارے اور طارق کے درمیان ازدواجی خلیج کا اچھی طرح علم ہے۔ ارے بھول جاؤ اسے، ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ اپنی خوب صورت جوانی پر ترس کھاؤ، دیکھو تمہارے سامنے وقار کھڑا ہے، تمہیں دل و جان سے چاہتا ہے۔ میں تمہیں وہ تمام خوشیاں وہ سب راحتیں دوں گا جس کے لیے تم ترس گئی ہو۔ تمہارے کھلتے شباب میں چاہت کے سارے رنگ بھر دوں گا، گھبراؤ نہیں میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جس سے آج تک طارق نے تمہیں محروم رکھا ہے۔ فرق بس اتنا ہوگا بچے میرے ہوں گے نام طارق کا ہوگا۔ تم جب چاہو اس سے چھٹکارا حاصل کرکے مجھ سے شادی کرسکتی ہو۔"

"اپنی گندی زبان کو لگام دو ورنہ...... تم طارق سے بھی گر جاؤ گے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں میں جانور نہیں ہوں جسے تم بھیڑ بکری کی طرح جہاں مرضی باندھ کے اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہو۔"

وہ سنی ان سنی کرکے آگے بڑھا اس کی طرف دونوں بازو پھیلادیئے، اگلے لمحے زناٹے دار تھپڑ اس کے گال لال کرگیا۔ اس سے پہلے وہ سفاک بھیڑیئے کی طرح اسے بربریت کا نشانہ بناتا کشمالہ اس کے گالوں پر رسید ہونے والا تھپڑ دیکھ چکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کا راستہ چھوڑ کے جلدی سے باہر نکل گیا۔ کشمالہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، زنیرہ روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی مگر کشمالہ کو برآمدے سے اپنے کمرے تک کا فاصلہ طے کرنے میں جیسے صدیاں بیت گئیں۔

❁......❁......❁

"اتنا سب کچھ ہوگیا اور تم نے کسی کو کچھ بتایا تک نہیں چپ چاپ گنوار لڑکیوں کی طرح سہتی رہی، حیرت کی بات ہے۔" زنیرہ کے جہیز کا سامان واپس آیا تو نگہت کی ماں (زنیرہ کی ممانی) اسے اتنی بڑی بے وقوفی پر خاموش رہنے پر ڈانٹنے لگی۔ وقار کی گھٹیا حرکت پر اس نے نگہت کو بتایا اس لیے اسی دن نگہت کا باپ اسے ہمیشہ کے لیے لے آیا اس کے آنے کے کچھ روز بعد اس کا سامان بھی آگیا۔ آدھے سے زیادہ زیور اور سامان اس کے سسرال والوں نے اپنے پاس رکھ لیا جو واپس کیا وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ زنیرہ کا والد مجرموں کی طرح اپنی بیٹی سے نظریں چرائے گھر میں اس کی بربادی کے بکھرے ہوئے سامان کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی قیمتی دولت تھی جو اس نے اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے لیے تنکا تنکا اکٹھا کرکے اسے جہیز کی صورت میں دی تھی۔ اس کے گھر پر قیامت صغریٰ کا منظر تھا اس کی ماں کا رو رو کے برا حال ہوگیا سب گھر والے پچھتا رہے تھے، سب سے زیادہ افسوس اس کے باپ کو ہو رہا تھا اسی نے اپنی بیٹی کی خوشیاں، اس کے خواب اور مستقبل کو رشتے نبھانے کی بھینٹ چڑھایا تھا۔

❁......❁......❁

زنیرہ کے گھر آنے کے ایک ماہ بعد طارق نے خلع کے کاغذات بھجوادیئے۔ یہ وہ تین کاغذ تھے جن سے آسمان بھی لرز اٹھتا ہے، زمین کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے جو عورت کی آرزوؤں کے گلستان کو پل بھر میں ویرانی میں بدل دیتے ہیں۔ معاشرے میں ایک عورت کے لیے سب سے بڑی گالی طلاق ہوتی ہے اسی گالی کے خوف سے اس نے اپنی زندگی کے انمول لمحے دکھوں کے صحرا میں گزار دیئے تھے۔ وہ والدین کی عزت اور خوشی کے لیے سب کچھ صبر سے برداشت کرتی رہی اور ہر غم کو چہرے سے ٹال گئی۔ وہ کتنے دنوں سے رو بھی نہ پائی تھی اس کی آنکھیں پتھر کی ہوگئی تھیں مگر آج طارق نے اسے رسمی رشتے کی زنجیر سے بھی آزاد کیا تو اس کے ضبط کی دیوار بھی اس دراڑ سے ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہوگئی۔

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

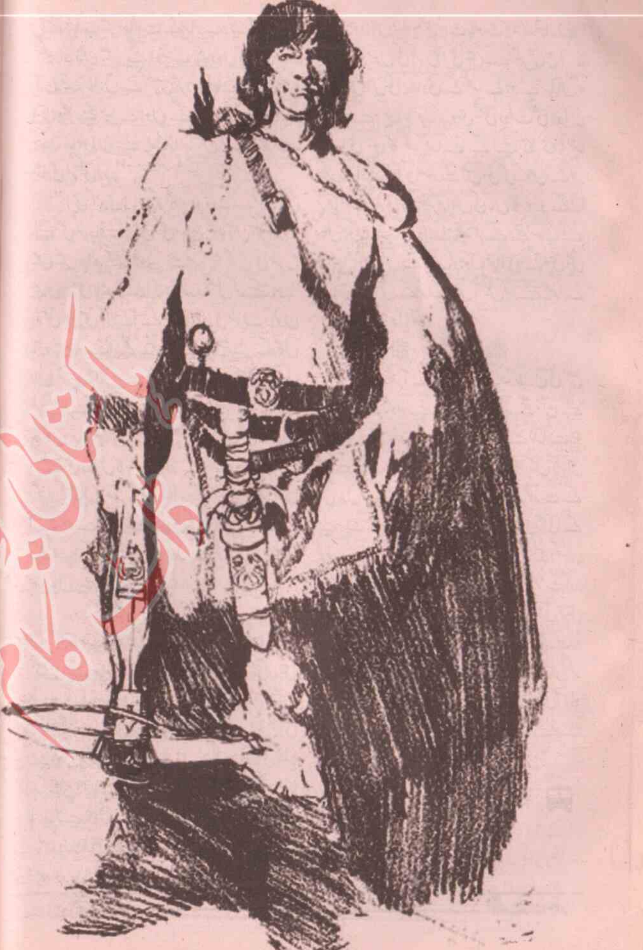

وہ میرے چہرے پر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں عجیب طرح کی سرمستی کے علاوہ گہرائی تھی۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی، اس کی بھوئیں ہلکی ہلکی کانپ رہی تھیں۔

''یہ سب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ کمپنی ابھی میں ختم نہیں کرنا چاہتا، ابھی بہت سارا کام پڑا ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ مجھ سے زیادہ خود کلامی کر رہا ہو۔

''کیا وہ کمپنی ختم ہونے جا رہی ہے؟'' میں نے پھر پوچھا تو وہ سختی سے بولا۔

''ابھی تک کوئی ایسا پیدا نہیں ہوسکا جو اسے ختم کر سکے اور نہ ہی میں پیدا ہونے دوں گا۔''

''تو پھر تم مجھے یہ کیوں بتا رہے ہو؟'' میں نے الجھتے ہوئے پوچھا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

''بات یہ ہے جمال کہ......''

''تم میرے نام سے واقف ہو؟'' میں نے تیزی سے پوچھا تو وہ ہنس کر بولا۔

''ہاں، جب تم برطانیہ پہنچے تھے، میں تب سے جانتا ہوں کہ تم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا۔ ''ہاں تو جمال، میں تمہیں آفر دے رہا ہوں، تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ، اس کمپنی کا کوئی دفتر نہیں، کہیں آنا جانا نہیں، کوئی عہدہ نہیں، سیلری تم جتنی چاہو، اتنی ملتی رہے گی۔''

''یہ پہیلی ہے، بجھارت ہے یا......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات ٹوک کر بولا۔

''وارننگ بھی سمجھ سکتے ہو۔''

''اور تمہیں پتہ ہوگا کہ میں وارننگ دینے والوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جانتا ہوں، لیکن ندی نالوں میں شکار پکڑنا بہت آسان ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی کامیابی کا مطلب یہ نہیں کہ تم سمندر میں شکار کرو اور تم کچھ حاصل کر لو، ایسا نہیں ہے، سمندر میں وہیل، شارک اور نہ جانے کیا کچھ ہوتا ہے، نجانے تم کب شکار ہو جاؤ، تمہیں خود بھی پتہ نہ چلے۔'' اس بار وہ غراتے ہوئے بولا تھا۔

''سوچنے پر یا خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے مسٹر......'' اتنا کہہ کر میں جان بوجھ کر رک گیا۔

''تم مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔

''اور میں تم سے پوچھنا چاہوں گا کہ تم مجھے آفر کیوں دے رہے ہو؟''

''ہاں، یہ کام کی بات کی ہے تم نے، انڈر ورلڈ میں تمہارا نام بہت سنا ہے خاص طور پر بھارت میں، یہ میں جانتا ہوں کہ تم کام کے بندے ہو، کام کرو۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''کیسا کام؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''وہی جو تم نے اپنے ملک میں کیا اور بھارت میں جسپال نے، ویسا ہی؟'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا یہ بندہ کون ہوسکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بولا۔

''میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں، اس لیے میں تم تک پہنچا ہوں، میں یہاں تمہارے سامنے ہوں، اس سے اندازہ لگا لو کہ میں تمہیں کتنی اہمیت دیتا ہوں۔ ورنہ تم جتنا وقت بھی لگے رہتے مجھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے، یہاں تک کہ تمہاری موت کہیں ہو جاتی۔''

''جاؤ، اب گم ہو جاؤ، میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔ میں تمہیں آفر کرتا ہوں کہ تم جب چاہے مجھے موت

کے گھاٹ اتار دو۔'' میں نے اسے چیلنج دے دیا

''تم بہت پچھتاؤ گے۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''ابھی تم بچو، تم نشانے پر ہو، جہاں کہو، وہیں گولی لگ جائے گی، بولو۔'' میں نے کہا تو اس نے گھوم کر دیکھا، ڈیورا بینچ پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے سو رہی ہو۔ تانی کے ہاتھ میں پسٹل تھا جو اس نے گود میں رکھ کر نال اُس شخص کی طرف کی ہوئی تھی، جو میرے پاس کھڑا تھا۔

''بہت اچھا، مجھے تمہارا انداز پسند آیا، لیکن تم نہیں جانتے کہ اس کے گرد ایک مزید گھیرا بھی ہے، جو میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تب تک تم ختم ہو چکے ہو گے، جب تک وہ گھیرا تنگ ہوگا، اس گھرے کا بندوبست بھی ہے میرے پاس، اب کیا خیال ہے؟''

''میری آفر اب بھی وہی ہے؟'' اس نے کسی خوف کے بغیر کہا، پھر چند لمحوں بعد بولا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ تم میری آفر قبول کرو گے۔''

''تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، تم میرے سامنے ہو اور میں تمہیں ابھی ختم کر سکتا ہوں لیکن جاؤ، میں نے تمہیں چھوڑا تا کہ پھر تلاش کر سکوں، اگر میں نے تمہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر تلاش کر لیا تو پھر تم میری مانو گے، نہ کر سکا تو میں تمہاری مانوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اسے فیصلہ کرنے میں چند لمحے لگ گئے۔ پھر اس نے ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کے ساتھ گلے ملا۔ یہی وقت تھا، جب میں نے اپنا کام

کر دیا۔ میں اس سے الگ ہوا اور اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چند لمحے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھتا رہا، پھر چل دیا۔ ڈیورا ویسے ہی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا تو تانی نے اسے ایک طرف جانے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کافی دور چلا گیا تو ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ڈیورا وہیں بینچ پر بیٹھی رہی۔

"مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ جو ڈیورا کو ساتھ لایا ہے، اس میں ضرور کوئی بات ہے۔" تانی نے تیز تیز چلتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

"یہ پسٹل کہاں سے آیا۔"

"ڈیورا کا تھا۔ سالی پوری تیاری سے آئی تھی، میں نے بھی صرف ایک سوئی سے کام لیا۔ اب سوئے گی شام تک گہری نیند۔" اس نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ میں سوچنے لگا، اگر اس وقت میرے ساتھ ایک عام سی لڑکی ہوتی، جس نے تربیت نہ لی ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ ہم دونوں وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کے بعد سے ہرپریت کور کے کمرے میں محفل لگی ہوئی تھی۔ بانیتا کور بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، نوتن کور اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، سندیپ کور ایک صوفے پر نیم دراز تھی اور جسپال ایک کرسی پر بیٹھا ان سب کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس وقت موضوع یہی تھا کہ وہ ہرپریت کے ساتھ کتنی محبت کرتا ہے۔

"میں اس کا کیا جواب دوں، یہ سوال ہی غلط ہے۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"لیکن سوال تو ہے نا؟ جو بھی جواب بنے وہ دو۔" بانیتا کور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھو، تم لوگوں نے جو کچھ کھانا پینا ہے، میں وہ لا دیتا ہوں، اس کے علاوہ جو چاہتی ہو، وہ کر دیتا ہوں لیکن......" اس نے کہنا چاہا تو بانیتا تیزی سے بولی۔

"دیکھا ہرپریت، میں نے کہا تھا نا کہ یہ اس سوال کا جواب نہیں دے گا، اب خود ہی دیکھ لو۔ میری بات بالکل ٹھیک ہے کہ یہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔"

"بانیتا، یہ مذاق نہیں بدگمانی ہوگی، ایسا مذاق......" اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہنا چاہا تو ہرپریت بولی۔

"جسی! اسے کہنے دو، میں تو جانتی ہوں نا تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔"

"اُوئے جا اُوئے، سارے سسپنس کا بیڑا غرق کر دیا ہے تو نے۔ میں تو......" بانیتا نے کہنا چاہا تو ہرپریت کور تیزی سے بولی۔

"دیکھتی نہیں ہو جسی کا چہرہ کیسا ہو گیا ہے۔"

"چل کوئی اور بات کرتے ہیں۔ یار اب تو موضوع ہی ختم ہو گئے ہیں، ایک ہفتہ ہو گیا، گھر میں پڑے باتیں ہی کر رہے ہیں۔" بانیتا نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"پھر چونک کر بولی۔

"وہ انوجیت آ گیا ہے کہ نہیں؟"

"بتایا تو ہے کہ وہ آ گیا ہے اور اپنے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔" ہرپریت کور نے بتایا۔

"وہ کب جاگے گا یار؟" وہ پھر اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

"آ جائے گا ابھی کچھ دیر میں۔" جسپال نے کہا۔

"چھا، اسے بتا دینا کہ وہ کسی سے نہ ملے، جب تک میں اس سے جی بھر کے باتیں نہ کر لوں۔" بانیتا کور نے کہا۔

"وہ میں نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپنی آمد کے بارے میں ابھی نہ بتائے، اس کا فون بند ہے اور ایک بات اور ہے۔" ہرپریت کور نے کہا پھر لمحہ بھر رُک کر بولی۔

"تیری شادی نہ کرا دوں انوجیت کے ساتھ؟"

اس پر سبھی ایک دم سے ہنس دیئے۔ تبھی بانیتا کور بولی۔

"بس پھر جہیز میں کیا آئے گا، یہ تم جانتی ہو۔"

وہ اسی بات پر ہنسنے لگے۔ ایسے میں انوجیت وہاں آ گیا۔ جسے دیکھ کر سبھی خوش ہو گئے۔ وہ سب کو یوں بے تکلفانہ انداز میں بیٹھے دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"یہاں تو اتنی اچھی محفل لگی ہوئی ہے، میں ایویں خواہ مخواہ سوتا رہا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ تبھی بانیتا کور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"انوجیت! یہ تو بس دل بہلانے کے بہانے ہیں، اس کے علاوہ اور کریں بھی کیا؟ تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے چندی گڑھ میں۔"

"بس حکومت بن گئی ہے اور ہم حکومت میں آ گئے ہیں۔ اب وزیر مشیر بننے کے لیے جوڑ توڑ عروج پر ہے۔ بڑی مشکل سے یہ دو دن نکال کر آیا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جو ہم پوچھنا چاہ رہے ہیں، اس کے بارے میں بتاؤ، کیا سوچا جا رہا ہے؟" بانیتا کور نے پوچھا۔

"اگر تم لوگ یہ سوچو کہ کوئی پکڑ دھکڑ ہوگی، اسے بھول جاؤ، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ اگر وہ تم لوگوں کو ماریں گے تو انہیں بھی مرنا ہوگا۔" انوجیت نے کہا تو بانیتا کور نے پوچھا۔

"کیا تمہاری بات ہوئی ہے؟"

"ہاں، میرے سمیت چند لوگوں کی۔ رتن دیپ سنگھ بھی تھے اس میٹنگ میں اور "را" والے بھی۔ کون کس خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتا تھا، میں نہیں جانتا لیکن بات ہو گئی اور انہیں باور کرا دیا کہ اب نہیں۔" انوجیت کے اپنے لہجے میں کافی حد تک گرمی آ گئی تھی۔

"کیا تم اس ملاقات کی روداد بتا سکتے ہو؟" اچانک جسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔

"کیوں نہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر کہتا ہی چلا گیا، "انہوں نے تم لوگوں پر الزام لگایا، میں الزام کی بات کر رہا ہوں، تصدیق نہیں کہ اشوک مہرہ، ہرنیت سنگھ وغیرہ کو تم لوگوں نے مارا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پرانی باتیں کرتے رہے۔ وہ شک اس لیے کر رہے تھے کہ امرتسر میں تم لوگوں کی ہوٹل کے باہر تصویریں بن گئی تھیں۔ یہی جو ہماری کمزوری تھی، اسے ہی رتن دیپ سنگھ نے پکڑ لیا۔ آخر اتنا اہتمام کیوں، مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اس کا ذمے دار کون؟ پھر جالندھر فارم پر قاتلانہ حملہ کیوں؟ کیا ہم غدار ہیں؟ بہرحال چار پانچ گھنٹوں کی طویل بحث کے بعد اس کا نتیجہ نکل آیا۔"

"کیسا نتیجہ؟" بانیتا کور نے پوچھا۔

"یہی کہ تم لوگوں نے بھی زیادتی کی۔ دوسری جانب سے بھی ہوئی۔ طے یہ پایا کہ اب اگر کوئی معاملہ ہو، ثابت ہو تو پھر کوئی کارروائی کی جائے۔ ورنہ اب ہم خاموش نہیں رہیں گے۔ کمیشن بن جائیں گے، پھر جو سزاوار ہوگا، اسے سزا دی جائے گی۔"

"مطلب معاملہ رفع دفع ہو گیا۔" جسپال نے سکون سے کہا تو انوجیت بولا۔

"ہاں ہو تو گیا ہے فی الحال، لیکن تمہیں پتہ ہے یہ خفیہ ایجنسیوں والے موقعہ کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ اب انہیں ثبوت اکٹھا کرنا ہوں گے۔ اگر آئندہ آنے والے دنوں میں کوئی ثبوت نہ ملے تو کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی گرفتاری ہوگی۔"

"اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" بانیتا کور نے پوچھا۔

"کچھ عرصہ انتظار، تم لوگ جہاں رہو۔ بلدیو سنگھ اور اس کے ساتھی اپنے اپنے گھروں میں جائیں۔ کچھ عرصہ تک ان سے رابطہ بالکل نہ رہے اور وہ بھی محتاط رہیں کہ ان کی نگرانی بہرحال ہوگی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ سر ہلاتی ہوئی بولی تو چند لمحوں کے لیے ان میں خاموشی چھا گئی۔ تبھی انوجیت سنگھ نے کہا۔

"ممبر بننے کے بعد پہلی دفعہ اوگی پنڈ آیا ہوں۔ میرے یہ دو دن تو لوگوں سے ملنے ملانے میں گزر جائیں گے۔ اب شاید میں آپ کو وقت نہ دے سکوں۔"

"ہاں ایسا ہوتا ہے۔ میں بہرحال آج ہی واپس امرتسر چلی جاؤں گی۔ میرے ساتھ نوتن کور بھی جائے گی۔" بانیتا کور نے سوچتے ہوئے کہا، یوں وہ مختلف باتوں میں کھو گئے کہ آئندہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔

☆......☆......☆

لندن کی وہ صبح کہر میں لپٹی ہوئی تھی۔ کب بارش آ جائے، اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ موسمی حالات بتانے والوں نے بارش کی پیش گوئی کی تھی۔ اس وقت میں اور جنید لندن کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہ لندن کا پرانا علاقہ تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ "گاڈ فادر" اسی علاقے میں موجود ہے، کس گھر میں ہے اس کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ اصل میں جب ہم لاہور سے نکلنے لگے تھے تو یہ طے تھا کہ لندن اور اس کے علاقے میرے لیے اجنبی ہیں۔ زمینی حقائق کے بارے میں جاننا، آدھی جنگ جیت جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اروند سنگھ نے چلتے وقت مجھے ایک ایسی ڈیوائس دی تھی، جو دیکھنے میں ذرا سی تھی لیکن اسے کسی بھی انسانی جسم سے چپکا دیا جائے تو یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے تل ہو۔ ایک بار چپک جانے کے بعد وہ اترتی نہیں تھی۔ اس نے میرے، جنید اور مہوش کے وہ لگا دی۔ تاکہ ہم کہیں آگے پیچھے بھی ہو جائیں تو گم نہیں ہو سکتے تھے۔ حالات کے بارے میں تو پتہ نہیں تھا اور ہم ایسے دشمن کی تلاش میں نکلے تھے، جس کے بارے میں پتہ ہی نہیں تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک فون نمبر تھا۔ میں نے وہ ڈیوائس ڈیورا کے ساتھ بھی لگا دی۔ اس کے بارے میں پتہ چلتا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ میرے لیے بہت بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ مجھے تو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک خود میرے سامنے آ جائے گا، یہ اس کی خود اعتمادی کی انتہا تھی۔ میں چاہتا تو اسی وقت بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن ابھی میں پوری طرح کنفرم نہیں تھا، دوسرا میں اس کے کام کے طریقے کار کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور تیسرا وہ جو خود میرے پاس آفر لے کر آ گیا تھا، اس نے ایسا کیوں کیا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کا دشمن ہوں، اسے نقصان پہنچا چکا ہوں۔ اس کے پیچھے ضرور کچھ تھا، یہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر یہ سب میرے ذہن میں تھا، اس وقت میرا رویہ ایسا کیوں ہو گیا تھا، مجھے خود نہیں احساس تھا۔ دوسرا مجھے یہ زعم تھا کہ لندن میں جو میرے رابطے تھے، جنہوں نے مجھے اپنی نگاہوں میں رکھا ہوا تھا اور وہ میری سیکورٹی پر مامور ہو چکے تھے، انہی میں سے کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اسی بنا پر میں نے اُسے چیلنج دے دیا کہ اسے چوبیس گھنٹوں میں تلاش کر لوں گا۔ میری سیکورٹی پر مامور لوگ ناکام ہو گئے تھے۔ ڈیورا وہیں بینچ پر بیٹھی رہی تھی۔ اسے اسپتال والے اٹھا کر لے گے تھے۔ جبکہ وہ انہیں جُل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ جہاں جہاں پھرتا رہا، اس کے بارے میں اروند سنگھ مجھے بتاتا رہا۔ صبح ہوتے ہی

میں نے سب کو الرٹ کر دیا اور اس وقت ہم اس کے گھر کے قریب ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس طرح وہ کل سے اپنی جگہ تبدیل کر رہا ہے، وہ ضرور یہاں سے بھی نکلے گا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ لندن میں بھی طبقاتی درجہ بندی ہے۔ گورے ایک ہی علاقے میں رہنا پسند کرتے تھے اور ان میں خال ہی کوئی غیر گورا ہوتا اور ایسے علاقے جہاں ایشیائی لوگ رہتے تھے وہاں خال ہی کوئی گورا دکھائی دیتا تھا۔ اس ریستوران میں بھی مجھے کوئی ایشیائی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہم وہاں بیٹھے بالکل الگ سے دکھائی دے رہے تھے، یہ خطرناک بات تھی۔ ہمیں وہاں ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھنا پڑا۔ تبھی مجھے پتہ چلا کہ وہاں اس گھر سے ایک ایسا شخص پیدل نکلا ہے۔ جیسا میں نے انہیں بتایا ہوا تھا۔ میں بھی ریستوران سے باہر آ گیا۔ میرے ساتھ جنید تھا۔ میں نے دیکھا وہ سڑک کے پار گلی کے سرے پر تھا۔ وہ دائیں طرف سڑک کے فٹ پاتھ پر مڑ گیا اور چلنے لگا۔ میں نے سڑک پار کی اور کچھ ہی دیر بعد اس کے قریب جا پہنچا۔ جیسے ہی میں اس کے برابر چڑھا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کہا۔

"میں جانتا تھا کہ تُو مجھے تلاش کر لے گا۔ میں نے چھپنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے، اس لیے سکون سے رہو۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے چلتے ہوئے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کہاں باتیں کریں۔" میں نے پوچھا۔

"جہاں تم چاہو۔" اس نے جواب دیا

"میرے ساتھ چلو گے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔" اس نے جواب دیا۔

"آؤ پھر۔" میں نے کہا اور رُک گیا۔ وہ بھی رُک گیا۔ میں نے جنید کو اشارہ کیا۔ وہ کار قریب لے آیا، جس کی ڈرائیونگ وہاں کا ایک مقامی پاکستانی نژاد کر رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا اور ہم چل پڑے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لیے، وہاں کے لوگوں نے ایک جگہ بنائی ہوئی تھی۔ جہاں کسی کو بھی لے جا کر پوچھ تاچھ کی جا سکتی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں آ گئے جہاں بہت کم آبادی تھی۔ اس دوران ہم یوں خاموش رہے، جیسے ہمارے درمیان اعصابی جنگ چل رہی ہو۔

وہ کسی لارڈ کا قلعہ نما گھر تھا۔ جہاں سوائے چند لوگوں کے کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ لارڈ نجانے کب کا اسے بیچ گیا تھا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں، کسی کو معلوم نہیں تھا۔ پورچ میں کار سے اترے تو داخلی دروازے کے پاس چند لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گاڈ فادر داخلی دروازے کے باہر ہی کھڑا ہو گیا اور بازو اٹھا دیئے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اپنی تلاشی دینا چاہتا تھا۔ وہ لوگ آگے بڑھے، انہوں نے تلاشی لی اور وہ راہداری میں چلا گیا۔ میں اس کی اس قدر تابعداری کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک جنٹلمین کی طرح اپنا کوٹ اتار دیا۔ پھر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ وہاں پر موجود ایک شخص نے سامنے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا۔ جو کافی بڑی تھیں۔ ہم اس پر چڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک ایسے کمرے میں آ گئے، جس کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا اور اسی کھڑکی سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"جمال! میں تم پر یہ رعب جھاڑنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ میں کتنا طاقت ور ہوں اور میں کیا

کچھ کر سکتا ہوں، یا میں اب بھی چاہوں تو میں یہاں سے بڑے آرام کے ساتھ جا سکتا ہوں۔ مجھے یہ باتیں نہیں کرنی۔ میں کچھ اور ہی باتیں کرنا چاہ رہا ہوں۔"

"کہو، میں سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"جمال، میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ میں تمہیں خود یہاں تک لے کر آیا ہوں۔ الیکس کا بیٹا ٹام ابھی اتنی حیثیت نہیں رکھتا کہ وہ کوئی عالمی گیم کر سکے۔ اس کے پیچھے کچھ دوسرے لوگ ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا تجربہ کامیاب ہو۔ وہ اب بھی کام کر رہے ہیں لیکن بہت جلد ختم ہو جائیں گے، میں تمہیں اس سے پہلے کا جانتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں یہ تعلق داری کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے، یہ سوال تو بنتا ہے۔" میں بولا۔

"اس سوال کا جواب دینے سے پہلے، میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میری سرگزشت میں تمہیں جواب مل گیا تو ٹھیک، ورنہ میں صاف انداز میں بتا دوں گا۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"میں سن رہا ہوں۔" میں نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا تو وہ بھی ایزی ہو گیا۔

☆......☆......☆

میرا نام راشد محمود ہے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں۔ میرے ایک تایا تھے، جن کی اولاد میں تین بیٹیاں اور بیٹا صرف ایک ہی تھا۔ دو بڑی تھیں اور زینت مجھ سے چھوٹی تھی۔ میرا تایا صفدر علی، مجھ سے بڑا پیار کرتا تھا۔ چونکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے، اس لیے بچپن ہی سے میں اپنی کزن کو بہنیں ہی تصور کرتا تھا۔ بڑے ہی خوشگوار ماحول میں زندگی گزر رہی تھی۔ لاڈ پیار اور محبت میں ہماری پرورش ہوتی رہی اور ہم سکون سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے بڑھتے گئے۔

ہوا یوں کہ میں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میں اپنی مستی میں رہنے والا بندہ تھا۔ میں اپنی موج میں رہتا تھا۔ نہ مجھے طلبہ سیاست سے کوئی غرض تھی اور نہ مذہبی طلبہ تنظیموں سے کوئی مطلب۔ ہاسٹل میں میرے چند ہی کلاس فیلو دوست تھے۔ میں انہی کے ساتھ خوش تھا۔ میری پڑھائی کا ایک برس گزر گیا۔ اس دوران صرف ایک واقعہ ہوا۔ وہ یہ تھا کہ طلبہ تنظیم جو خود کو مذہبی تنظیم بھی گردانتی تھی، ان کے چند لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے چندہ مانگا۔ مجھے یہ تو پوری طرح پتہ تھا کہ یہ چندے کے نام پر بھتہ ہے جو ہر طالب علم سے وصول کیا جاتا ہے۔ میں نے چند روپے انہیں دے دیئے۔ انہوں نے اپنے پاس لسٹ دیکھی، میں جو چندہ دے رہا تھا، وہ اس لسٹ میں درج رقم سے کہیں کم تھا۔ مجھے اتنے ہی دینے کے لیے کہا گیا تو میں نے دینے سے یکسر انکار کر دیا۔ انہوں نے فوری طور پر کچھ نہیں کہا۔ واپس چلے گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے برس میری کزن زینت نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تو اس کی تمام تر ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی۔ جسے میں نے بخوشی قبول کر لیا۔

یونیورسٹی میں وہ میرے دوسرے برس کے آخری ایام تھے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ہاسٹل میں اسی طلبہ تنظیم کا جو پہلے والا عہدیدار تھا، وہ بدل گیا، اس کی جگہ نیا آ گیا تھا۔ وہی نیا عہدیدار اپنے ساتھ چند لڑکوں کو لے کر آ گیا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے مجھے کہا کہ تمہاری طرف اتنا چندہ بنتا ہے جو تم نے دو برس میں ادا نہیں کیا۔ اس لیے دو دنوں میں وہ چندہ دے دو، ورنہ تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے، تمہارے تصور میں بھی نہیں ہو گا۔ میں نے

ان کی دھمکی نظر انداز کر دی۔ اگلے دن میں نے زینت کو ساتھ لیا اور گھر چلا گیا۔

ایک ہفتے بعد ہم واپس لوٹنے لگے تو زینت نے مجھ سے مشورہ مانگا۔

"بھائی! میں نے تمہیں بتایا نہیں لیکن میری کلاس کا ایک لڑکا ہے، وہ مجھ سے محبت کے دعوے کر کے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"مجھے بتایا نہیں تم نے، خاموش کیوں رہی ہو؟" میں نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا

"میں خاموش اس لیے ہوں کہ جب میں اسے کوئی ریسپانس نہیں دے رہی تو چند دن بھونک کر خاموش ہو جائے گا۔ دوسرا وہ طلبہ تنظیم کا ایک بڑا عہدیدار بھی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔" اس نے روہانسا ہو کر کہا۔

"اب کیوں بتا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں جاؤں ہی نہ یونیورسٹی، ابا کو بتاؤں ہی نہ، یا سب کچھ بتا دوں، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے کہا۔

"تم چلو یونیورسٹی، وہاں چلتے ہیں، دیکھا جائے گا۔ میں ٹھیک کر لوں گا سب۔" میں نے اسے تسلی دلاسہ دیا اور اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گیا۔ میں نے زینت کو ہاسٹل چھوڑا اور خود اس طلبہ تنظیم کے بڑے کے پاس چلا گیا۔ اسے ساری صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے سکون سے سنی۔ پھر مجھے اطمینان رکھنے کا کہہ کر واپس بھیج دیا۔

تین دن گزرے تھے۔ اس صبح زینت نے مجھے فون کر کے بتایا کہ اسے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے وہ لا دوں۔ میں مارکیٹ گیا اور چیزیں لے آیا۔ اس کی کلاس ساڑھے دس بجے کے قریب تھی۔ اس نے دس بجے ہاسٹل سے نکلنا تھا۔ میں کچھ منٹ پہلے اس کے ہاسٹل جا پہنچا۔ وہ ہاسٹل سے نکلی تو میں اس کے لیے لائی ہوئی چیزیں اسے دے دیں۔ اس وقت جب میں وہ چیزیں اسے دے رہا تھا، اسی وقت اسی طلبہ تنظیم کے کافی سارے غنڈے وہاں آ دھمکے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے پوچھا نہیں اور نہ کوئی بات کی، یک لخت مجھے مارنا شروع کر دیا۔ ساتھ میں ان کے منہ سے یہی نکل رہا تھا کہ فحاشی پھیلا رہے ہو، ڈیٹ لگا رہے ہو، بتاتے ہیں تم دونوں کو ہیر رانجھا، انہوں نے زینت کو کچھ نہیں کہا۔ اُن کے ساتھ آئی لڑکیاں اُسے ہاسٹل میں دھکیل کر لے گئیں۔ انہوں نے مجھے یہاں تک مارا کہ میں ادھ موا ہو گیا۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد جو انہوں نے مجھ پر جو ظلم کیا، اس نے میری زندگی بدل دی۔

انہوں نے ایک گدھے کا بندوبست پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اس پر بٹھا دیا۔ ایک تار میں پرانے جوتے پروئے ہوئے تھے، وہ میرے گلے میں ڈال دیئے۔ موٹر سائیکل کے سائلینسر سے کالک لی اور میرے منہ پر لگا دی۔ ہاسٹل کی طرف والی جو سڑک تھی اس پر مجھے ڈال دیا گیا۔ وہ لمحہ ایسا تھا کہ میں موت کی دعا مانگ رہا تھا، لیکن مجھے موت نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس وقت مر گیا تھا۔ مجھے نہیں ہوش تھا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ بس یہ آواز میرے دماغ کو پھاڑ دیتی تھی کہ جب لوگ پوچھتے کہ اسے گدھے پر کیوں بٹھایا ہے، تو جواب دیتے کہ یہ لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ وہ میرے مرنے کا مقام تھا۔ میرا وجود تو زندہ تھا، لیکن میں مر گیا۔

نہر کے پل پر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں گدھے پر ہی تھا کہ گدھا مجھے نشیب کی جانب لے گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کیسے گرا ہوں،

میں بے ہوش تھا، یہ کچھ دیر کی بے ہوشی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو میں وہیں نہر کنارے پڑا تھا اور لوگ میرے ارد گرد تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی فیصلہ تھا کہ مجھے مر جانا چاہیے۔ اس زندگی سے اب موت بہتر ہے۔ میں اٹھا اور سڑک کی جانب بڑھا۔ وہاں ٹریفک رواں تھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور ایک کار کے سامنے آ گیا۔ مجھے بریک لگنے کی تیز آوازیں سنائی دی تھیں۔ اس کے بعد درد کی ایک تیز لہر میرے اندر سرائیت کر گئی اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں نے خود کو کنفرم کر دیا کہ میں مر گیا ہوں۔

میری آنکھ کھلی تو میں بیڈ پر تھا۔ کافی ساری پٹیاں مجھے باندھی گئی تھیں۔ میں حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بولنا چاہا تو نہیں بول سکا۔ بلاشبہ میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہوگی کہ ایک دم سے کئی لوگ آ گئے، ان میں ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ مجھے دیکھنے لگے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں وہاں صرف ایک دن اور ایک رات رہا ہوں۔ اگلے ہی دن میں ایک بنگلے پر تھا، جہاں میرا باقاعدہ علاج ہونے لگا۔

وہ سکندر خان کا بنگلہ تھا۔ میں جس کار سے ٹکرایا تھا، وہ نجانے کون تھا۔ لیکن اس وقت یہی سکندر خان مجھے وہاں سے اٹھا کر اسپتال لایا تھا۔

”کیوں لائے مجھے؟ مرنے دیا ہوتا؟“ میرا اس سے پہلا سوال ہی یہی تھا۔

”جس وقت تم گدھے پر تھے تو میں تمہارے قریب سے اپنی کار پر گزرا تھا۔ میں اس وقت کار بیک نہیں کر سکا، میں اوپر سے گھوم کر آیا تو تم سڑک پر خون میں لت پت تھے۔ مجھے اسی وقت تمہاری بے گناہی کا یقین ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں نے تمہیں اٹھایا اور تمہاری دیکھ بھال کی۔“ اس نے بڑے عام سے انداز میں کہا۔

”آپ کی ہمدردی نے ......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولا۔

”بالکل نہیں، مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ایک ذرہ برابر بھی نہیں۔ میرا وجدان تھا کہ تمہارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، وہی ہوا، میں نے جب تصدیق کی تو مجھے ساری بات پتہ چل گئی۔ وہ چند لوگ کون تھے، جو ہاسٹل گئے، کہاں اور کیسے پلان بنا، ہاسٹل میں کس لڑکی نے انہیں بتایا کہ تم وہاں آنے والے ہو۔ سب مجھے پتہ چل گیا۔“ اس نے پھر اسی عام سے لہجے میں جواب دیا

”مگر مجھے زندگی نہیں چاہیے، میں مرنا چاہتا ہوں۔ اب میں اس ظالم معاشرے میں نہیں جی سکتا۔“ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہاں سے جانے کے بعد مر جانا۔ لیکن اگر تم ان لوگوں سے انتقام لے کر مرنا چاہو تو میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”کیا تمہاری بھی ان سے دشمنی ہے؟“ میں نے پوچھا تو ایک دم سے ہنس دیا، پھر بولا۔

”میری نہ کسی سے دشمنی ہے اور نہ دوستی، میرے اپنے کام ہیں، میرے ساتھ کام کرو، اس کے عوض میں تمہیں ہر طرح کی مدد دوں گا۔ یہ ظاہر ہے کہ میرے سارے دھندے کالے ہیں، ایک بھی ایسا نہیں جو میں معاشرے کے سامنے فخر سے بتا سکوں۔ صاف کہوں تو بات یہ ہے کہ تم میرے اچھے ساتھی بن سکتے ہو، میرے ساتھ جڑ جاؤ گے تو طاقت، دولت اور حکومت تیرے قدموں کے نیچے ہوگی اور اگر بنا انتقام لیے مرنا چاہتے ہو تو کل ہی چلے جانا، میں نہیں روکوں گا، یہاں سے جاتے ہی مر جانا، یا کہیں ڈوب مرنا۔“ سکندر خان نے حتمی انداز میں کہا

اور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

میرے ذہن میں صرف انتقام تھا۔ میری اب تک کی تحقیق ہے کہ غنڈہ ہو یا جرائم پیشہ، وہ حوصلے والا تو ہوتا ہے لیکن دل والا نہیں، اندر سے وہ بزدل ہوتا ہے۔ وہ کمزور پر ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن طاقت ور کے آگے فوراً جھک جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جیسے ایک شرابی اپنے دوستوں میں یا کمزور لوگوں میں بڑی بڑکیں مارے گا، غل غپاڑہ کرے گا لیکن پولیس کے ادنی سے اہلکار کو دیکھ کر خاموش ہو جائے گا۔

مجھے بالکل تندرست ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ میں نے سکندر خان کو بتا دیا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے مر چکا ہوں۔ اب جو کہو میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔

”ہاں، تمہیں تھوڑا سا کچھ کرنا ہوگا، اس کے بعد تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا، سوائے اس کے کہ تم طاقت ور بنو۔“

”وہ جو تھوڑا سا ہے، وہ کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”جن لوگوں نے تمہیں ہاسٹل کے باہر مارا ہے، انہیں قتل کرنا ہے بس، ذرا سا کام ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ ذرا سا کام ......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”تمہیں بس گولی چلانی ہے۔ باقی سب کام ہو جائے گا۔ اب جاؤ۔“ اس نے کہا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

اسی رات، دس بجے کے بعد کا وقت ہوگا، مجھے بلایا گیا۔ میں ایک جیپ میں بیٹھا اور ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ ایک باغ تھا، لیچی اور امرود کے پودے تھے وہاں۔ باغ کے باہر جیپ روک کر جب ہم اندر گئے تو وہ چند لڑکے بندھے ہوئے وہاں پڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے پہلی بار پسٹل چلایا۔ نجانے کیسے اور کہاں گولیاں پڑتی رہیں، لیکن میں نے ہی ان سب کو مارا۔ اسی رات جب میں واپس سکندر خان کے پاس آیا تو میرے طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں ایک ایسی جگہ بھجوا رہا ہوں، جو دنیا سے الگ ہے، لیکن دنیا سے جڑی ہوئی ہے۔ وہاں دو برس رہو۔ ہر طرح کا اسلحہ چلانا سیکھو، پھر واپس آؤ۔ اس دوران اگر میں مر بھی گیا تو کچھ لوگ ہیں جو تمہیں سنبھال لیں گے۔ جاؤ، عیش کرو۔“

میں چلا گیا۔ وہ پاکستان ہی کا ایک علاقہ تھا۔ وہاں میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جدید ترین اسلحہ وہاں موجود ہے۔ ایک طرح سے وہاں پوری فوجی تربیت دے رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتابوں اور جدید ریسرچ مہیا کی جاتی تھی۔ روزانہ اخبار وہاں

نکاح

اسلام نکاح سے پہلے عشق کی اجازت اس لیے نہیں دیتا کہ انسان اپنی ساری محبتیں اس کے لیے بچا کر رکھے جو ان کا اصل حق دار ہے۔

شادی سے پہلے کی محبت گویا اس طرح کی ہے جیسے "افطاری سے پہلے کوئی روزہ افطار کرلے۔ افطار کا مزہ بھی نہ رہا گناہ کا مستحق بھی ہوا' کفارے کا خرچ بھی اور سزا کا دھڑکا بھی رہا۔"

سلیم رضا...... فیصل آباد

پہنچتا تھا۔

دو برس گزر جانے کے بعد میں لاہور واپس آ گیا۔ ان دنوں انٹرنیٹ نیا نیا آیا تھا۔ مجھے رہنے کو ایک جگہ دے دی گئی۔ جہاں میں سوائے کھانے پینے، ورزش کرنے سونے اور نیٹ پر نت نئی تحقیق کرنے کے اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ ایک برس میں یہاں رہا۔ میرے رابطے بڑھنے لگے۔ انہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ سکندر خان کیا چیز ہے۔ وہ منی لانڈرنگ کا بادشاہ تھا۔ سوئی سے لے کر جہاز تک جو بھی شے بکنے والی ہوتی تھی اس کا تاجر تھا، اس کی سب سے بڑی آمدنی کا ذریعہ جوا تھا۔ اسے ذہنی طور پر شارپ لوگ چاہئے تھے۔ اس کا نیٹ ورک بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ وہاں تک رسائی لے جا چکا تھا، جہاں میری سوچ بھی نہیں جا سکتی تھی لیکن میں اس دنیا سے متعارف ہو گیا۔ میں نے یہ سمجھ لیا کہ دنیا کو جس طرح چاہئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ایک دن سکندر خان نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا۔

"تمہیں اپنے دشمن یاد ہیں؟"

" کیوں نہیں، میں انہیں بھولا ہوں اور نہ ہی انہیں بھول سکتا ہوں۔ وہ مجھے ہر پل یاد رہتے ہیں۔"

" دیکھو، دشمن کو کئی طرح سے مارتے ہیں۔ سازش کر کے یا سامنے آ کر للکار کر۔ وقتی طور پر سبق دے کر تھوڑا بہت، یا پھر ایسے کہ دشمن تو زندہ رہے، لیکن وہ مرا ہوا ہو، اسے ہر پل اپنی بے بسی کا احساس ہو۔ یہ سب سے بڑا اور بھیانک انتقام ہوتا ہے۔ دشمن کو وقت دینے کے لیے تین برس بہت ہوتے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں ابھی نہیں، صرف ان کے بارے میں جانو، معلومات رکھو اور ایسی ضرب لگاؤ کہ وہ ہمیشہ کے لیے تڑپتا رہے کہ اس نے ایسا ظلم کیا ہی کیوں تھا۔"

"میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"انتقام کی آگ کو اپنی جدوجہد کا ایندھن بناؤ۔"

اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

"مجھے کیا کرنا ہے وہ میں سمجھ گیا، آپ کیا کہتے ہو؟"

" دریا بہہ رہا ہے، اس میں ہاتھ ہی نہیں دھونے، بلکہ پوری طرح نہالو۔"

ان دنوں ہیروئن کا ایسا نشہ سامنے آیا تھا، جس نے انسانی زندگی تو تباہ کرنی ہی تھی، عالمی طاقت کا یہ ہتھیار بھی بن گیا۔ جعلی ڈالر، ہیروئن کی پیداوار میں سرمایہ اور اس کی حفاظت، اسلحہ کی خرید و فروخت، ہیروئن کے ساتھ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی ہتھکنڈوں میں بھی یہی زہر استعمال ہونے لگا۔ اسی کے بل بوتے پر اندھی قوتوں کو فروغ دیا جانے لگا۔ جس سے منی لانڈرنگ کا بزنس کا پھیلنے لگا۔ پرائز بانڈ سے لے کر کرکٹ تک کا جوا عروج پکڑنے لگا اور اس نے ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ریس کے گھوڑے کی جگہ کرکٹر نے لے لی۔ اس کے ساتھ ساتھ اندھی قوتیں اس طرح پروان چڑھیں کہ دہشت گردی بڑھنے لگی۔ جرم کی دنیا میں ان حالات کو اچھا خیال کیا جانے لگا تو پھر جرم بڑھتا ہی چلا گیا۔ انسانیت تڑپنے لگی اور موت کے سوداگر زندگیوں کا سودا کرنے لگے۔

جرم کے اس پھیلاؤ میں جدید آلات نے بڑی معاونت کی۔ انڈر ورلڈ نے اسے خوب استعمال کیا۔ ایک عام فون سے لے کر کمپیوٹر اور سٹلائیٹ سسٹم سے استفادہ کیا گیا۔ سامراجی نظام نے ایک نیا نقاب اوڑھ لیا۔

میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اگلے تیرہ برس میں نے پوری دنیا گھومی۔ انڈر

ورلڈ کا جو عالمی نیٹ ورک ہے نہ صرف اس کا حصہ بن گیا بلکہ اس میں ایک اہم طاقت مانا جانے لگا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں اتنا طاقتور ہو جاؤں گا۔ پندرہ برس سے زیادہ اس دنیا میں گزر گئے۔ میں کڑھتا تھا۔ ظلم کے اس نظام نے بے گناہوں کے لیے یہ زمین تنگ کر دی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے مقدس لوگ اندر سے کس قدر گھناؤنے ہوں گے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ایک بات سمجھ لی کہ ہر بندہ بکاؤ ہے۔ نہ بکنے والے چند ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے کہ دولت سے ہر شے خریدی جا سکتی ہے۔ دولت کے بغیر لوگ محبت میں بھی بک جاتے ہیں، اپنا آپ وار دیتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی کسی ایسے بندہ کو نہیں آزمایا۔ میں نے ہمیشہ انہی لوگوں پر سرمایہ کاری کی جو اندر سے غلیظ ہوں۔ پیسے کے لیے اپنی غیرت تک بیچ دیں۔ اس دوران میں نے اپنی الگ سے دنیا بنانا شروع کر دی تھی۔ لوگوں کا پیسہ لوگوں پر ہی خرچ ہوتا تھا۔ سکندر خان اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میں اس دنیا ہی سے غائب ہو گیا، اپنی دنیا تخلیق کرنے کے لیے۔

بیس برس بعد جب میں لاہور میں واپس گیا تو میں ایک نئی دنیا تخلیق کر چکا تھا۔ میں اپنے خاندان کا ذکر اس لیے نہیں کر رہا کہ میں نے ان سے ناتہ ہی نہیں رکھا۔ میں ان کے لیے مر چکا تھا۔ میرے والدین اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ تایا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ کزن تھے۔ لیکن زینت نہیں تھی، وہ میرے دکھ میں اپنی سانسیں کھو بیٹھی تھی۔ اسے یہی غم لے بیٹھا کہ یہ سب اسی وجہ سے ہوا۔ حالانکہ بہت بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ دشمن تو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن ربّ تعالیٰ ایسے حالات بنا دیتا ہے کہ وہ وقتی طور پر بڑی ذلت آمیز شکست لگتی ہے، مگر وہ بہت بڑی فتح کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جو بعد میں زندگی سنوار دیتی ہے۔

میرے تین دشمن تھے اور تینوں لاہور میں موجود تھے۔ بھتہ مانگنے والا عہدیدار جو اب ایک بڑا بزنس مین تھا، یونیورسٹی میں تنظیم کا بڑا سرغنہ جو ایک سیاست دان بن چکا تھا، زینت کو تنگ کرنے والا عہدیدار اسی سیاسی جماعت کی ایک ذیلی تنظیم کا سربراہ تھا اور اسکالر بن گیا تھا۔ میں چاہتا تو تینوں کو ایک وقت میں گولیوں سے چھلنی کروا دیتا لیکن یہ کوئی انتقام نہیں تھا۔ وہ لوگ جو یونیورسٹی میں میرے لیے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کے اندر داخل ہو کر ان کی تنظیم کو دیمک لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنا وتیرہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ خیر یہ باتیں کسی دوسرے رُخ کی ہیں۔ میں انہیں نہیں بھولا، شروع ہی سے انہیں اپنی نگاہ میں رکھا۔

انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو تو اسے کسی قسم کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ میرے دشمن تھے اور میں انہیں کبھی نہیں بھولا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ میں ان پر نگاہ نہ رکھتا۔ ان تینوں کے بے شمار بیرون ملک ٹور لگے۔ وہاں ان کی بے غیرتیاں بھی عروج پر تھیں۔ دلالوں سے ساز باز کر کے بہت کچھ اکٹھا کر لیا گیا۔ وہ سب کچھ آہستہ آہستہ جمع ہوتا گیا۔ سکندر خان مر گیا تھا۔ اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی تھی۔ میرا شمار ان کے بااعتماد لوگوں میں ہوتا تھا۔ میں جو اپنے کالے دھندوں کا پھیلاؤ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی مرتا ہوا دیکھ رہا تھا، جو غداری کرتے تھے، یا وہ مقابلے میں مارے جاتے، وہ مقابلہ پولیس سے ہوتا، فورسز سے یا پھر دوسری کسی پارٹی سے۔ دھندے کے پھیلاؤ میں مجھے اپنے آپ کو محفوظ کرنے اور زیادہ سے زیادہ خفیہ نیٹ ورک بنانے کا جنون سوار ہو گیا، جو میرے بڑے کام آیا۔

میرے تینوں دشمنوں کے بچے مختلف اداروں میں پڑھ رہے تھے۔ بزنس مین کی بیٹی، سیاست دان کا بیٹا اور اسکالر کی بیٹی۔ یہ تینوں نئے دور کی پیداوار تھے۔ ان تینوں کے عشق چل رہے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ ایک ایک بندہ لگا دیا گیا۔ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ''تخلیہ'' کا حصول تھا۔ جو انہیں مہیا کر دیا گیا۔ لوگوں کے عیبوں پر نگاہ رکھنے والے اپنے بچوں کی تربیت سے غافل ہو جاتے ہیں، یہی ان کا حال تھا۔ وہ دنیا کے سامنے بڑے مقدس تھے۔ لیکن ان کی اپنی اولاد کیا کر رہی ہے انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی۔ اس تخلیے میں انہوں نے کیا کیا گل کھلائے، یہ وہی جانتا تھا، جس نے ان کی ریکارڈنگ کی۔ تخلیے کی ملاقاتیں رنگ لے آئیں۔ انہی دنوں میں وہاں پہنچ گیا۔ میرے سامنے تین سی ڈیز رکھ دی گئیں۔

میں نے سب سے پہلے بزنس مین کو اس کی بیٹی والی سی ڈی بھیجی۔ دو گھنٹے میں جب اس کے پاس وہ سی ڈی پہنچ گئی تو میں نے اسے فون کیا۔

''سی ڈی دیکھ لی تم نے؟''

''ہاں آئی تو ہے، کون ہو تم اور کیا ہے اس میں تم ہی بتا دو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''میں ایک گھنٹے بعد فون کرتا ہوں۔ اب میں نہیں بتاؤں گا، تم خود بتاؤ گے یا پھر شہر بھر کے لوگ۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس دوران میں نے دوسروں تک بھی سی ڈیز پہنچا دی۔ آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا کہ بزنس مین کا فون آ گیا۔ اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

''میری بیٹی کو بچا لو، میری عزت داؤ پر لگ گئی ہے، جتنی رقم چاہو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے رقم نہیں چاہئے۔ صرف خودکشی چاہئے، تم کر لو یا تمہاری اولاد کر لے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے سیاست دان کو فون کیا۔ اس نے اپنے کیریئر کا، اپنے بچے کے کیریئر کا رونا رویا۔ میری مرضی کا پیسہ دینے کو تیار تھے۔ میں نے اسے بھی خودکشی کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ تیسرے کے ساتھ بھی یہی کیا۔ تینوں دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ میں نے انہیں ایک جگہ بلوا لیا۔ تینوں کو معلوم نہیں تھا میں کون ہوں، ہر ایک کو یہی پتہ تھا کہ وہ مجھے اکیلا ہی ملنے جا رہا ہے۔ وہ سب پہنچ گئے۔ ان تینوں کو الگ الگ بٹھایا گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد تینوں کو بلوا لیا۔ وہ میرے سامنے تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے ان سے سوال کیا۔

''تم تینوں میں مشترک کیا ہے؟''

''طلبہ تنظیم۔'' ان کا یہی جواب تھا۔

''مجھے کیوں نہیں پہچان پا رہے ہو؟''

کچھ دیر بعد وہ سمجھ گئے کہ میں کون ہوں۔

''ہمیں معاف کر دو۔'' ان کا یہی کہنا تھا۔

''تم لوگوں سے انتقام لینے کی وجہ سے میری زندگی خرچ ہو گئی۔ تم لوگوں نے ظلم کیا، مجھے تو مارا ہی، ذلیل کیا، میں ذلت کیسے بھول جاؤں اور وہ بھی میری ہی بہن پر الزام، صرف اسی لیے کہ تم لوگوں کی غنڈہ گردی قائم رہے۔ معافی تو ہے نہیں، بولو تم تینوں خودکشی کرو گے یا تمہارے بچے؟ کل تک فیصلہ بتا دینا۔ چلے جاؤ۔''

یہی وہ وقت تھا جب میں کسی دوسرے ہی دشت کی سیاحی میں نکل کھڑا ہوا۔

ان لوگوں نے اپنی بقا کی جنگ لڑنا تھی۔ ان سے جو ہو سکا، انہوں نے اپنے وسائل اور تعلقات استعمال کیے کہ مجھے مار ڈالا جائے۔ اگلے دن کی شام تک انہوں نے مجھے مارنے لیے کئی لوگ تیار کر لیے۔ میں ہی نہیں رہوں گا تو باقی کیا بچے گا۔ مجھے ان کی جو مصروفیات تھیں پتہ چلتی رہیں۔ میں سوچتا رہا کہ اگر میرے پاس وسائل اور طاقت نہ ہوتی تو یہ مجھے اب تک مار چکے ہوتے؟ نجانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ ہمارے درمیان بساط بچھی ہوئی ہے۔ وہ تینوں ایک طرف ہو گئے ہیں اور اپنے مہرے کی چال دے دے رہے ہیں۔ اور میں اپنے مہرے چلا رہا ہوں۔ اسی دن مجھے خیال آیا کہ اگر میں مہرے ہی خرید لوں تو بساط پر اپنی مرضی سے کھیل کھیل سکتا ہوں۔ میری طاقت صرف اور صرف انفارمیشن تھی۔ بر وقت معلومات، جیسے اگر ان کی سازش کے بارے میں مجھے پتہ نہ چلتا کہ انہوں نے وار کیسے کرنا ہے تو میں ان کے چنگل میں پھنس جاتا۔ اس دوران مجھے یہ پتہ چل گیا کہ ان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ میں نے خود سامنے آئے بغیر ان تک رسائی کی، انہیں کہا کہ اگر ہم انہیں راستے سے ہٹا دیں تو...... جواب مثبت آیا۔ اسی رات انہیں پار کر دیا گیا۔ وہی لوگ جن سے وہ مجھے مروانا چاہتے تھے، انہوں نے ہی انہیں مار دیا۔ ان کے بچے ہمیشہ کے لیے میرے قابو میں آ گئے۔

میں ہمیشہ کے لیے لندن آ گیا۔ میرے قریب ترین دو لوگ تھے، جو میرے بارے میں سب جانتے تھے۔ میں نے انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دی اور ان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ میں نے جدید ترین آلات کا استعمال کیا۔ اپنے گرد ایک حلقہ بنایا۔ میں صرف انہیں ہی کہتا ہوں۔ وہ آگے کوڈ اور ڈی کوڈ میں بات کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے پاکستان میں لوگوں کو تلاش کیا۔ انہیں طاقت اور رقم فراہم کی انہوں نے ہمارے لیے کام کیا اور خوب کیا۔ اپنے مخصوص مطالبات منوانے کے لیے کیا حربے استعمال کیے، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ پھر بھارت میں یہی کیا۔ وہاں بہت زیادہ بکاؤ مال ہیں۔ خاص طور پر دھرم کے نام پر بلیک میل کرنے والے بہت ہیں۔

جس طرح حکومت کوئی پل یا عمارت خود تعمیر نہیں کرتی، بلکہ کسی ٹھیکے دار کو اس کا ٹھیکہ دیتی ہے۔ اسے کام چاہئے ہوتا ہے، اسی طرح کالے دھندے کے لوگ ٹھیکہ دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔

ایک بالکل سامنے کی بات ہے۔ غریب خواب بہت دیکھتا ہے، کیونکہ اس کے پاس خوابوں کے علاوہ ہوتا کچھ نہیں۔ یہی خواب اپنے اندر بہت بڑے بڑے آئیڈیا چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے، ان خوابوں کی تعبیر کے لیے سرمایہ دار دولت خرچ کرتا ہے اور انہی خوابوں کو اپنی دولت میں اضافے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میں نے بھی غریبوں کے خواب خریدے ہیں اور اس سے دولت نہیں بڑھائی بلکہ صرف طاقت حاصل کی۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ طاقتور کا ساتھ دیتے ہیں، کمزور کو رگید دیتے ہیں۔

ایک انسانی نفسیات اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنے دل میں ایک خواہش رکھتا ہوں، مثلاً ایک ہندو، مسلمان کو مارنا چاہتا ہے، یا مسلمان ایک ہندو کو ختم کرنا چاہتا ہے، ایک فرقہ یا مسلک کے لوگ دوسرے کو ختم کرنا چاہتے ہیں، میں صرف ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے سہولیات دیتا ہوں، وہ خواہش بھی پوری کر لیتے ہیں اور انہیں دولت بھی مل جاتی ہے۔

میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس دنیا میں نجانے کتنی قوتیں ہیں جو اپنا اپنا مفاد حاصل کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی دشمن ہوتا ہے اور کہیں کوئی دوست بنتا ہے، نہ دشمنی پائیدار نہ دوستی۔ مفاد لیا اور الگ ہو گئے۔ لڑائی وہاں بنتی ہے جب ایک ہڈی پر دو کتے جھپٹ پڑیں۔ میں ہڈی پر نہیں جھپٹتا، بلکہ ہڈی رکھتا

تھا۔ یہی میری کامیابی تھی۔"

"اسی تلاش میں تم میری نگاہوں میں آ گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب بانیتا کور تمہارے پاس پاکستان آئی تھی، کیوں آئی تھی، مجھے پتہ ہے، پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ سارے میرے مہرے تھے۔" اس نے طویل بات کے بعد لمبی سانس لی

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں تھک گیا ہوں۔ میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں آزادانہ گھوم پھر نہیں سکتا۔ میں نارمل زندگی نہیں گزار سکتا، میرے بچے نہیں ہیں۔ کیا پایا میں نے اتنا سب کچھ کر کے؟"

"ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی ایک نظریہ کے لیے لڑتے رہتے ہیں، منافقت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، حتیٰ کہ رشتے ناتے اور تعلق کی بھی پروا نہیں کرتے، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ جب تمہارے جیسی سوچ پیدا ہو جاتی ہے۔ باطل نظریہ کی پہچان ہی یہی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ نہیں پوچھو گے کہ میں تمہیں یہاں تک کیوں لایا ہوں؟"

"تم خود ہی بتا دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"میں یہ سب تمہارے حوالے کر کے ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تم میں اور مجھ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جمال، تم کسی مقصد کے لڑ رہے ہو یا نہیں، لیکن تیرے ارد گرد جو لوگ ہیں بغیر کسی لالچ کے تم پر اپنی جان وار دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تم کیا ہو؟ مجھے اس کی سمجھ نہیں آ سکی، تم پاکستان میں تھے لیکن جب بانیتا کور پر حملہ ہوا، تم وہاں بھی تھے۔ میں بڑے بڑے شعبدہ بازوں کا جانتا ہوں، کئی ایسوں کو میں نے ہائیر کیا ہوا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عام آدمی ایسی صورت حال سے نہیں نکل سکتا، جیسے تم نکل آئے تھے، تمہارے ساتھ کوئی دوسری قوت ضرور ہے، جو تمہاری مدد کر رہی ہے۔" اس نے تیز لہجے میں کہا اور ساری بات کہہ کر یوں ہو گیا جیسے اس پر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر سوچتا رہا پھر میں نے پہلو بدل کر کہا۔

"اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم جتنی بھی طاقت حاصل کر لو، اس کا انجام کیا ہے؟ موت نا، کیا ساری دنیا کی طاقت تمہیں موت سے بچا لے گی؟ نہیں نا؟ تم اور مجھ میں فرق صرف یہی ہے کہ تم زندگی کے تعاقب میں ہو، زندگی چاہتے ہو، لیکن میں موت کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ تمہیں یہ پتہ ہے کہ موت آ گئی تو سب ختم، میں جانتا ہوں کہ موت ہے ہی نہیں، مٹی کا وجود ختم ہے تو اگلا دور شروع ہو جائے گا۔"

"یہ صرف طفل تسلیاں ہیں۔ جنگجوؤں نے یہ سب گھڑا ہوا ہے، آخر لوگ جنگ کیوں لڑتے، انہیں ایسی سوچ دے دی گئی، جس کے بل بوتے پر وہ لڑتے تھے، آج بھی دیکھ لو، دنیا بھر میں جتنے نام نہاد مذہبی لوگ ہیں، وہ سب یہی کر رہے ہیں۔ جنت کے، سورگ کے، نروان کے ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ یہ سوچ ہی ہے نا جو جنگ پر آمادہ کرتی ہے اور لوگ لڑ رہے ہیں۔" اس نے کافی حد تک اکتاہٹ سے کہا تو میں نے بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

"دیکھو! اگر تم تحمل سے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو تو میں تمہیں یہ فرق واضح کر دیتا ہوں کہ جنگ کیا ہے اور جہاد کیا ہے۔"

"بولو، میں سن رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"جستجو، تلاش، کوشش، جدوجہد میں زندگی پڑی ہے۔ یہ زندگی ظاہر ہو رہی ہے اعمال سے، جو عمل کیا جاتا ہے۔ اب یہ زندگی ہے نا، یہ ہے تو اس میں آرزو پڑی ہے۔ آرزو اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی، جب تک مقصد نہ ہو۔ مقصد ہوتا ہے مقصود کا اور مقصود ہوتا ہے دل میں۔ دل ہوتا ہے انسان کے اندر۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہ دل میں آرزو کیسی ہے؟ اُسی طرح کے اعمال ظاہر ہوں گے اور وہ آرزو کس کے لیے ہے؟"

"تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ انسانی خواہشات ہی اسے جدوجہد میں لگا دیتی ہیں۔" وہ بولا۔

"ابھی تم سنو، فیصلہ بعد میں دینا۔" میں نے کہا، ایک لمحہ رُکا اور پھر بولا۔

"انسان کو سب ہی اشرف المخلوقات مانتے ہیں، تو اس کی عقل بھی اشرف ہونی چاہئے۔ اور بلاشبہ اس کی عقل اشرف ہے۔ عقل کے ساتھ ہر شے کو زیر کر لیا اور کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ عقل تو ہر شے تسخیر کر رہی ہے، کیا یہ اس کے اشرف ہونے کا ثبوت ہے؟ کیا اس کے اعمال ثابت کر رہے ہیں کہ وہ اشرف عقل والا ہے؟ اب اشرف عقل ہے کیا؟ دوسرے انسانوں کا قتل یا انسانیت کی حفاظت؟ اس کے اعمال بتا رہے ہیں کہ اس کی آرزو کیا ہے اور اس کے دل میں کون ہے؟ اب سنو، میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک کلاس روم میں جتنے بھی طالب علم ہیں، بظاہر وہ سب وہیں حاضر ہیں، سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن حاضر اسے ہی تسلیم کیا جائے گا، جو استاد کے ساتھ ذہنی تعلق جوڑے بیٹھا ہے۔ وہ حاضر نہیں مانا جائے گا، جو کلاس میں تو موجود ہے لیکن اس کا ذہن کہیں دوسری جگہ بھٹک رہا ہے۔"

"تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟" وہ تیزی سے یوں بولا، جیسے اگلی بات وہ سمجھنا چاہتا ہو۔

"اعمال بتاتے ہیں کہ میں حاضر ہوں یا نہیں۔ سنو، یہودی، عیسائی، یا جو بھی غیر مسلم ہیں، اپنا حاضر ہونا ثابت کر رہے ہیں۔ جس طرح وہ حاضر ہونا ثابت کر رہے ہیں، اس طرح حاضر ہونا ممکن نہیں، چاہے انہوں نے اپنا آئین و قانون بنا لیا ہے۔ ہم مسلمانوں کا جو نظام ہے وہ کہاں ہے، ہم کہاں حاضر ہیں؟ میں پاکستان کی بات کرتا ہوں، ہم اگر مسلمان ہیں تو ہمارا نظام عشق اور محبت ہے، انسان اور انسانیت سے محبت والا نظام۔ رحمت اللعالمین ﷺ نے فرمایا ہے نا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، اگر ہمارے دل میں اللہ مقصود ہے، ہماری آرزو کا محور رحمت اللعالمین ﷺ ہے تو پھر یہاں وہ نظام ظاہر کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ اگر یہی معیار بنا لیا جائے تو کیا پاکستان میں مسلمانی ہے؟ ہم خود فیصلہ کر لیں کہ ہم حاضر ہیں یا غیر حاضر؟ ہمارے کردار سے ہمارا ہونا ظاہر ہو رہا ہے؟ کیا دوسروں کے لیے سلامتی ہے؟ اگر ہم مقام مسلمانی پر حاضر نہیں تو پھر ہم میں کون حاضر ہے؟ بلاشبہ وہ شیطان ہی ہو سکتا ہے۔ جو کسی بھی دوسرے مسلمان کے قتل کی آرزو رکھتا ہو۔ عشق و محبت والا آئین جو نبی رحمت اللعالمین ﷺ نے دیا وہ سلامتی ہے۔ وہ کیوں ظاہر نہیں ہو رہا؟ ہم اپنا جائزہ لیں، ہم میں کون حاضر ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر میں مسلمان ہوں تو دوسروں کو مجھ سے سلامتی ملنی چاہئے۔ میں اپنے انتقام کے چکر میں کہاں سے کہاں تک بھٹک گیا؟" اس نے افسوس سے کہا۔

"جب تک تیری مسلمانی یا میری مسلمانی مجھ میں حاضر نہیں تو میں اور تم غائب ہیں۔ مسجد میں میری

مسلمانی حاضر ہے، لیکن جب دوکان پر ملاوٹ والی شے بیچ رہا ہوں تو اس وقت مسلمانی کہاں ہے؟'' میں نے سمجھایا

''بلاشبہ غائب ہے؟'' وہ بولا۔

''اب تم خود سوچ لو، تجھ میں کیا حاضر ہے۔ کہیں تم اپنی مسلمانی سے غائب تو نہیں ہو؟ مسلمانی غائب ہے تو شیطانیت ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ہمہ وقت حاضر رہوں۔'' اس نے پوچھا۔

''اپنے دل کے ساتھ جڑو۔ اہل دل کے ساتھ جڑو، تاکہ تمہیں دل کی معرفت ملے، یہ دیکھو کہ تمہارے دل میں کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''یار، یہ کیا بات کر رہے ہو، خودکش بم لے کر خود کو پھاڑ دینے والا بھی دل کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔'' وہ تیزی سے یوں بولا جیسے اکتایا ہوا ہو۔

''میں نے پہلے ہی تمہیں سمجھا دیا ہے کہ دل میں مقصود کون ہے اور تمہارے اعمال کیا بتا رہے ہیں، انسان اور انسانیت کا قتل کرنے والے کے دل میں شیطان بیٹھا ہوا ہے اور اگر اس کے اعمال انسان اور انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں تو اس کے دل میں رحمان ہے۔ فیصلہ تم خود کر لو۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے، کیا میں نے جو اتنا بڑا نیٹ ورک بنا لیا اور جو چاہتا ہوں وہ کر رہا ہوں کیا دل سے نہیں ہوا؟ اب تک تم نے جو کہا، کیا میں شیطانیت کی راہ پر ہوں؟ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس نے تیز لہجے میں الجھتے ہوئے کہا۔

''یہ تم خود دیکھ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اور کیا کر رہے ہو۔ ہامان، قارون، شداد اور نمرود میں سے کس کی راہ پر ہو۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''میں اب بھی کہتا ہوں کہ یہ جنگجو لوگوں کا وہ میٹھا نشہ ہے جو وہ لوگوں کو دیتے آئے ہیں، اور اب تک دے رہے ہیں، اسی کے زیر اثر لوگ لڑتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ خود محلوں میں رہتے ہیں اور لوگوں کو قناعت کا درس دیتے ہیں۔ دنیا میں چند لوگ عام لوگوں کو لڑاتے چلے جا رہے ہیں، کون مانتا ہے خدا کو سب طاقت کی ہوس میں لگے ہوئے ہیں، جس کا بس چلتا ہے وہ دوسرے کو مار دیتا ہے، یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے نا۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں پھر کہوں گا کہ دل کے ساتھ جڑو۔ کیونکہ یقین دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر یقین نہیں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''بہت بحث ہو چکی یار، اب کام کی بات کر لیں۔'' اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مطلب تھا کہ اب تک جو باتیں ہوئیں ہیں وہ کام کی نہیں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ تمہارا فلسفہ ہے، تم جانو، یا جو سمجھنا چاہے وہ سمجھے، میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ جو میں نے نیٹ ورک بنا دیا ہے، اس میں ایمپائر کھڑی کر دی ہے، اسے سنبھالو اور مجھے......''

''نہیں، مجھے نہیں چاہئے۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میرے بزرگوں نے کہا ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے اور تم جانتے ہو کہ میں اپنی دنیا آپ پیدا کر چکا ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم مجھے یہ آفر کیوں دے رہے ہو، کیونکہ میں جانتا ہوں۔''

''کیا جانتے ہو تم؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''یہی کہ میں آج نہیں تو کل تمہاری یہ ایمپائر ختم کر دینے والا ہوں۔ یہی جنگ اور جہاد میں فرق

ہے۔ جہاد فتنے کو ختم کرتا ہے اور جنگ طاقت کے لیے لڑی جاتی ہے۔ میں تمہیں اتنا کہتا ہوں کہ اپنی یہ شیطانیت چھوڑ کر غائب ہو جاؤ یا توبہ کر لو، ورنہ میں تمہیں ختم کر دوں گا۔ اب بھی تمہیں موقعہ دے رہا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم نہیں مانو گے۔'' اس نے خرخراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں کہتا ہوں کہ اٹھ کر چلے جاؤ اور سدھر جاؤ۔ میں تمہیں ایک موقعہ دے چکا ہوں۔ جاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''میری مرضی کے بغیر تم لندن سے باہر نہیں جا سکتے ہو، میری بات مانو گے یا زندگی کے آخری سانس یہیں گزار دو گے، یہ میرا چیلنج ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ میں نے اسے وہ سمجھایا تھا، جس سے اس کی زندگی سنور جاتی، لیکن وہ ایسا پتھر تھا، جو خود کو دوزخ کا ایندھن بنانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اگر اس نے مجھے لندن سے باہر جانے پر روکا تو میں اس کی ساری طاقت سلب کر لوں گا۔

☆......☆......☆

صبح کی ابھرتی ہوئی کرنیں دربار صاحب پر پڑ رہی تھیں۔ دربار صاحب کا سنہری کلس، سرود صاحب میں دکھائی دے رہا تھا، جس کے ساتھ صبح کی سنہری کرنیں کھیل رہی تھیں۔ سرود صاحب کے ارد گرد بنے پرکرما پر کھڑے جسپال سنگھ اور بانیتا کور نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے گیان میں مگن تھے۔ وہ دونوں رات ہی سندیپ کور اور نوتن کور کے ساتھ امرتسر آ گئے تھے۔ وہ رات سکون سے سوئے اور صبح ہوتے ہی وہ دونوں دربار صاحب آ گئے۔ انہیں رات وہاں جانے کے لیے خود سردار رتن دیپ سنگھ نے کہا تھا۔ انہیں وہاں کسی کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر اپنے دھیان میں رہے۔ پھر لنگر خانے کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ لنگر خانے کے گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ ایک نوعمر سا لڑکا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہلکی ہلکی داڑھی اور مونچھ، بڑی بڑی آنکھیں، اس نے سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ سر پر بسنتی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں کا کوئی طالب علم لگ رہا تھا۔

''ست سری اکال سردار جسپال سنگھ ڈھلوں جی۔'' اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر بڑے نرم لہجے میں فتح بلائی اور پورا نام دہرایا تو ایک بار جسپال چونک گیا۔

''ست سری اکال، واہگرو جی کی فتح۔'' اس نے بھی ہاتھ جوڑ کو فتح بلائی تو اس لڑکے نے کہا۔

''سردار جی، میرے ساتھ آئیں، آپ جی سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔''

''چلو، جی۔'' اس نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ کسی نے اس نوعمر لڑکے کو بھیجا تھا تو صرف اس لیے کہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہ انہیں لے کر کمپلیکس کی جانب چل پڑا۔ وہ چند قدم آگے تھا۔ چند راہداریاں پار کرنے کے بعد وہ اسے کھلے میں موجود ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے دروازے تک آ گئے۔ تبھی دروازہ کھل گیا۔ ایک کمرے کے بعد اگلے کمرے میں ایک بوڑھا سنگھ زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آؤ جسپال اور بانیتا پتر، میں کھڑا نہیں ہو سکتا، ورنہ میں......'' اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں نہیں سردار جی آپ تشریف رکھیں۔'' جسپال نے تیزی سے کہا۔

”آؤ بیٹھو۔“ اس نے اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بیٹھ گئے۔ وہ بوڑھا سنگھ چند لمحے تک یوں آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا جیسے مراقبے میں ہو۔ پھر ان کی جانب دیکھ کر بولا۔

”میرا نام سرجیت سنگھ بندیال ہے۔ میں سنت جرنیل سنگھ بھنڈرا والے کا وہ سیوک ہوں، جوان کے ساتھ شہید نہ ہو سکا، سا کا چوراسی کے وقت میں یہاں تھا ہی نہیں، میری ڈیوٹی کسی اور جگہ تھی۔ میں وہیں رہا ،اس مہان پرش پر قربان نہیں ہو سکا۔ پر اب لگتا ہے، بہت سارا وقت گزر جانے کے بعد بھنڈرا والے کا ویژن کیا تھا۔ اگلی نسل کو کس نے بتانا تھا کہ سکھی کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو۔ پھر بولا۔

”رتن دیپ سنگھ جی نے بہت کام کر لیا۔ دشمن نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ایک ایک لفظ کو وہ سن رہے ہیں۔ وہ بے بس ہو گیا ہے۔ وہ ایسا شیر ہے، جسے پنجرے میں بند ہونا پڑا ہے۔ اور میں اب موت کے دہانے پر ہوں، میرے جیسے کئی سیوک میری طرح کی حالت میں ہیں، اس لیے میں نے سب سے صلاح لی ہے کہ اب یہ کام اگلی پیڑھی کو دے دیا جائے، تم سمجھ رہے ہو نا؟“ اس نے جسپال کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جی میں سن رہا ہوں۔“ اس نے تیزی سے لیکن دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”ہم پچھلے دو ماہ سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تیرے بارے میں بہت باتیں بھی سنی ہیں۔ ہماری صلاح یہ ہے کہ تم اب سکھی کا وہ کام سنبھالو، جو اب تک ہم کرتے آئے ہیں۔“ اس نے بڑے گہرے لہجے میں کہا۔

”سردار جی، مجھے سکھی کی کوئی بھی سیوا کرنے میں کسی بھی قسم کا کوئی حرج نہیں۔ لیکن میں اتنی بڑی ذمے داری نہیں نبھا سکتا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں؟“ سردار نے تحمل سے پوچھا۔

”نہ تو میں کوئی گیانی ہوں اور نہ ہی میرا سکھی کے بارے میں اتنا علم ہے، جو جس نے بتایا، مجھے اتنا ہی پتہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اس رستے کے راہی ہیں، جس کا گزر اندھیروں میں سے ہے۔ کب کہاں اور کیسے موت آ جائے، اس کا کوئی پتہ نہیں۔ اس وقت سکھی کو اس نوجوان لیڈر کی ضرورت ہے جو کہہ دے تو وہ ہو جائے۔ ایسے کردار والا جس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ یہاں اسی سکھوں کے مقدس مقام پر شہیدوں کا نشان بنانا چاہتے ہیں تو وہ نہیں بن پا رہا۔ وہ لیڈر چاہیے جو منافقوں کو اپنے قبیلے سے نکالے۔“ جسپال نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

”تو پھر بتاؤ کون ہے وہ؟“ سردار نے اسی تحمل سے کہا۔

”یہ تو آپ بڑے ہیں، آپ کی نگاہ اور مشاہدہ ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“ جسپال سنگھ نے سکون سے کہا۔

”سیاسی طور پر جو بندہ بھی ہم چن لیں، تو کیا تم اس کی پیروی کرو گے۔“ اس نے پوچھا۔

”بالکل، جب تک وہ سکھی کے لیے کام کرے گا، ادھر اُدھر ہوا تو نہیں۔“ جسپال نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تو سردار چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

”دیکھو، جسپال سنگھ، سکھی کو اس وقت غیروں سے اتنا خطرہ نہیں، جتنا اپنوں سے ہے۔ بڑی بڑی سازشیں تیار ہو چکی ہیں اور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ میں پچھلے دو مہینے سے پنجاب میں پھر رہا

ہوں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا ہے۔ میں وہ تمہیں بتاتا ہوں۔“

”جی میں سن رہا ہوں۔“ جسپال نے مودب لہجے میں کہا تو بوڑھا سردار گونج دار آواز میں بولا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ بقائے انسانیت اعتدال پر قائم ہے۔ جب بھی انسانی معاشرے سے اعتدال نکلتا ہے، اسی وقت تنزلی شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس نے موت خود پر وارد کر لی جو دوسرے کو شکار بنانے کے لیے جو موت بناتا ہے، پہلے وہ موت اسی پر وارد ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔“ اس نے کہا تو جسپال خاموش رہا، تب وہ کہتا چلا گیا، ”سا کا چوراسی کے بعد کئی برس تک سکھ نوجوان ہندو کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ اس سے سکھی کمزور نہیں ہوئی بلکہ زیادہ مضبوط ہوئی ہے۔ بہت سارے نوجوان بھارت سے نکل گئے، انہوں نے دوسرے ملکوں میں اپنے آپ کو آزمایا، دولت کے انبار جمع کیے۔ لیکن اندر کا انتقام ختم نہیں ہوا۔ ایک نسل سے دوسری نسل میں یہ انتقام منتقل ہو گیا۔ بھارت سے باہر بیٹھے سنگھ آج بھی تڑپ رہے ہیں۔ وہ رقم سے ان نوجوانوں کو مضبوط کر رہے ہیں۔ مگر ان کی رقم ضائع جا رہی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ یہاں کی سکھ تنظیمیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو باہر کا مال لے کر صرف کاغذی کارروائی کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایسے نوجوان ہیں جو نہ صرف سکھی کو سمجھتے ہیں بلکہ اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ وہ ”انکھ“ والے ہیں۔ وہ اپنی اَنا رکھتے ہیں۔ رقم کے حوالے سے کمزور ہیں لیکن سکھی کے لیے یہی کارآمد ہیں۔ ایک تیسری قسم ہے جو یہاں کے سنگھ تو ہیں لیکن سازشوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ نشوں نے ان کو مار دیا، عیاشی اور سکھی سے دوری نے انہیں کسی ”جوگا“ نہیں چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان نوجوان میں جو کمزوری ہے، وہ ختم ہو جائے اور وہ سکھ پنتھ کے لیے کام کرنے لگیں۔“

”آپ کے وچار بہت اچھے ہیں لیکن اس کے لیے وہ لیڈر......“ جسپال نے کہنا چاہا تو بوڑھا سردار بولا۔

”میں نے تمہیں لیڈر چن لیا ہے۔ جب تک میری سانس ہے، مجھ سے جو چاہو ملے گا، لیکن انہیں ایک رستہ دے دو۔ مجھے یقین ہے تُو اپنی نئی دنیا بنا لے گا۔“

”ٹھیک ہے سردار جی، میں کوشش کروں گا کہ آپ سے کچھ نہ مانگوں، ایک نئی دنیا بنانے کا خواب میں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ جسپال نے کہا تو بوڑھے سردار سرجیت سنگھ بندیال کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ اس نے پاس پڑے بیگ میں سے ایک ڈی وی ڈی نکالی اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

”پورے پنجاب سے وہ سنگھ اور کوریں جنہیں میں نے اس کام کے لیے تیار کیا ہے، ان کے بارے میں ساری پوری معلومات اس میں ہے۔ یہ جتنے لوگ بھی ہیں، میں انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گا اور......“

”نہیں سردار جی، اب مجھے اپنے طریقے سے کام کرنے دیں۔ میں ایک لیڈر دوں گا آپ کو، وہ سامنے ہوگا۔ وہی حکم جاری کرے گا۔“ جسپال نے کہا تو بوڑھے سردار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ان کے درمیان بات ختم ہو چکی تھی۔ تبھی ان کے سامنے لنگر چن دیا گیا۔ انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ پوری گفتگو میں بانیتا کور ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔

دوپہر سے کافی پہلے وہ واپس حویلی آ گئے تھے۔ ان کے پاس سردار رتن دیپ سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ساری بات سنی اور پھر ان دونوں کی جانب دیکھ کر بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا۔

”جو کہا ہے اب اس پر پورا اتر کر دکھانا۔ بانیتا پتر میں نے تمہیں سکھی کے لیے دان کیا۔“

”دھن بھاگ میرے باپو کے۔ میں مایوس نہیں کروں گی۔ جان وار دوں گی۔“ اس نے بھی کہا۔

”بس جو کرو سو بھلا، اس پر مزید بات کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ تبھی بانیتا کور نے جسپال کا ہاتھ پکڑا اور اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جسپال! اب تک جو بھی ہوا، وہ ایک یارانہ تھا، اب صرف سکھی کے لیے لڑنا ہے۔ ہمارے گرو ہمیں موقعہ دے رہے ہیں۔“

جسپال نے بانیتا کور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سر سے نیچے کیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

”جو بولے سو نہال او۔“

”ست سری اکال او۔“ بانیتا کور نے اس کے نعرے کا جواب دیا اور اس کے گلے لگ گئی۔

☆......☆......☆

میں اور جنید ائیر پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ جنید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ پچھلی نشست پر تانی تھی۔ دو دن میں نے اس کے ساتھ گذارے تھے۔ اتنی باتیں کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا تھا۔ اس دوران جنید نے بہت سارا ہوم ورک کر لیا تھا۔ ہیتھرو ائیر پورٹ کی بلڈنگ میں ہم جب داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جس جہاز سے ہم نے جانا تھا، اس نے صبح کے وقت لاہور پہنچنا تھا۔

”وعدہ کرو کہ بہت جلد اماں اور سوہنی کے ساتھ یہاں آؤ گے۔“ تانی بالکل روانگی کے وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور بڑے سکون سے کہا۔

”میں نہ آ سکا تو انہیں ضرور بھیج دوں گا۔ ورنہ تم چلی آنا، تم پر پابندی تھوڑا ہے۔“

”ہاں، میں یہاں اکیلی رہ کر اکتا چکی ہوں۔“ اس نے کہا تو جنید نے اعلان کی طرف توجہ دلائی۔ ہم ائیر پورٹ کے مراحل کے لیے چل پڑے۔

ہم جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ بالکل ایسے وقت میں جہاز کی فنی خرابی کے بارے میں بتایا گیا اور معذرت کرتے ہوئے کہا گیا کہ کچھ دیر بعد روانگی ہو گی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ مسافروں کو اُترنے کا کب کہتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جہاز کے اندر چند لوگ آ گئے جو دیکھنے میں یوں لگ رہے تھے جیسے بزنس مین ہوں، لیکن نگاہ رکھنے والے تاڑ گئے کہ وہ خفیہ کے لوگ ہیں۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک گئے وہ واپس پلٹ پڑے۔ اگلے چند منٹوں میں جہاز خالی کرنے کا کہہ دیا گیا۔ مجھے راشد محمود عرف گاڈ فادر کی بات یاد آ گئی کہ وہ مجھے لندن سے نہیں نکلنے دے گا۔ میں پر سکون تھا۔ میں نے ان سب متوقع صورت حال کا بندوبست کر رکھا تھا، جو وہ ان حالات میں کر سکتا تھا۔ جیسے ہی ہم لاؤنج میں واپس آئے تو وہاں پتہ چلا کہ جہاز میں بم کی افواہ ہے۔ لیکن یہ صرف مسافروں کے ”بہلانے“ کی ایک کوشش تھی۔ اس گیم کے پیچھے بہت کچھ چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب گاڈ فادر اپنا کام دکھا رہا ہے۔“

”میں تو اسے بہت ذہین آدمی سمجھتا تھا، لیکن وہ ذرا بے وقوف قسم کا مہرہ نکلا، اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایسا کر کے اس نے اپنی موت کو خود آواز دی ہے۔ وہ پھر بچ جائے گا، جو اس کے پیچھے ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”اب ہمیں کیا کرنا ہو گا؟“ اس نے کافی حد تک

تشویش سے پوچھا۔

”چائے، گرم گرم چائے پی جانی چاہیے۔“ میرے یوں کہنے پر جنید نے میری طرف دیکھا، پھر بات کو سمجھتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

”اس سے پہلے کہ ہم سے پوچھ تاچھ شروع ہو، چائے پی لی جائے۔“

”ہاں، یہ کی ہے نا سیانوں والی بات۔“ میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں وہاں اکیلا ہی بیٹھا رہا۔ میں نے فون نکالا اور تانی کو کال ملا دی۔ وہ ابھی تک ائر پورٹ پر ہی تھی۔ اس نے میری بات سنی اور فون بند کر دیا۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، اسی نے کرنا تھا۔ یہاں تک کہ جنید چائے لیکر واپس آ گیا۔

ہم چائے پی رہے تھے۔ جنید کو پتہ تھا کہ اس نے کیا کہنا ہے۔ وہ پر سکون تھا۔ ہمارے چائے پینے کے دوران بہترین سیاہ سوٹ پہنے چند گورے ہماری جانب بڑھے۔ ان میں سے ایک ہماری جانب آیا، باقی ذرا پیچھے ہی کھڑے رہے۔ وہ کافی فربہ مائل تھا، اس کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک رہا تھا موٹے موٹے نین نقش والی کی آنکھیں یوں تھیں جیسے سوجی ہوئی ہوں۔ اس نے میرے قریب آ کر بڑے اچھے انداز میں ”گڈ ایوننگ“ کہتے ہوئے اپنا تعارف کرایا

”میرا نام سٹیورٹ جان ہے، میں یہاں کی سیکورٹی میں ایک آفیسر ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں، کیا آپ میرے ساتھ میرے آفس میں چلیں گے، جہاں ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں۔“

”بالکل، کیوں نہیں چلیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر ڈسپوزل ایبل کپ ایک طرف رکھا اور اشارے سے پوچھا کس طرف جانا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ جنید کو بھی لے کر جائیں گے۔ میں ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک سادہ سے آفس میں آ گیا۔ سٹیورٹ نے ایک کرسی کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مسٹر جمال! تم لندن کیوں آئے تھے؟“

”بزنس ٹور کے لئے؟“ میں نے جواب دیا

”کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم جتنے دن یہاں رہے اس کی تفصیلات کیا ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل، میں بتا سکتا ہوں لیکن آفیسر! مجھے یہ کنفرم کر دیں کہ کیا میں حراست میں ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے؟ مجھ سے تم تفتیش کر رہے ہو؟“ میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

”نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ معمول کی کارروائی ہے۔ کیونکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کوئی دہشت گرد اسی جہاز سے واپس جا رہا ہے، جس نے کوئی یہاں پلان کیا ہے اور جو لندن کے لیے بہت خطرناک ہے۔“ سٹیورٹ نے صاف لفظوں میں کہا۔

”اوکے، تم جو چاہو سوال کر سکتے ہو۔ ایک دن، چند دن، مہینہ یا جتنے بھی دن تم چاہو، تمہارے مطمئن ہو جانے تک یہیں ہوں۔ تم اپنا اطمینان کرو۔“ میں نے سکون سے کہا اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔

”تم اتنے بااعتماد کیوں ہو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا

”اس لیے کہ میں نے کوئی غیر قانونی کارروائی نہیں کی، نہ تمہارے ملک کا قانون توڑا اور نہ ہی کسی پلان میں شامل ہوں۔ بلکہ تم کہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

”میری مدد؟ وہ کیسے؟“ سٹیورٹ نے پوچھا۔

”سنو، کیا تم لوگوں نے اطلاع دینے والے کے

بارے میں جان لیا ہے کہ وہ کون ہے؟ یہ اطلاع کس نے دی؟ اسے کیسے پتہ کہ کوئی دہشت گرد اس جہاز سے جا رہا ہے؟ اسے اس تفتیش میں لائے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں! اس کے بارے میں چھان بین کی جا رہی ہے، بہت جلد اس کا پتہ چل جائے گا۔'' اس نے بتایا

''مطلب آپ کے یعنی سیکورٹی کے کسی بندے نے اطلاع نہیں دی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کسی شہری نے یہ اطلاع دی ہے۔'' اس نے کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب آپ جتنے چاہیں سوال کریں۔ اگر میں پاکستان پہنچ بھی گیا تو تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔'' میں نے کہا اور سکون سے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے مختلف سوال کرتا رہا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس نے مجھے جانے کا کہہ دیا۔ میں لاؤنج میں آ گیا۔

میں دوبارہ تانی کو کال ملائی اور اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اس گفتگو میں ایسا کوئی لفظ بھی نہیں تھا، جو شک کے زمرے میں آ جاتا۔ ممکن ہے میری کال بھی کہیں سنی جا رہی ہو۔ کیونکہ اس وقت میرے پاس ایک عام سیل فون تھا۔ اس نے اشارے میں بتا دیا کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، ہمیں واپس جہاز میں جانے کو کہہ دیا گیا۔ ہم جہاز میں سوار ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد جہاز ٹیک آف کر گیا۔

مجھے راشد محمود عرف گاڈ فادر آ گیا۔ اس کے ملنے کر بعد مجھے اس کے بارے میں سب پتہ چل گیا۔ میرے سمجھانے کے باوجود بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہوتا بھی ایسے ہی ہے۔ انسان کی اپنی عقل پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا ہوتا۔

کوئی بندہ خدا کا انکار کر دے، یا خدا کو تسلیم کر لے اس سے خدا کی ذات کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ خود خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ ویسے ہی انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اس سے بھی خدا کو فرق نہیں پڑتا۔ خدا کا انکار یا خدائی دعویٰ، فرعونیت سے بندہ اپنے مقام بندگی کا انکار کر دیتا ہے۔

یہ انسان ہی کے لیے ہے کہ وہ بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے اور اس کی بندگی اس کے اعمال سے ظاہر ہوتی ہے۔ انکار خدا کرنے والا، تسلیم کرنے والا، خدائی کا دعویٰ کرنے والا، انسان ہی ہے، دوسری کسی مخلوق سے یہ عمل سرزد نہیں ہو رہا ہے۔ انسان ہی یہ کر رہا ہے۔ اسی سے ہی عمل ظاہر ہو رہا ہے۔ اب بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کا ''ہونا''۔ اگر یہ ہے تو اعمال ظاہر ہو رہے ہیں اگر انسان ہی نہیں تو پھر کوئی بحث ہی نہیں۔ انکار یا تسلیم کرنے کے جو بھی اثرات ہیں وہ انسان پر ہی ہیں۔ اپنے آپ کو غلام مانے گا تو آقا ظاہر ہوگا۔ اگر بندگی والے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ بندے کے اعمال اسے بندگی پر فائز کریں گے، یہی بندے کی بلندی ہے۔ جب وہ مقام بندگی کا محرم ہو جاتا ہے تو وہ ذات کبریا کے مقام کو مان لیتا ہے۔ یہی بندگی اسے ربّ تعالیٰ سے جوڑ دیتی ہے۔ یہ ہی وہ رستہ ہے جو ربّ تک جاتا ہے۔ یہی انسان کا ارتقاء ہے۔ اور انسان کے ارتقاء کا جو راستہ نبی رحمت ﷺ نے عطا کر دیا، وہ اصل راستہ، وہی صراط مستقیم ہے۔

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی

یا بندہ خدا بن یا بندہ زمانہ

جب انسان بندگی کے مقام پر فائز ہوتا ہے تو پھر باقی سب غیر پر تلوار پھر جاتی ہے۔

اصل بات ہے اپنے آپ کو ماننے کی، خود کو بندہ ماننے کی۔ اپنی فطرت کو ماننے کی۔ وہ تخلیق ہے اور اس کا کوئی خالق ہے۔ اپنے آپ کو مان لینے کا مطب ہے کہ میں بندہ ہوں تو اس نے اپنے رب کو تسلیم کر لیا۔ تب وہ بندگی کے مقام پر فائز ہو گیا۔ اس نے اس ذات کی غلامی تسلیم کر لی، جس میں شہنشاہی ہے۔ مقام بندگی پر حاضر ہونے کا مطلب ہے کہ وہ رب کے حضور حاضر ہو گیا۔ یہ یقین کے رب اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ انسان پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ رب کی جلوہ افروزیاں نہیں دیکھ پا رہا ہے۔ یہ حجاب صرف خودی سے اٹھتے ہیں۔

خودی دل کی غیرت ہے۔ جو کسی غیر کو دل میں نہیں آنے دیتی۔ غرور و تکبر، ہوائی و ہوس، فتنہ، تفرقہ، دوئی، شرک، غیر، ضد، ظلم، گمراہی، یہی خش و خاشاک ہیں اور آتش عشق کا شعلہ تند و سرکش و بے باک، اس خش و خاشاک کو جلا کر خاکستر دینے والا قوت ہی خودی ہے۔ یہ سارے مراحل بے شک عشق ہی طے کراتا ہے۔ جب بندے کا رُخ خُدا کی طرف ہوتا ہے تو اس کا سفر بلندی کی طرف ہو جاتا ہے پستی سے ناتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ غلامی آزاد کر دیتی ہے، حرص، ہوس اور لالچ سے۔ کیونکہ بندگی کا عرفان ہونے ہی سے بندے کو اپنی ذات کا عرفان ملتا ہے۔ یہ دل کے زندہ کر لینے سے ہوتی ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔' خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں...... یہی توحید تھی جسے نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا۔

لاہور کا موسم بہت خوشگوار تھا، جب ہم ائرپورٹ سے نکلے۔ راستے میں مجھے جنید نے بتایا تھا کہ وہ اس سے کیا پوچھتے رہے تھے۔ اس سے یہی ظاہر تھا کہ کہیں ہم دونوں کی باتوں میں تضاد ہو اور ہم دھر لیے جائیں۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہم کار میں بیٹھ کر جب ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلے تو میرا اسیل فون بج اٹھا۔ وہ گاڈ فادر کا فون تھا۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم نکل جاؤ گے، لیکن پاکستان کی زمین تم پر تنگ کر دی جائے گی۔ تم سمجھتے ہو نا کہ پاکستان ایک جنگل ہے، جس کے پاس جتنا پیسہ ہے وہ اتنا ہی قانون کو اپنی لونڈی سمجھتا ہے، وہ قانون بھی خرید سکتا ہے، اپنی مرضی سے جو چاہے وہ ہوتا ہے۔''

''جس طرح تمہارے دعویٰ کے باوجود میں یہاں آ گیا ہوں، اسی طرح میرا ربّ میری حفاظت کرنے والا ہے۔ تم فکر نہ کرو، ابھی کچھ دیر میں تمہارے ساتھ کیا ہوگا، تم نہیں جانتے ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا، دیکھتے ہیں۔'' اس نے کہا اور قہقہہ لگا دیا

''اور یہ بھی جان لو کہ تم سوائے ایک مہرے کے کچھ بھی نہیں ہو، مہرہ وہ بھی پیادہ، گھوڑا بھی نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا تو اس نے کہا۔

''تم بھی تو مہرے ہو؟''

''یہ وقت بتائے گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوہنی والے گھر میں جا پہنچا۔ طارق نذیر نے اسے دوبارہ بہترین انداز میں سجا دیا تھا۔ میں بیڈ پر سیدھا ہو کر لیٹا ہی تھا کہ اروند کا فون آ گیا۔

''پاکستان واپسی پر خوش آمدید۔ پاکستان میں گاڈ فادر کے جو چند لوگ تھے، وہ سب حراست میں لے لیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ عالمی دہشت گرد تنظیم کا نام جوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ایک نوجوان ہے، جو سارے پیغام ڈی کوڈ کر کے آگے دیتا تھا۔ مطلب، احکام دینے اور لینے والے، جو یہاں کے ہائیر کیے ہوئے لوگوں کے درمیان تھے، وہ ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی وقت لگے گا، نئے لوگ بنانے میں،

لیکن ابھی ان میں ان دیکھی دیوار بن چکی ہے، ان میں کوئی رابطہ نہیں رہا۔“

”باقی بھی چند دن میں صاف ہو جائیں گے، تم نے وہ کام کیا جو میں نے بتایا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو آج صبح ہی ہو گیا تھا۔“

”کوئی مشکل؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے بتایا۔

دراصل یہی انہی کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے گاڈ فادر والے جتنے بھی اکاؤنٹ تھے، ان میں جس طرح پونڈ آگے پیچھے جاتے تھے، ان سب کو سمجھا۔ لندن کے لوگوں نے ان کے منی لانڈرنگ والے دھندے کو سمجھ کر مدد کی اور ان کا جو سرمایہ تھا، وہ سب نکال لیا اور ایسی کمپنیوں کو ادائیگی کر دی جو صرف نام کی تھیں۔ کروڑوں پاؤنڈ ان کے ہاتھ لگے تھے۔ جو نہ صرف انہوں نے سنبھال لیا، بلکہ ٹھکانے بھی لگا دیا تھا۔

”اب یہ جو درمیان میں خلا ہے، اس کے کوڈ اور ڈی کوڈ سمجھے ہیں کہ نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”سمجھ لیے ہیں؟“ اس نے بتایا

”تو پھر ان سب کو یہ حکم جاری کر دو کہ شام تک کوئی بندہ کسی سے بات نہ کرے۔ شام کے بعد بات کی جائے گی۔ سکون کریں۔“ میں نے کہا۔

”ہو گیا۔“ اس نے کہا تو میں نے اوکے کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر سبھی خیالوں کو ذہن سے نکالا اور سو گیا۔ دو گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو میں فریش تھا۔ میں نے جنید کو وہیں لاہور میں چھوڑا اور نور نگر کے لیے چل دیا۔ مجھے شام سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

☆......☆......☆

جسپال اور بانیتا کور حویلی کی سرنگ کے راستے سے باہر کی جانب جا رہے تھے۔ دونوں کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اس وقت یوں دکھائی دے رہے تھے، جیسے کوئی دیہاتی جوڑا ہو۔ وہ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ انہوں نے نہ تو سندیپ کور کو بتایا اور نہ نوتن کور کو۔ وہ ایک آٹو رکشے پر بیٹھے اور بس اسٹینڈ کی جانب چل دیئے۔ وہ دونوں ایک عام سی بس میں بیٹھ گئے جو بٹالہ کی طرف جانے والی تھی۔ تھوڑی دیر میں بس لوگوں سے بھر گئی تو چل پڑی۔ بس مختلف جگہوں پر اسٹاپ کرتی چلتی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ 'چوگوان' کا اسٹاپ آ گیا۔ وہ دونوں وہیں اتر گئے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا تعاقب تو نہیں ہو رہا۔ کوئی ان کی نگرانی تو نہیں کر رہا ہے۔ اسٹاپ پر وہی دونوں اترے تھے۔ سڑک پر دور دور تک دونوں طرف کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ 'چوگوان' کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑے۔ کوئی سو قدم چلنے کے بعد انہیں سامنے سے ایک فور وہیل آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ان کے پاس آ کر رک گئی۔ ایک نوجوان اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور پھر سے اسٹاپ کی جانب چل پڑے۔ واپس سڑک پر آ کر وہ اسی طرف چل دیئے جس طرف سے بس آئی تھی۔ اس دوران انہوں نے کپڑے بدل لیے۔ دونوں جین اور شرٹ میں تھے۔ آنکھوں پر سیاہ گاگلز، انہوں نے اپنا روپ ہی بدل لیا تھا۔ تھوڑا سفر کرنے کے بعد وہ سڑک سے دائیں جانب مڑ گئے۔ جس کے اختتام پر اکال گڑھ گاؤں تھا۔

انہیں اکال گڑھ گاؤں میں نہیں جانا تھا بلکہ گاؤں کے باہر مغربی طرف سے سڑک جنوب کی طرف جاتی تھی۔ وہ کچھ آگے جا کر دائیں جانب مڑ تی تھی۔ اسی پر وہ فارم ہاؤس تھا۔ جو کسی زمانے میں رتن دیپ سنگھ نے خریدا تھا۔ تب سے

وہیں گورتیج سنگھ اور اس کی بیوی ملکیت کور رہتے آئے تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی روپ کور تھی جو بیاہ کر کینیڈا شفٹ ہو گئی تھی۔ ان دنوں وہ وہیں آئی ہوئی تھی۔

فارم ہاؤس پر ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ گورتیج سنگھ، ملکیت کور اور روپ کور، ان کے وہاں پہنچتے ہی پورچ میں آ گئے۔ وہی تینوں جانتے تھے کہ یہ کون ہیں لیکن اپنے نوکروں کو دکھاوے کے لیے یہ بتایا گیا کہ یہ کینیڈا سے آئے ہیں۔ روپ کور کے دوست کینیڈا سے آ رہے ہیں۔ وہ کچھ دن یہاں رہیں گے۔ یہ کچھ دن کتنے ہونے تھے، یہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ یہ پنجاب پر ریسرچ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ فارم ہاؤس کے اندر کافی بڑی ساری رہائش گاہ تھی۔ جس کا ایک مخصوص حصہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ بیڈ روم میں جا پہنچے۔ وہاں جاتے ہی اپنی عادت کے مطابق بانیتا کور بستر پر جا گری۔ جسپال سنگھ ملازمین کا لایا ہوا سامان ٹھکانے لگوا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لنچ کے بعد وہ دونوں ہی سو گئے۔

شام کے وقت جب وہ بیدار ہوئے تو فریش ہو کر وہ چھت پر آ گئے۔ ارد گرد وہی گاؤں کا ماحول تھا۔ چاروں طرف کھیت تھے۔ ان میں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ شمال کی جانب کافی فاصلے پر ٹیوب ویل تھا۔ جس کے ارد گرد کافی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہوتے رہے، پھر کرسیوں پر آن بیٹھے۔ شام اتر چکی تھی۔ تبھی جسپال نے اپنا فون نکالا اور اروند سنگھ کے نمبر ملا دیئے۔ کچھ دیر بعد ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

”میری میل پڑھ لی تھی۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، پڑھ لی تھی۔ اس ڈی وی ڈی کی کاپی بھی مل گئی ہے، جس میں لوگوں کے ایڈریس ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے سردار سرجیت سنگھ بندیال کی وہ تحریر بھی پڑھ لی ہے۔ ہم اسے دیکھ لیں گے۔ میں اور فہیم نے ان سے رابطے کا ایک طریقہ کار بنا لیا ہے، جو میں تمہیں تفصیل سے بھیج رہا ہوں۔ یہ سب نیٹ ورک میں جیسے ہی آتے ہیں، کوئی پلان کر لیں گے۔“ اس نے پوری تفصیل سے بتا دیا

”جمال کدھر ہے، اس نے دیکھا؟“ جسپال نے پوچھا۔

”وہ ابھی یہاں نہیں پہنچا، لیکن کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔ وہ کہیں قریب ہی ہے۔ وہ جیسے ہی آتا ہے، میں اس سے شیئر کر لیتا ہوں۔“ اروند نے جواب دیا۔

”اوکے، میں انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد وہ دونوں نیچے اپنے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے وہ سامان کھولا۔ اس میں بڑے سمارٹ قسم کے آلات تھے۔ وہ ان سے یہاں بیٹھ کر کسی سے بھی رابطہ کر سکتے تھے۔ اس کی یہی خصوصیت تھی کہ اس کوئی نیٹ ورک پکڑ نہیں سکتا تھا۔

رات گئے جمال کا فون آ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”تمہیں فی الحال کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سکون کرو۔ ایک دو دن میں وہ سب نیٹ ورک میں آ جائیں گے۔ پھر ہم پلان کر لیں گے کہ کرنا کیا ہے۔“

”ہم ادھر آرام سے پڑے رہیں، امرتسر سے یہاں آنے کا فائدہ؟“ جسپال نے پوچھا۔

”یہ میرا فیصلہ نہیں تھا سوہنے، تم جب اپنی من مانی کرو گے تو یہی ہوگا۔ یہ سیٹ اپ تم اوگی میں بھی بنا سکتے تھے۔ یہاں تم جلدی نگاہوں میں آ جاؤ گے۔“

”میں نے کون سا یہاں ہمیشہ رہنا ہے، زیادہ سے زیادہ دو ہفتے اور بس؟“ جسپال نے پوچھا۔

"تم اپنا سیٹ اپ سیدھا کرو اور اس کے بعد چپ چاپ چندی گڑھ نکل جاؤ، نوتن اور سندیپ کو بھی ساتھ لو۔ بلکہ انہیں اب پہلے بھیج دو، بعد میں تم چلے جانا۔ وہیں سے آپریٹ کرو۔ رونیت اور گرلین بھی تمہیں جوائن کرلیں گی، میں انہیں یہاں سے بھیج دیتا ہوں۔ انہیں آنے میں وقت لگے گا، وہ ذرا گھوم کے آئیں گیں۔"

"کیا یہ تم نے پہلے ہی سوچا ہوا ہے؟" جسپال نے پوچھا۔ تو جمال بولا۔

"ہاں، رات میں جب سفر کر رہا تھا، اس وقت سوچا۔ میں مانتا ہوں کہ تم پر بھاری وقت ہے، لیکن جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ اس سے کہیں زیادہ بھاری وقت آنے والا ہے اور یہ سب حالات ہم نے مل کر دیکھنے ہیں۔ گھبرانا نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اوکے۔" جسپال نے کہا اور پھر کچھ دوسری باتوں کے بعد فون بند کردیا۔ وہ بڑی حد تک مطمئن ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ میں، اروند اور فہیم کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں مہوش اور باقی سب تھے۔ میں لندن ٹور کے بارے میں انہیں پہلے ہی سے معلوم تھا، اس لیے زیادہ بات نہیں ہوئی۔

"اروند! یہ جو لسٹ تمہیں یہاں کے لوگوں کی ملی ہے اور اس سے پہلے بھی ہمیں ان دلالوں کی ملی تھی، کیا یہ دونوں ایک ہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ تر ان میں وہی لوگ ہیں، تھوڑا سا کچھ فرق ہے، چند لوگ نئے ہیں۔" اس نے جواب دیا تو میں نے فہیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"فہیم، تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ تم انہیں کس طرح استعمال کر سکتے ہو یا وہ ہمارے کسی کام آسکتے ہیں۔"

"میرے خیال میں انہیں مارنے سے کچھ نہیں ہوگا، وہ انتقاماً مزید لوگ لے آئیں گے۔ مطلب پلان وہی رہے گا، بس اس میں لوگ آگے پیچھے ہوتے رہیں گے۔ اصل بات ہے کہ دشمن جو پلان لے کر آتا ہے، وہ اس میں پوری طرح شکست کھائے۔ اس سے ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ انہیں لگے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ شیطان کا جو ایجنڈا ہے، اس کا قلع قمع کیا جائے۔" فہیم نے اپنی سوچ سے آگاہ کیا تو کراچی میں بیٹھا ہوا اسلمان فوری طور پر بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ جب تک یہاں کے سہولت کار شیطان کو راستہ نہیں دیں گے، اس وقت تک آپ کا پلان بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ دونوں طرف سے کوشش کرنا ہوگی، یہ ضروری ہے۔"

"تم دونوں ایک ہی بات کر رہے ہو۔ جب سہولت کار ہی نہیں ہوگا تو وہ اپنا پلان ہوا میں رکھیں گے۔ لیکن، ہم ایسے بھی نہیں کریں گے کہ جس پر شک ہوا اسے ختم کرتے چلے جائیں۔ اصل میں دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کون سا پلان لا رہے ہیں، اسے ختم کرنے میں جو بھی کرنا پڑے، بہر حال ختم کریں گے۔ بس کوئی بھی پلان کامیاب نہ ہونے دیں۔" میں نے اپنی رائے دی تو مہوش بولی۔

"کوئی بھی پلان جب بنتا ہے نا، وہ نہ صرف حالات کو دیکھ کر بنتا ہے، بلکہ وہاں دستیاب سہولت کو دیکھ کر بنایا جاتا ہے۔ جیسے ہم نے کہیں جانا ہے تو ہم وہاں کے موسم کے مطابق کپڑے رکھتے ہیں، وہاں کی کنونیس کو ذہن میں رکھتے ہیں، رہنے یا دیگر سہولیات ہمارے دماغ میں ہوتی ہیں۔ یہاں کا ماحول ایسا ہو کہ کوئی پلان بناتے وقت لاکھ مرتبہ سوچے۔ آج اگر ملک کے حالات درست نہیں ہیں، قانون شکن زیادہ طاقتور ہیں تو اس کا یہاں ایسا ماحول بنایا گیا ہے۔"

"تو پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ ابھی تھوڑا سوچ بچار کریں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ طے ہے یہ جو ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا "حرم" ہے، ہمارا گھر، اسے ہم نے بچانا ہے، اس کی حفاظت ہمارے ذمے ہے۔" میں نے کہا تو ہم سب اٹھ گئے۔ میں نے تو سوچا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس لیے میں سیدھا اماں کی طرف چلا گیا۔ جہاں سوہنی میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں اماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سوہنی آ گئی۔ وہ اماں کو دوائی دینے لگی تو میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں کاریڈور میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ آ گئی۔

"یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" اس نے ہولے سے پوچھا تو میں نے کہا۔

"میرا انتظار مت کرنا، سو جانا۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"کہیں جا رہے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"میں چھت پر ہوں۔ مجھے کچھ لوگوں سے رابطے کرنے ہیں، تم ڈسٹرب ہوگی۔" میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہوں گی میں ڈسٹرب، بیڈ روم میں چلیں، یا میں بھی آپ کے ساتھ چھت پر آتی ہوں۔" اس نے شوخی سے کہا تو میں ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے آ جانا۔" میں نے کہا اور چھت پر چلا گیا۔

موسم کافی خوشگوار تھا۔ میں نے جاتے ہی اروند سے رابطہ کیا، وہ ابھی تک اپنے کمپیوٹر کے سامنے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا جنید نے مقامی نیٹ ورک کو الرٹ کر دیا ہے؟"

"جی وہ انتظار میں ہیں۔" اس نے جواب دیا

"کیا تم، میں اور جنید ایک ساتھ رابطے میں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی وہ آپ کی بات سن رہا ہے۔" اروند نے کہا تو جنید تصدیق کرتا ہوا بولا۔

"میں سن رہا ہوں۔"

"تو سنو، خورشید خان ہے ایک بزنس مین ہے، اس کا بائیو ڈیٹا ابھی تمہیں اروند دے دیتا ہے۔ اسے بڑے سکون سے پکڑنا ہے اور ماڈل ٹاؤن والے سیف ہاؤس میں لے جانا ہے۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔"

"میں نے تمہیں میل کر دیا ہے جنید۔" فہیم کی آواز آئی تو جنید بولا۔

"میں دیکھتا ہوں۔"

"وہ بعد میں دیکھنا، پہلے سُن لو۔ اس وقت وہ مال روڈ پر موجود جیم خانہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لڑا رہا ہے۔ وہاں چند غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ غیر ملکی ایک خاص پلان کے تحت وہاں پر موجود ہیں لیکن ابھی انہیں چھیڑے بغیر صرف خورشید خان کو اٹھانا ہے، میں لحہ بہ لحہ تمہارے ساتھ ہوں۔" فہیم نے اسے بریف کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے، میں نکلتا ہوں۔" جنید تیزی سے بولا۔

"اوکے تم نکلو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" فہیم نے کہا تو جنید کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔

آدھے گھنٹے میں وہ جیم خانہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے آس پاس مقامی نیٹ ورک کے لوگ تھے، جن سے اس کا رابطہ ہو چکا تھا۔ خورشید خان اس وقت ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے باہر نکلنے تک اسے انتظار کرنا تھا۔ وہ باہر رہا اور اس کے ساتھ مقامی نیٹ ورک بھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ تبھی

وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ ایک غیر ملکی لڑکی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں تھی اور خورشید خان نے اسے تھاما ہوا تھا۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار لے آیا۔ خورشید خان نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس غیر ملکی لڑکی کو پچھلی نشست پر پہلے بٹھایا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ اس کا ایک گارڈ بیٹھ گیا تو کار چل دی۔ اس کے پیچھے ہی اس کی سیکورٹی والی کار بھی نکل پڑی۔ دونوں میں فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

جنید الرٹ ہو گیا تھا۔ جیسے ہی جیم خانے سے وہ دونوں کاریں نکلیں، جنید بھی ان کے پیچھے لگ گیا۔ اس کے ساتھ تین کاریں تھیں۔ چھ کاروں کا یہ قافلہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ جنید اور مقامی لوگوں میں سب طے تھا کہ کرنا کیا ہے۔ جیسے ہی وہ نہر پر چڑھے، جنید اور اس کے ساتھیوں نے کوشش کی کہ کسی طرح سیکورٹی کار اور خورشید خان والی کار کے درمیان آیا جائے۔ ٹرن لیتے ہوئے ایک کار ان کے درمیان آ گئی۔ تب جنید نے بھرپور رسک لیا اور کار خورشید خان کے ساتھ لگا دی۔ پچھلی کار اس سے بھی آگے نکل گئی۔ انہوں نے گھیرے میں لے لیا۔

پلان یہ تھا کہ کسی طرح چند لمحوں کے لیے اس کی کار کو روکا جائے۔ ان تینوں کاروں نے آخر کار اس کی کار کو روک تو نہیں پائے لیکن رک جانے کی حد تک آہستہ کر ہی لیا۔ جیسے ہی خورشید خان کی کار آہستہ ہوئی، جنید نے انتہائی پھرتی سے اپنی کار کا دروازہ ذرا سا کھولا اور نیچے کی طرف کر کے سائیلنسر لگے پسٹل سے ٹائر پر فائر کر دیا۔ جیسے ہی ٹائر پھٹنے کی آواز آئی، اس وقت تک جنید نے پسٹل اندر کر کے دروازہ بند کر لیا تھا۔ جیسے ہی خورشید خان کے ڈرائیور نے کار آگے بڑھائی تو اسے پتہ چل گیا کہ ٹائر مسئلہ کر گیا ہے۔ اس کی کار ذرا سی لہرائی پھر کار سڑک میں رک گئی۔ اس سے ٹریفک بلاک ہو گئی۔ ان کی تینوں کاریں خورشید خان کی کار کے اردگرد ہو گئیں۔ خورشید خان کا ڈرائیور کار سے اتر آیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب جنید حرکت میں آ گیا۔ سبھی اپنی اپنی کاروں سے اتر آئے تھے۔ جنید نے جیسے ہی پچھلا دروازہ کھولا، وہ سبھی اس طرف دیکھنے لگے۔ جنید نے پسٹل خورشید خان کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے سکون سے کہا۔

"میرے ساتھ آتے ہو یا یہیں مار دوں؟"

"ک...... کک...... کہاں؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سیکورٹی گارڈ نے مڑ کر گن سیدھی تھی دوسری طرف سے اس کے سر پر پسٹل رکھ دیا گیا تو جنید نے کہا۔

"یار کسی اچھی جگہ چلیں گے، چلو، ایک، دو......"

"چلو۔" یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگا۔ جنید نے اسے اپنے ساتھ لیا اور اپنی کار میں آ بیٹھا۔ تین تک اس کا ڈرائیور لڑکا گیئر لگا چکا تھا۔ سائیڈ سے کاریں نکل رہی تھیں، اس نے زگ زیگ کاریوں نکالی کہ کمال کر دیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اس کی سیکورٹی کار ان کے پیچھے ضرور آئے گی۔ انہوں نے نہر سے اندر کی جانب ٹرن لیا اور تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ انہیں پتہ چل گیا کہ وہ ان کے پیچھے ہیں۔ تبھی فہیم کی آواز اسے سنائی دی

"جنید! ان سے مارا ماری مت کرنا، فائر تو بالکل نہیں، یہ اس لیے کہ یہ علاقہ ایسا ہے تم پھنس جاؤ گے۔ انہیں جُل دے کر نکلنے کی کوشش کرو۔"

"اوکے۔" جنید نے کہا تو اس کے ساتھ ہی ڈرائیور نے کار بھگا دی۔ اسے پتہ تھا کہ سب نے اس کی بات سن لی ہے۔ ایک دم ساری کاریں اکٹھی ہوئیں اور پھر الگ الگ ہو گئیں۔ سیکورٹی والی کار ایک دوسری کار کے پیچھے لگ گئی۔ جنید کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے ماڈل ٹاؤن کے سیف ہاؤس میں پہنچ گیا۔

خورشید خان کو جب ایک کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا تو میں کیمرے کے ذریعے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے جنید کے ذریعے اس سے سوال کیا۔ میں کہتا جا رہا تھا اور جنید اسے دہرا رہا تھا۔ وہ بات سننے کو بیتاب تھا۔

"سکندر خان کے دست راست راشد محمود سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

میرے سوال پر وہ بری طرح چونک گیا۔ مگر لمحہ بھر میں خود پر قابو پا گیا۔ اس نے جنید کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سکندر خان اور کون راشد محمود؟"

"جنید اس کی پٹائی کرو اور اس وقت تک کرتے رہو، جب تک یہ اس تعلق کے بارے میں نہ مان جائے، باقی باتیں صبح ہوں گی۔" میں نے کہا اور جنید سے رابطہ منقطع کر کے گھومتے ہوئے دیکھا تو سوہنی میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ملگجی روشنی میں اس کا سفید رنگ دمک رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"ہاں بھئی فہیم، اب باقی لوگوں کے بارے میں بتاؤ، کیا وہاں لوگ پہنچ گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سب اس آپریشن میں لگ گئے ہیں، چونکہ ہمارا ان سے رابطہ نہیں، اس لیے رپورٹ دیر بعد ملے گی۔"

"اوکے۔" میں نے کہا تو فہیم نے میری توجہ چاہنے کے لیے پوچھا۔

"آپ کے پاس کوئی ہے؟"

"تمہیں کیسے پتہ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"پہلے آپ کنفرم کریں، تو......" وہ کہتے ہوئے رُک گیا تو میں نے اسے سوہنی کی موجودگی کے بارے میں بتا دیا، تب وہ بولا۔

"یہ میں آپ کو ایسے نہیں بتا پاؤں گا۔ آپ کو میرے پاس آنا ہوگا۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھئی، میں اتنے دنوں بعد اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوں اور تم رقیبوں کی طرح درمیان میں خلل ڈال رہے ہو۔" میں ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ میری ایک بڑی کامیابی ہے، جو میں سب سے پہلے آپ کو بتانا چاہ رہا تھا۔ چلیں صبح تک انتظار کر لیتا ہوں۔" اس نے یوں کہا جیسے مایوس ہو گیا ہو۔ سو میرے کہنے سے پہلے ہی سوہنی نے کہا۔

"فہیم! اس وقت تمہارے پاس کون کون ہے؟"

"میں، اروند اور مہوش۔" اس نے کہا۔

"اوکے، ہم دس یا پندرہ منٹ تک تمہارے پاس آ رہے ہیں۔" اس نے کہا تو میں نے سوہنی کی جانب دیکھا وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور ایک ملازمہ سے بہترین چائے بنانے کو کہا۔

جب تک ہم کچن کے پاس پہنچے، چائے تیار تھی۔ سوہنی نے فریج میں سے مٹھائی نکالی اور وہ ٹرے میں رکھتے ہوئے ملازمہ سے چائے رکھنے کو کہا۔ اگلے چند منٹ میں ہم ان کے پاس تھے۔

"ہاں بولو کیا کامیابی ہے۔" سوہنی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی، اروند اور مہوش بھی متوجہ ہو گئے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بتانے لگا

"آپ کو یاد ہوگا کہ بھارت میں کسی نے بدن کی گرمی اور ان دیکھی شعاعوں کو ایک ٹریکر کے طور پر استعمال کرنے کا سوفٹ ویئر بنایا تھا، پھر ہم نے اسی سے اُن لوگوں کو پکڑا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" میں نے کہا تو وہ تیزی

سے بولا۔

"یہ دیکھیں، میں نے ایک سوفٹ وئیر بنایا ہے، اس کی بنیادی تھیوری یہ کہ جس طرح بظاہر انسان ایک جیسا ہی ہے، لیکن قدرت نے اسے انفرادیت بھی دی ہے۔ جیسے انگوٹھے کا نشان، جسم کی شعاعیں وغیرہ۔ ہر انسانی جسم کی کیمسٹری الگ ہے۔اس طرح اگر اس سوفٹ وئیر میں کسی بھی شخص کی آواز داخل کر دی جائے تو پھر وہ آواز جب تک دنیا سے ختم نہیں ہو جاتی، اس وقت تک وہ آواز والا بندہ ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔"

"اوئے فہیمے تیری...... مجھے بتایا ہی نہیں۔" اروند سنگھ نے چونکتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"اس لیے کہ تو اسے چیک کر، اب اسے اپ ڈیٹ کر، اگر ہو سکے تو۔" فہیم نے فخریہ انداز میں کہا۔

"پر تجھے میرے چھت پر ہونے کا اندازہ کیسے ہو گیا، میں تو بولی ہی نہیں وہاں پر؟" سوہنی نے الجھتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہاں جتنے فرد ہیں ان سب کی آوازوں پر ہی تو تجربہ کیا ہے، آپ کی آواز بھی اسی میں ہے، سو، مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ کہاں ہو۔"

"بے شک یہ تمہاری بڑی کامیابی ہے۔" مہوش نے اس کے پاس آ کر بال بگاڑ دیئے۔ یہ اس کا خلوص بھرا انداز تھا۔ تبھی اس نے کہا۔

"کاش یہاں گرلین اور رونیت ہوتیں، انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ انہیں بھی بتائیں۔"

"انہیں بھی معلوم ہو جائے گا، کل تک وہ بھارت پہنچ جائیں گی، اس وقت وہ جہاز میں ہوں گی۔" میں نے کہا تو وہ سمجھ گئی کہ انہیں تو چلے جانا تھا۔

"اوہ! کل بتا دیں گے۔" مہوش نے کہا۔

"مبارک ہو فہیم، ربّ تجھے بہت ترقی دے۔ کل تمہارے اعزاز میں پارٹی ہو گی، یہیں پر۔" میں نے کہا تو وہ سب خوش ہو گئے۔ ابھی وہ سارے اس سوفٹ وئیر کو سمجھ رہے تھے کہ میں نے اروند کی توجہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"یار، جن لوگوں کی میں نے تمہیں لسٹ دی تھی، وہ سب......"

"ان کا آپریشن مختلف جگہ پر ہو رہا ہے، میں ان کے ساتھ ہوں۔ مجھے اطلاع مل رہی ہے۔ چاہے چھ سات بندے ہی ہیں، لیکن سب مہان قسم کے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا تو میں ان کے پاس سے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ میں نے ان سب سے صبح بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ملجگا اندھیرا تھا۔ میں فریش ہو کر جب واپس بیڈ پر آیا تو سوہنی میرے لیے چائے بنا کر لا چکی تھی۔

"سوہنی۔! اب مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا، میں ذرا بزی ہوں۔" میں چائے کی چسکی لے کر کہا تو وہ میری بات سمجھتے ہوئے مسکرا کر چلی گئی۔ جب تک چائے کی پیالی ختم ہوئی اس وقت تک میں سب سے رابطہ کر چکا تھا۔ جنید نے رات خورشید خان کی کافی دھنائی کی تھی۔ صبح سے پہلے وہ سب مان گیا تھا۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تمہیں راشد نے نہیں بتایا؟" میں نے سوال کیا۔

"تین دن سے اس کے ساتھ رابطہ نہیں ہے۔" اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

"وہ نور نگر بندے تم نے بھیجے تھے، راشد کے کہنے پر یا تمہاری اپنی کوئی دلچسپی تھی؟"

"راشد کے کہنے پر، وہ وہاں کچھ لوگ مروانا چاہتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ وہی جانتا ہے، مجھے اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ یہ بندہ ہمارے نیٹ ورک کے لیے خطرناک ہے۔" اس نے صاف بتا دیا۔

"اب سمجھ گئے ہو کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا تو روہانسا ہوتا ہوا بولا۔

"میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، میں تو اس نیٹ ورک کا حصہ ہوں، مجھے وہ سب کرنا پڑتا ہے، مجھے معاف کر دیں آپ جو کہیں گے میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"وہ نیٹ ورک اب ختم ہو چکا ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ سے جتنا پیسہ تھا، وہ نکال لیا گیا ہے۔ تمہیں صرف اتنا کہا جا رہا ہے کہ ملک دشمنی میں اگر تم نے کوئی بھی کام کیا تو پھر بخشے نہیں جاؤ گے۔ بلکہ کوئی بھی ایسا کام ہو، تو اطلاع دینی ہے۔"

"جی میں ایسا ہی کروں گا، بس مجھے معاف کر دیں۔" اس نے کہا تو میں نے جنید کو اسے آزاد کرنے کو کہا۔ میں جانتا تھا کہ جنید اسے ایسے نہیں چھوڑنے والا، وہ اسے اس طرح وہاں سے بھیجتا کہ اسے پتہ ہی نہ چلے کہ وہ کہاں تھا۔ میں نے فرداً فرداً سب سے یہی بات کی انہیں آزاد کر دیا۔

میں نے ایک دفعہ سب کو معاف کر دیا۔ ان میں جو بھی سانپ فطرت والا ہو گا، اس نے ڈنگ ضرور مارنا تھا، اس کے لیے پھر معافی نہیں تھی۔ اسی لمحے میں نے راشد عرف گارڈ فادر کو فون کیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے بولا۔

"مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ جب میں تمہیں اپنا سارا نیٹ ورک دے رہا تھا، تم نے نہیں لیا۔ اب انہیں لوٹ رہے ہو، اور نیٹ ورک تباہ کر رہے ہو، اس سے تمہیں کیا فائدہ ہے میری جان؟"

"تم لوگ انسانیت کے لیے کام نہیں کر رہے ہو، تم لوگوں کا مقصد شیطانیت ہے، جو مجھے قبول نہیں۔ جو بھی میرے ملک کے لیے غلط کرے گا، میں اسے حرف غلط کی طرح مٹا دوں گا۔"

"جو کچھ تم ختم کر چکے ہو، یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے، تمہارے حکمرانوں نے، سیاست دانوں، مذہبی لیڈروں، سوشل ورکروں نے تمہارے ملک کو تماشہ گاہ بنا دیا ہے۔ کیا کرو گے، بہت وقت چاہئے اور بہت بڑی قوت، اور تم ایسے بھی نہیں ہو کہ بقول تمہارے، میرے جیسے مہرے کو بھی ختم نہیں کر پائے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے بعد پھر نمودار ہو جاؤں گا۔ پوری دنیا تک رسائی ہے میری۔" اس کا لہجہ مضحکہ خیز تھا۔

"تو پھر تم نے میری رسائی دیکھنی ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اچانک اس کا قہقہہ بند ہو گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، "یہ کیا ہے ڈیورا؟"

"تمہاری موت۔" اس نے کہا اور فائر کر دیا۔ گارڈ فادر کے منہ سے بھیانک آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گر گیا تھا کیونکہ فون گرنے کی آواز آئی تھی۔ اس کے کچھ ہی لمحوں بعد ڈیورا نے کہا۔

"یہ ختم ہو چکا ہے۔"

"تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ یہاں سے نکلو گی تو سرخ مرسیڈیز میں میری وہی ساتھی بیٹھی ہوئی ہو گی، جس سے تم ملی تھی۔ وہ تمہاری ہر خواہش پوری کر دے گی۔" میں نے اسے سمجھایا

"اوکے، میری اس کے ساتھ ڈیل ہو چکی ہے۔ مجھے پاسپورٹ مل گیا ہے۔" اس نے کہا اور فون بند کر

دیا۔ میں تانی کی سوچ کو داد دیئے بنا نہیں رہ سکا اس نے کس خوبصورتی سے راشد کو ڈیورا کے ہاتھوں ہی ختم کرا دیا۔ ایک بڑی ڈیل اور کسی بھی دوسرے ملک میں رہنے کا وعدہ ڈیورا کے لیے اتنا اہم نہیں تھا، جتنا اس نے اپنی آزادی کے لیے کیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور فون بند کر دیا۔ میں چند منٹ بیڈ پر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کھڑکی میں آ گیا۔ دو پہر ہو چکی تھی۔

شام ہونے میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ میرا دل کیا کہ میں کہیں باہر نکلوں۔ میں نے کار نکالی اور مسافر شاہ کے تھڑے کی جانب چل پڑا۔

تھڑے پر درختوں کے نیچے پانی کا چھڑکاؤ کیا ہوا تھا۔ رنگین پائیوں والی چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کار روکی اور اتر کر کمروں کے پیچھے دیکھا تو اکھاڑے میں فرید اور درویش دونوں زور کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو اور پہلوان بھی زور آزمائی کر رہے تھے۔ انہیں دیکھنے کو کچھ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے رک گئے۔ میں نے انہیں اپنا کام جاری رکھنے کو کہا اور وہاں سے پلٹ کر مسافر شاہ کے تھڑے پر چلا گیا۔ میں اس وقت واپس لوٹا، جب شام ہو رہی تھی اور وہ زور آزمائی ختم کر کے سردائی رگڑنے لگے تھے۔ اس وقت میں ان کے پاس چار پائی پر جا بیٹھا۔ پہلوان مٹی کے بڑے بڑے پیالوں میں سردائی پی رہے تھے۔ ایک پیالہ مجھے بھی دیا۔ میں نے سردائی پینے کے بعد اس درویش سے فرید کے بارے میں پوچھا۔

''سناؤ کیا حال ہے اس کا؟''

''اب یہ فتح کی راہ پر آیا ہے، سمجھ لو کہ برتن کو آگ میں رکھ دیا ہے، اب اس نے پختہ ہونا ہے۔'' اس نے رمزیہ انداز میں کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کھل کر کہو بابا، اصل بات کیا ہے؟'' میں نے جان بوجھ اس سے فرید کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

''اصل بات تو شوق ہی نا سرکار۔ اس کا شوق اسے پہلوانی کی طرف لے تو آیا لیکن یہ انتہائی کچا تھا۔ یہ کچھ نہیں جانتا تھا، اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ اس نے خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خیر اسی سے پوچھو، یہ کن مرحلوں سے گزرا ہے۔'' اس نے فرید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میں نے فرید کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا، پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ پہلوانی اتنی مشکل ہوتی ہے۔ میں اکیلا ہی یہاں اکھاڑا کھود لیتا زور کر لیتا اور بس۔ پھر جب یہ درویش یہاں آئے تو مجھے پتہ چلا کہ یہ خود بھی اپنے دور کے بڑے پہلوان رہے ہیں۔ ان کے یہاں آتے ہی یہ پہلوان یہاں آ گئے۔ دو دن ہی میں مجھے پتہ چل گیا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، انہوں نے میرا بدن توڑ کر رکھ دیا۔ میرے اندر یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ میں کس کام میں آ پڑا ہوں۔ میں ٹوٹ گیا تھا، میری ہمت ہی جواب دے گئی تھی۔ ایک شام میں دل برداشتہ ہو کر اکھاڑے سے آیا۔ لیکن میرا شوق مجھے اس راہ سے ہٹنے نہیں دے رہا تھا، ساری رات میں اسی کشمکش میں رہا، صبح میں پھر اکھاڑے جا پہنچا۔ تب انہوں نے مجھے داؤ سکھانا شروع کر دیئے اور اب میں ان سب پہلوانوں پر بھاری ہوں۔ بڑے آرام سے انہیں زیر کر لیتا ہوں۔''

''شوق' سب سے اہم شوق ہے۔ اس کے شکستہ بدن نے اس کے اندر یہ سوچ پیدا کی کہ میں کس کام میں پڑ گیا ہوں، یہ پستی کی دلیل ہے۔ یہ گرا تو اس

کے شوق نے اس کے اندر بلندی پیدا کر دی۔ اصل میں پستی اور بلندی سے گزر جانے کے بعد ہی مقام فتح نصیب ہوتا ہے۔ جب تک کوئی گرتا نہیں ہے، اسے بلندی کی سمجھ نہیں آتی۔ شوق ہی کمزوری کی دلیل کو اڑاتا ہے اور تسخیر کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ جس نے خود اٹھنے کا راز پا لیا وہی ساری قوتوں کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شکستہ ہونا، گرنا، اٹھنا، عمل میں آنا، داؤ سیکھنا، شہ زور بننا، تسخیر کرنا یہ سب شوق ہی کے مراحل ہیں۔'' درویش نے بڑے سکون سے مجھے فرید کے بارے میں سب بتا دیا۔ میں مسکرا دیا۔ تبھی میں نے ان سب کی طرف دیکھ کر انہیں وہ بات سمجھائی جو بہت ضروری تھی۔

جب بیج زمین کی تاریکی میں چلا جاتا ہے تو تنہائی میں اس کی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ کائنات سے اس نے آنکھ بند کر لی اور وہ آنکھ اس نے اپنے آپ پر کھول لی۔ وہ اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ اسے اپنے آپ کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی خلوت میں جا کر اس نے خود پر نگاہ کی۔ اس وقت بیج کو اپنے بارے میں پتہ چلا کہ اس کے اندر کیا کچھ پڑا ہے، وہ کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ جب وہ خود کو سمجھتا ہے تو اس کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے۔ اب بیج کے پاس دو ہی قوتیں ہیں۔ ایک مٹی، دوسرا نمی۔ دوسرے لفظوں میں اسے صحبت اور نگاہ بھی کہہ سکتے ہیں جب خود پر نگاہ مرکوز ہوئی، اسے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا تب یہی صلاحیتیں اس کے اندر قوت بیدار کر دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود کو چیر دیتا ہے، زمین کی تاریکی کو بھی پھاڑ دیتا ہے اور خلوت سے جلوت میں آ جاتا ہے۔

اصل میں جب اس نے خود پر آنکھ کھولی تھی، اسی وقت ایک تناور شجر بننے کا عمل اس میں شروع ہو گیا تھا۔ جب تک اس کی خود پر نگاہ نہیں گئی تھی، وہ اس عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے اندر کی قوت ہی تھی جو بیدار ہوئی تھی۔ 'محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے...... ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے۔'

یہ ذرا سا ذرّہ ایٹم، جب ایٹم بم کی صورت میں پھٹتا ہے تو اس کے اندر کس قدر قوت بیدار ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ انرجی ثابت کرتی ہے کہ اس کے پھٹنے سے کتنی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور جس نے اس ایٹم کو پھاڑا، اس کی صلاحیتوں اور طاقتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟ وہ انسان، جس نے اتنا کچھ کر لیا، اور نجانے اس سے کیا کچھ ظہور ہونا ہے، وہ اپنی جانب دیکھ ہی نہیں رہا۔ جس نے اپنے اندر دیکھ لیا، اس نے قوتوں کا منبع سر کر لیا۔ طریقہ یہی ہے کہ اسے خلوت میں جانا پڑے گا۔

انسان ایک جسم ہے، جو مٹی سے بنا ہے اور اس کا تعلق کائنات سے ہے۔ اس کا وجود مٹی اور کل کائنات اس کا وجود ہے۔ اس کائنات میں جو سوچ اور فکر ظاہر ہو رہی ہے وہ انسان ہی کی تو ہے کہ کس طرح وہ اپنے پروردگار کی دی ہوئی نعمتوں کو تصرف میں لا رہا ہے، کیسے کیسے تسخیر کر رہا ہے۔ انسان کے اس وجود میں دِل پڑا ہوا ہے جو تمام قوتوں کا منبع ہے۔

انسان کے ظاہری جسم کا تعلق اس کائنات سے ہے۔ جہاں سے وہ اپنی تمام ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے تحت ہر شے نکال رہا ہے۔ وجود کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ ایک علم اس کے دل میں پڑا ہے اس کا دل جو ہے وہی دین ہے۔ علم دو ہی ہیں، ایک علم دین ہے اور ایک علمِ ابدان۔

یہ انسان ہی کا ظہور ہے جو اس کائنات میں ترقی ہو رہی ہے۔ مالک کائنات نے تو اسے پورا بنا دیا، ترقی کا مطلب، انسان کی اپنی ترقی۔ جو دل ہے وہ ہماری

غیرت ہے، وہی ہمارا دین ہے۔ اگر یہ نہ رہا تو پھر کچھ بھی نہ رہا۔ کیونکہ دل میں سے جا کر ظاہر ہونے والا ہی مومن ہے۔ دین اور دنیا، ظاہر اور باطن ایک نظام میں لائیں گے تو وہ دل کے تابع ہو گی عقل اگر دل کے تابع ہے تو وہ یزدانی اگر نہیں تو نری شیطانی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل کے ساتھ جڑا کیسے جائے، تو سیدھی سی بات ہے کوئی نہ کوئی معیار لینا پڑے گا، کوئی صورت لینا ہو گی جو دل کے بھید سے واقف ہے جب سامنے مومن ہو گا تو حقیقت کھل جائے گی۔ باطن کا مطلب فقر ہے۔ اصل میں دل کا راز ہے غیرت والا فقر، سامنے فقر لینا ہو گا، کوئی ہدف کوئی نشانہ تو لینا ہو گا۔ پھر تسخیر کا مقام خود بخود ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ کیونکہ دل کی سوچ ہی مومن سے پیدا ہوتی ہے۔ مومن ہی محرم راز دل ہے۔ سوچ فقر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پہلوانوں نے کھانا بنایا ہوا تھا، میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر واپس حویلی کی جانب چل پڑا۔ میں بہت مسرور تھا۔ مسافر شاہ کے تھڑے پر رونق لگ گئی تھی۔

☆......☆......☆

جسپال سنگھ کو چندی گڑھ پہنچتے ہوئے تین دن لگ گئے۔ سردار سرجیت سنگھ بندیال کی دی ہوئی معلومات اور نیٹ ورک کے ساتھ رابطہ مکمل کر لیا۔ بھارتی پنجاب کے ہر بڑے شہر میں ایک ایسا بندہ موجود تھا، جس کا پورے علاقے میں نیٹ ورک تھا۔ اس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ فہیم اور اروند سنگھ کے ساتھ مل کر ایسا مربوط رابطہ بنایا تھا کہ انہیں جو کام بھی کرنا تھا، اس سے ہر بندہ باخبر رہتا۔ اس دوران اس نے گاڈفادر کے اس پورے نیٹ ورک کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کر لی تھی جو بھارت میں پھیلا ہوا تھا۔ مگر اسے دلچسپی بھارتی پنجاب سے تھی، اس لیے اس کا کام جلدی سمٹ گیا۔ اس کے ساتھ بانیتا کور تھی۔ دونوں سیکٹر انیس میں ایک بنگلہ نما گھر میں جا پہنچے جہاں سندیپ کور اور نوتن کور پہلے ہی سے موجود تھیں۔ رونیت اور گرلین ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ اس دن وہ تھائی لینڈ میں تھیں، جہاں سے انہیں بھارت آنا تھا۔

چندی گڑھ میں انسانی حقوق کی ایک تنظیم موجود تھی، یہ سارا نیٹ ورک اسی کے گرد گھومتا تھا۔ چندی گڑھ ہی میں موجود ایک نوجوان رکن اسمبلی جگتار سنگھ اس تنظیم کو چلا رہا تھا۔ یہ تنظیم اس وقت سے قائم تھی، جب اس نے سیاست میں قدم بھی نہیں رکھا تھا، طلبہ سیاست اور تنظیموں میں اس نے اپنا آپ منوایا۔ پڑھائی کے بعد اس نے کسی سیاسی جماعت کو جوائن نہیں کیا بلکہ انسانی حقوق کی تنظیم بنالی۔ بنیادی طور پر وہ انسانی حقوق کی ہی تنظیم تھی لیکن اس کی تمام تر قوت خالصہ تحریک تھی۔ وہ خالصہ حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کے لیے جگتار سنگھ نے کئی بار بھارتی پنجاب کا دورہ کیا تھا۔ تقریباً آٹھ برس کی محنت کے بعد اسے سیاسی طور پر استحکام ملا اور وہ اسمبلی میں پہنچ گیا۔ اسے اس مقام تک لانے میں انتہائی خفیہ طور پر سردار سرجیت سنگھ بندیال نے ہی مدد دی تھی۔ جس وقت سردار سرجیت سنگھ بندیال نے جسپال سنگھ پر تمام تر ذمہ داری ڈال دی، تبھی اس نے ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کی کہ جو سامنے آ سکے۔ جب وہ رابطہ کاری پر کام کر رہا تھا، اس وقت اس کے سامنے سردار جگتار سنگھ ہی کا نام ہی آیا۔ جسپال کا اس سے رابطہ ہو چکا تھا اور اس دوپہر اسی جگتار سنگھ سے ملاقات طے تھی۔

وہ چندی گڑھ سیکٹر چونتیس میں پانچ منزلہ بلڈنگ

تھی۔ جس کی پانچویں منزل پر جگتار سنگھ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جسپال جیسے ہی لفٹ سے نکلا، اسے راہداری سنسان دکھائی دی۔ وہ مطلوبہ دروازے پر پہنچا ہی تھا اور ابھی دستک نہیں دی تھی کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس عمارت میں خصوصی آلات لگے ہوئے ہیں، ظاہر ہے جو تحفظ ہی کی خاطر ہو سکتے ہیں۔ اس کے سامنے ایک روایتی سکھ جوان کھڑا تھا، جس نے سنہری فریم والی عینک لگائی ہوئی تھی۔ میرون رنگ کی پگڑی اور سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ست سری اکال جسپال سنگھ جی، میں جگتار سنگھ۔“

”ست سری اکال۔“ جسپال نے دھیمے سے کہا۔

”آیئے۔“ اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا تو جسپال آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ وہ کافی کشادہ فلیٹ تھا۔ وہ کمرے میں سامنے پڑے ایک صوفے پر جا بیٹھا تو جگتار سنگھ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد جگتار ہی نے کہا۔

”سردار سرجیت سنگھ بندیال جی کا بہت شکریہ کہ انہوں نے اس تنظیم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میں جانتا ہوں کہ میں صرف دکھاوے کے لیے سامنے ہوں گا، اصل کام تو آپ نے کرنا ہے۔ آپ جو بھی میرے ذمے لگائیں گے، میں حاضر ہوں گا۔“

”جگتار سنگھ جی! آپ یہ ذہن میں بات بٹھا لیں کہ ہم میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑھا، یہ گرو مہاراج جانتے ہیں کہ کون سکھی کے ساتھ کتنا مخلص ہے۔ میں نے نہ آپ کے لیے کچھ کرنا ہے اور نہ آپ نے میرے لئے، اس لیے کسی کا کسی پر کوئی احسان نہیں ہے۔ کوئی بھی تحریک لہو مانگتی ہے، اور سکھ ہمیشہ لہو دینے کو بے تاب ہوتا ہے۔ کس نے کہاں کون سا کام کرنا ہے، اصل بات یہی ہے۔“ جسپال نے بڑے تحمل سے کہا۔

”میں اصل میں کہنا یہی چاہ رہا تھا کہ جو آپ فیصلہ کر کے مجھے بتائیں گے میں پوری تندہی سے کروں گا۔“ جگتار نے پھر سے یقین دہانی کرا دی۔

”چلو کام کی ہی بات کرتے ہیں۔“ جسپال نے کہا۔ تو جگتار ہمہ تن گوش ہو کر بولا۔

”جی ضرور۔“

”تم جانتے ہو کہ ساکا چوراسی کے بعد اور اندرا گاندھی قتل کے بعد سکھ نوجوانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔“ جسپال نے یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جہاں اسے درد محسوس ہوا۔

”ہاں، فوج اور ہندو گماشتے راتوں کو گاؤں میں داخل ہو جاتے اور چن چن کر نوجوانوں کو نکالتے اور انہیں گولیوں سے مار دیتے۔“ جگتار نے نفرت سے کہا۔

”اسی تناظر میں سکھ نوجوانوں ایک بہت بڑی تعداد دوسرے ملکوں کی طرف بھاگ گئی۔ جہاں ان کی ایک عمر گزر گئی، ان کی نئی نسل جوان ہو گئی۔ جیسے جیسے وقت گزرا ان کے اندر اپنی تذلیل، سکھ قوم کا قتل اور جلاوطنی کا انتقام بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ لوگ واپس نہیں آ سکتے، ان کی نسل نے وہ ظلم نہیں دیکھا، لیکن وہ بھارت میں موجود سکھوں سے یہ امید ضرور کر رہے ہیں کہ وہ سکھی کے لیے وہ سب کریں جو کرنا چاہئے، اس کے لیے انہوں نے دولت کا رخ اس طرف کر دیا ہے، مگر افسوس، کئی ایک سکھ تنظیمیں، اس دولت کا ناجائز استعمال کر رہی ہیں۔ ہمارا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایسی تنظیموں کو تلاش کیا جائے اور انہیں ختم کیا جائے۔“ جسپال نے اسے سمجھایا۔

"جی، یہ میں نے بھی محسوس کیا ہے، آج سے یہ کام شروع سمجھیں۔" جگتار سنگھ نے کہا۔

"دوسری بات یہ ہے کہ سکھی پنجاب سے جڑی ہوئی ہے، پنجاب کی ثقافت کو کسی دوسرے رنگ میں پیش کیا جارہا ہے، یوں جیسے سکھ صرف گانے بجانے والے لوگ ہی ہیں، ایک فلم پروڈکشن بنانی ہوگی جو پنجاب کو اس کا اصل رنگ دے کر پیش کرے۔" جسپال نے سنجیدگی سے کہا تو وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

"بہت عرصے سے میرے ذہن میں یہی خیال تھا، میں تو اس حد تک سوچ رہا ہوں کہ صرف فلم ہی نہ بنائی جائے، اس کا اصل کام وہ ڈاکومینٹریز ہوں جس میں ایک طرف سکھوں کو ابھارا جائے تو دوسری طرف ان پر ہونے والے ظلم دکھائے جائیں۔"

"یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔" یہ کہہ کر جسپال چند لمحوں کیلئے خاموش ہوا پھر بولا۔

"تیسرا کام یہ کہ وہ لوگ جو سکھ تو ہیں لیکن غدار ہیں، وہ زندہ نہیں رہنے چاہئیں۔"

"ہاں میں کئی ایک ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو سکھی کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"مثلاً......؟" جسپال نے پوچھا۔

"مثلاً بٹالہ میں ایک ایڈووکیٹ ہے منندر سنگھ، اس نے پورے علاقے کو اس طرح قابو کیا ہوا ہے کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ یہ صرف سیاسی طور پر مستحکم ہونے اور پورے علاقے کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ "را" کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ممکن ہے اس نے اپنا نیٹ ورک بھی بنا لیا ہو تاکہ مزید پھیلے۔" جگتار نے بتایا تو جسپال خاموش ہو گیا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"اب میں چلتا ہوں۔ چند دنوں میں کوئی ثقافتی پروگرام رکھو۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ جسپال کو لفٹ تک چھوڑنے آیا۔

وہ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور سب سے پہلے اس نے بٹالہ میں موجود بندے کو اس ایڈووکیٹ کے بارے میں پوچھا تو اس کے بارے میں اسے پوری معلومات تھی، جو اس نے اسی وقت بتا دی۔ منندر سنگھ ایڈووکیٹ شہر کا مشہور وکیل تھا۔ وہ لوگ تقسیم ہند سے پہلے کے وہاں آباد تھے۔ ان کا خاندان کافی اثر ورسوخ والا تھا۔ وہ بھنڈاری گیٹ کے قریب ایک حویلی میں رہتا تھا، جو ان کی آبائی حویلی تھی۔ منندر سنگھ سے پہلے وہ لوگ سیاست میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ مگر منندر سنگھ نے دلچسپی لی اور اپنے آپ کو منوا لیا۔ دراصل وہ کالج دور میں غنڈہ گردی کرتا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کا بگڑا ہوا لڑکا تھا۔ اس کی سرشت میں یہ شامل تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبا کر رکھے اور ان پر حکومت کرے۔ وہ مقامی سطح پر اس لیے بھی کامیاب تھا کہ "را" اسے اس طرح سپورٹ کرتی تھی۔ وہ سکھ تھا لیکن اس کا دراصل کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس کا مذہب فقط دولت تھا۔ اس نے مقامی سکھوں کے بارے میں "را" کو پوری جانکاری دینے سے سکھ وہاں کبھی نہیں اٹھ سکے تھے۔ لہٰذا اس کا پتہ صاف کرنا بہت ضروری تھا۔

جسپال نے اس مقصد کے لیے ایک ٹیم بنائی ہوئی تھی۔ جو فقط ایسے ہی کام کرتے تھے۔ یہ ان کا پہلا امتحان تھا۔ وہ لوگ مختلف شہروں میں رہتے تھے۔ انہیں فوری طور پر صبح تک بٹالہ میں گرودوارہ کندھ صاحب پہنچ جانے کو کہہ دیا۔ مقامی طور پر اس کی ریکی پر چند لوگوں کو لگا دیا۔

رات گئے تک دونوں اطراف سے خبریں پہنچتی

رہیں۔ وہ لوگ بھی جو کندھ صاحب پہنچ رہے تھے اور وہ بھی کہ منندر سنگھ کے معمولات کیا ہیں۔

بٹالہ شہر میں کندھ صاحب وہ گرودوارہ ہے جہاں گرونانک مہاراج شادی کرنے کے لیے بارات کے ساتھ گئے۔ وہ ایک کندھ (دیوار) کے ساتھ بیٹھ گئے جو کچی تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ ایک بوڑھی عورت نے گرو نانک مہاراج کو بتایا بھی کہ یہاں مت بیٹھو، یہ دیوار کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔ نانک دیو مہاراج نے جواب دیا کہ یہ نہیں گرے گی کیونکہ یہ ہماری شادی کی گواہ ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ دیوار نہیں گری، یہاں تک کہ بہت سارا عرصہ گزر گیا۔ اس کی یاد میں یہ گرودوارہ بنایا گیا، جہاں اب ہر سال میلہ لگتا ہے۔ وہ دو لوگ وہاں پہنچ گئے، جنہوں نے منندر سنگھ کا شکار کرنا تھا۔

رات کے آخری پہر جب گرودوارہ سے گیانی بولنے لگا، لوگوں کو اٹھ جانے کی تلقین کرنے لگا، ایسے میں وہ دونوں گرودوارہ سے باہر نکل آئے، انہوں نے چادریں لی ہوئی تھیں اور کافی حد تک منہ بھی ڈھانپ لیا ہوا تھا۔ ان کا رخ بھنڈاری گیٹ کی اس حویلی کی جانب تھا جہاں منندر سنگھ رہتا تھا۔

وہ حویلی پرانے طرز کی تھی اور ایک چھوٹی گلی میں تھی۔ وہی بڑا سارا سیاہ گیٹ اور دو منزلہ حویلی، جس کا طرز تعمیر تو پرانا ہی تھا لیکن اس پر رنگ وروغن اور دیکھ بھال کی وجہ سے کافی بہتر حالت میں تھی۔ گلی میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دونوں ایک موٹر سائیکل پر گلی کی نکڑ پر آن رکے۔ انہوں نے موٹر سائیکل ایک طرف لگایا اور آگے پیچھے چلتے ہوئے اس حویلی کے پاس جا پہنچے، جس کے آگے ایک مدقوق سا بلب روشن تھا۔ ان میں سے ایک نے چلتے ہوئے ایک پتھر اس بلب پر مارا تو بلب ٹوٹ گیا۔ روشنی بہت حد تک ختم ہوگئی، دور لگے ایک بلب کی ہلکی سی روشنی آنے لگی۔ گیٹ کافی مضبوط تھا لیکن انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ الماریوں، دریچوں اور ان کے بنے ہوئے ڈائزینوں پر اپنے قدم جماتے ہوئے دیوار پر چڑھنے لگے۔ یہ ایک خاص طرح کی تربیت ہوتی ہے، جس کی مدد سے بڑی بڑی بلڈنگوں پر چڑھا جا سکتا ہے۔ تقریباً ایک منٹ میں وہ چھت پر بنی چار دیواری تک پہنچ گئے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ چھت پر تھے۔ وہاں کافی اندھیرا تھا۔ گرودوارہ کے لاؤڈ اسپیکر سے آواز آرہی تھی۔ وہ اس دروازہ کی جانب بڑھے جہاں سے سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔

وہ پہلی بار اس حویلی میں ہی نہیں اس شہر میں آئے تھے۔ انہیں صرف بتایا گیا تھا کہ منندر سنگھ کا کمرہ کہاں ہوسکتا ہے۔ وہ سیڑھیاں پہلی منزل کی چھت پر اتریں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرے کمرے تھے۔ لیکن ایک کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس جانب بڑھ گئے۔ اس کمرے میں ایک بوڑھا سا شخص پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چھت پر لگیں ہوئی تھیں، یوں لگ رہا تھا کہ یہ مر گیا ہے یا پھر بس مرنے ہی والا ہے۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر تیزی سے نیچے کی طرف چلے گئے۔ سیڑھیاں کھلے صحن میں اتریں۔ جس کے تین طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ سامنے کے دروازوں میں سے جو دائیں جانب والا ہے، اس کے اندر جا کر منندر سنگھ کا کمرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر چلے گئے۔ ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی سو رہا تھا۔ منندر سنگھ کی تصویر انہوں نے دیکھ لی تھی۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی مونچھیں نوکیلی اور اوپر کو اٹھی ہوئیں تھیں۔ بیڈ پر لیٹا ہوا وہی تھا۔ ہلکی روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں دبے پاؤں اس کے سرہانے جا کھڑے ہوئے۔ ایک نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ جاگ گیا۔ اس نے صورت حال سمجھی تو ہڑبڑا گیا۔ تبھی ایک نے اس کے کان میں ہولے سے کہا۔

"چپ چاپ تجوری کی چابیاں دے دو، تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ......" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو دوسرے نے ایک لمبی کرپان اس کی گردن پر رکھ دی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے نے دراز کھولی، اس میں چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔

"تجوری والی چابی نکالو۔" دوسرے نے بڑے سکون سے کہا تو وہ چابی تلاش کرنے لگا۔ اس نے ایک چابی نکالی اور گچھا ان کے حوالے کر دیا۔ پہلے نے کرپان اس کی گردن پر رکھی اور دوسرے نے تجوری کھول لی۔ اس کے ہاتھ میں جتنا مال آیا اس نے لیا اور ایک تھیلی میں ڈال لیا۔

"تیری بیوی کہاں ہے؟" پہلے نے پوچھا۔ اس نے باہر کی جانب اشارہ کیا تو پہلا ہی بولا۔

"چلو پھر ہمیں باہر تک چھوڑ کر آؤ۔ اس وقت تک نہیں ماریں گے جب تک تم......" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کی بیوی اندر آ گئی۔ پہلے تو اسے پتہ نہ چلا کہ اندر دو لوگ بھی ہیں، اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی، دوسرا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی بیوی پر جا پڑا اور اس کی گردن دبوچ کر بولا۔

"خاموش، آواز نہیں نکلنی۔"

"چلو دونوں باہر۔" پہلے نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔

وہ چاروں بڑی خاموشی سے حویلی کے گیٹ پر آئے۔ انہوں نے گیٹ کا تالا کھولا، تبھی پہلے نے کرپان سے ایک زوردار وار کیا اور منندر سنگھ کی گردن اُتر گئی۔ اس کی بیوی کے منہ سے چیخ نکلی۔ تب تک دوسرے نے اُس کا سر زور سے گیٹ میں مارا، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ انہوں نے باہر گلی میں جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے نکلے اور موٹر سائیکل تک جا پہنچے۔ انہوں نے وہ اٹھائی اور وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ ان کا رخ شہر سے باہر جانے والے راستے پر تھا۔

جسپال سنگھ کو رپورٹ مل گئی تھی کہ کام ہو گیا ہے۔ وہ دونوں ابھی تک بٹالہ کے مضافات میں موجود ایک گاؤں میں تھے۔ وہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دو دن بعد وہاں سے جائیں گے۔ جس کے پاس وہ ٹھہرے تھے، وہ بھی خالصہ کا سرگرم رکن تھا۔ وہ دونوں سو گئے تھے، لیکن ٹی وی چیخ رہا تھا۔ اس پر یہی بات سب سے اہم بتائی جا رہی تھی کہ منندر سنگھ کی بیوی کے مطابق وہ دونوں ڈکیت سکھ تھے، ان کا مقصد ڈکیتی نہیں تھا، کرپان سے قتل کرنے کا مطلب یہ بتا دینا تھا کہ وہ شدت پسند سکھ ہیں۔ ان کا کوئی دوسرا مقصد تھا۔ جسپال مسکرا دیا۔ اس کا پیغام "را" تک پہنچ چکا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بڑی روشن صبح تھی۔ میں حویلی سے نکلا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر آ گیا۔ اس دن مجھے اروند نے فرمائش کی کہ وہ بھی وہاں جانا چاہتا ہے۔ میں نے نعیم اور مہوش کو بھی ساتھ لیا اور مسافر شاہ کے تھڑے پر جا پہنچے۔ بڑے دنوں بعد وہ کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ میں درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پر جا بیٹھا تو وہ تینوں ادھر اُدھر سیر کرنے کے لیے نکل پڑے۔ درویش اور فرید ان کی ضیافت کے اہتمام میں لگ گئے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

گاڈ فادر کے ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ ایک

باب ختم ہو گیا تھا لیکن ابھی اس کا پھیلایا ہوا گند ویسا ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد جو چند لوگوں کا حصار بنایا ہوا تھا، وہ اس وقت میرے قبضے میں تھے۔ جب تک وہ ختم نہ ہوتے، اس وقت تک یہ باب بند ہونے والا نہیں تھا۔ وہ سب جنید کے پاس سیف ہاؤس میں تھے۔ اس نے ان تین دنوں میں ان کے سارے اکاؤنٹ خالی کر لیے تھے۔ اب ان کے رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔ یہی بات کہنے کے لیے میں نے جنید کو فون کیا۔ وہ وہیں سیف ہاؤس ہی میں تھا۔

"ان سب لوگوں کو طارق نذیر کے حوالے کرو، وہ ان سے مزید تفتیش کر لیں گے، تم چاہو تو نور نگر آ جاؤ۔"

"وہ تو ہو جائے گا، اب ان کے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن ان سے ایک بات پتہ چلی ہے، وہ بہت زیادہ خطرناک ہے۔" جنید نے تشویش سے بتایا۔

"وہ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے پوری بات کا نہیں پتہ، لیکن اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہاں کا ایک سیاست دان ہے، اس کے ذریعے "را" پاکستان میں دہشت گردی کے لیے ایک گروپ تیار کر رہا ہے، اب وہ سیاست دان مہرہ ہے یا وہی اسے منظم کرے گا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن انہوں نے پبلک مقامات کو نشانہ بنانا ہے، ظاہر ہے اس کا نشانہ بننے والے بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان سبھی ہوں گے۔" جنید نے کہا تو میں نے پوچھا۔

"اس سیاست دان کے نام کا کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں، ظاہر ہے وہ کوئی دوسرے درجے کا سیاست دان ہو گا، کوئی ناکام سیاست دان یا پھر......" وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"تمہیں یہ بات کس انداز میں بتائی گئی ہے؟"

"میں نے ان کی باتوں سے اخذ کیا ہے۔" وہ بولا۔

"ممکن ہے کوئی غلط ٹریک دے رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات سچ ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے تم نے اس کے بارے میں بہت کرید کی ہو گی۔ خیر، تم اسے چھوڑو اور یہ سب لوگ ان کے حوالے کر دو، وہ بھی تلاش کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں سوچنے لگا، ایسا ممکن نہیں تھا کہ وہ ملک کی سیکورٹی اداروں سے یہ راز چھپ سکے۔ اتنا ہی اہم پلان تھا تو اس قدر لوگوں کو نہیں بتایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک پوری تنظیم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ کوئی بھی تنظیم ان سیکورٹی اداروں کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ ایسے لوگ اتنے کھل کر سامنے نہیں آ سکتے، ان کے پیچھے تو بہت خفیہ ہاتھ ہوتے ہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے میرا نام تصدیق کرنے کے بعد کہا گیا

"راشد کو تو نے مروا دیا، میں تمہاری ہمت اور رسائی کی داد دیتا ہوں، ڈیورا بے چاری اب زندہ نہیں ہے، وہ اپنے باتھ روم میں مردہ پائی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس نے تمہیں بھی جانا تھا، چلی گئی اس دنیا سے۔ یہ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنے احمق بھی ہو سکتے ہو، تم نے راشد کو مار دیا تو سمجھا کہ ہم ختم ہو جائیں گے، نہیں ایسا نہیں ہے، ہم خود اسے مروانا چاہتے تھے، وہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا تھا، اس پر پرسکون زندگی کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔" اس نے اسی سکون سے کہا تو میں نے پھر پوچھا۔

"میں پھر پوچھتا ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو، پرندے ہوا میں اُڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں، وہ جہاں دانہ دیکھتے ہیں، وہیں بیٹھ کر چگ لیتے ہیں، پھر فضا میں اُڑ جاتے ہیں۔ انہیں پنجرے میں قید نہیں کرتے۔" اس نے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"یہی کہ پرندے آزاد کر دو۔ میں اسے تمہاری دوستی تصور کروں گا، اپنا راستہ ہمیشہ الگ رکھوں گا۔ ورنہ پھر میرا پہلا ٹاسک تمہی ہو۔" اس کے لہجے میں کافی حد تک تکبر چھلک رہا تھا۔

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو......" میں نے کہا۔

"تو میں سمجھوں گا کہ تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو، جسے دوستی کرنا نہیں آتی۔" اس نے کافی حد تک چڑتے ہوئے کہا تو میں استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ دوستی اور دشمنی کیا ہوتی ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوست اور دشمن کون ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے سبق مت پڑھاؤ، کام کی بات کرو۔"

"میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی مجھے آنا چاہئے، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پرندے اُڑا دو، یہی خیر سگالی کا پیغام ہوگا، اور بس۔" اس نے کافی حد تک نرم لہجے میں کہا تو میں افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

"تم نے ذرا سی دیر کر دی، میں ان کے لیے فیصلہ کر چکا ہوں، اب میں فیصلہ واپس نہیں لوں گا۔"

"او کے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے فون کو دیکھتا رہا، پھر واپس جیب میں رکھ لیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ سب مہرے ہی ہیں۔ انہیں چھوڑ دینے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑنے والا تھا اور اب اس سے زیادہ ان سے کوئی اہم بات بھی نہیں نکلنی تھی لیکن وہ سب شیطانی ٹولہ کے افراد تھے، ان کا زندہ رہنا ہی نہیں بنتا تھا۔ میں ان کے بارے میں اس وقت تک سوچتا رہا، جب تک مہوش، اروند اور فہیم واپس نہیں آ گئے۔

"یہاں میلہ لگتا تھا؟" مہوش نے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ہر سال لگتا ہے، بس دو تین برس درمیان میں نہیں لگا۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں ابھی دو چار مہینے رہتے ہیں۔" میں نے اسے جواب دیا

"پتہ نہیں تب تک ہم یہاں ہوں گے کہ نہیں۔" اس نے حسرت سے کہا۔

"ہوں گے تو دیکھ لینا، نہیں ہوں گے تو نہ سہی۔" فہیم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ تبھی درویش نے دور ہی سے اونچی آواز میں کہا

"او غم کیوں کرتی ہے بیٹی، ہم آج رات ہی میلہ لگا دیتے ہیں، آپ آجاؤ رات کو۔"

"وہ کیسے؟" مہوش نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ گانے بجانے والے بلا لیں گے، کچھ کھیل تماشے والے، کھانا پینا ہم تیار کر لیں گے۔" اس نے سادگی سے کہا تو سبھی ہنس دیئے۔ جبکہ درویش ایک طرف نکل گیا، وہ ابھی کھانا بنانے میں مصروف تھا۔

"نہیں بابا جی اصل مزہ تو اسی میلے کا آئے گا نا جو اصل میں لگتا ہے۔" اس نے کہا تو میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"چل وعدہ رہا، اگر یہاں ہوئے تو ٹھیک، تم دنیا کے جس کونے میں بھی ہوئی، تجھے یہاں بلا لیں گے۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو ایک دم سے اروند سنگھ بولا۔

"وہ رام لعل جوگی اور اس کا کیمسٹ بیٹا، ادھر ہی ملا تھا نا، یہیں رہتے رہے ہیں؟"

"ہاں، لیکن وہ دونوں تمہیں اچانک کیوں یاد آ گئے؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ سندیپ کور والا انسٹیٹیوٹ ابھی تک ختم نہیں ہوا، وہ ویسے کا ویسا چل رہا ہے۔"

"ہاں اسے ختم تو کرنا ہے، لیکن حالات ایسے بنتے گئے کہ اس طرف سوچ ہی نہ سکے۔" میں نے اعتراف کیا تو وہ بولا۔

"دراصل جسپال سنگھ کے اردگرد عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، میرے خیال میں اسے کوئی سدھ بدھ نہیں آ رہی ہے۔ خیر میں نے ایک پلان کیا ہے، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت شاندار نکلے گا۔"

"بولو، کیا پلان ہے؟" میں نے پوچھا۔

"امرتسر میں تین بندے ہیں، جو اصل میں اس انسٹیٹیوٹ کو چلا رہے ہیں۔ اصل میں وہ بندے نہیں، تین عہدے ہیں، ان پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، جیسے کہ کچھ عرصہ پہلے ہرنیت سنگھ کو جسپال نے مارا تھا، اب اس کی جگہ نیا بندہ آ گیا ہے؟" اروند سنگھ کہتے ہوئے سانس لینے کو رُکا تو فہیم تیزی سے غصے میں بولا۔

"یار یہ تیری بڑی گندی عادت ہے۔ کہانی کرنے بیٹھ جاتا ہے، سیدھی بات بتا۔"

"میں بات ختم کرلوں، پھر کہنا، ابھی خاموش بیٹھ۔" اروند نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے میری طرف دیکھا تو اپنے میں مہوش بولی۔

"نہیں تم کہو، ہم شام تک یہیں بیٹھے ہیں۔"

وہ اس طنز کو سمجھ تو گیا لیکن کوئی تبصرہ کیے بنا بولا۔

"انسٹیٹیوٹ تباہ ہوتا ہے یا نہیں، ہم اس پر حملہ کرتے ہیں، وہ ختم ہو جاتا ہے، وہ اسے دوبارہ بنا لیں گے لیکن ہم اسے مستقل بند کروانا چاہتے ہیں تو میرے پلان کے مطابق دو فائدے ہوں گے۔"

"کون سے؟" میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ایک تو یہ کہ "را" پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی، انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ یہ انسٹیٹیوٹ بند کر دیں۔"

"یہ دھاک کس طرح بٹھانی ہے؟" مہوش نے ہاتھ کو گھماتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

"یہی میرا پلان ہے۔"

"بولو۔" میں نے کہا۔

"وہ تینوں عہدوں پر مامور لوگ ایک ساتھ ختم کیے جائیں اور باہر کے دو تین لوگ جو انتہائی اہم ہیں را کے انہیں ختم کر دیا جائے تو ہم اپنی بات منوا سکتے ہیں، پچھلے تین بندے بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔" اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

"اس سب کو آرگنائز کرنے میں تو وقت لگے گا نا؟ تم اسے دیکھو، اور پھر جیسے ہی وقت آئے مجھے بتا دینا۔"

"یہی تو بتا رہا ہوں، میں نے ایک نیٹ کی دنیا میں ایک جعلی تنظیم بنائی ہوئی ہے۔ اس سے میں کچھ لوگوں کو دھمکیاں دیتا ہوں۔ وہی جو غلط قسم کے سرمایہ دار، دولت والے ہیں۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے بتایا تو فہیم نے ہنستے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"کیا دھمکیاں دیتے ہو؟"

"یہی کہ میرے لیے چاکلیٹ بھیجو، میری شرٹ پھٹ گئی ہے، وہ لے دو ورنہ میں تمہارا پاجامہ پھاڑ دوں گا۔ یہ کہ......" مہوش نے ہنستے ہوئے کہنا چاہا تو وہ غصہ کیے بغیر بولا۔

"یہ کہ کوئی بیمار ہے، اس تک رقم پہنچا دو، یتیم خانوں کو، اسپتالوں کو، بے گھر عورتوں کو مطلب جو

بھی مجھے ضرورت مند ملا نیٹ پر میں نے اس کی مدد کروادی۔“

”یہ تو شاندار بات ہے یار۔“ مہوش نے تالی بجاتے ہوئے کہا تو فہیم بھی اس کی طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”اچھا اب کہو، ہم نہیں بولیں گے۔“

”میں جھانکتا رہتا ہوں نیٹ پر مختلف لوگوں کے اکاؤنٹ وغیرہ۔ جب سندیپ کور کے انسٹیٹیوٹ کی بابت سنا اور پھر اس پر کچھ نہیں ہوا تو میں نے اسے بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔ ان کی ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لوگ وہاں موجود لڑکیوں کا جنسی استعمال بھی کرتے ہیں۔ کل شام ان کی ایک پارٹی ہے اور یہ پارٹی انہوں نے اس انسٹیٹیوٹ سے دور رکھی ہے، یہ ان تینوں کو پتہ ہے، یا مجھے معلوم ہے۔ کیونکہ میں ان کی باتیں پڑھ چکا ہوں۔ وہ اپنے ساتھ لڑکیاں لیں گے، جنہیں بالکل پتہ نہیں ہوگا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ وہاں جائیں گے اور......“ وہ کہتے ہوئے خاموش ہوگیا

”یہ تم نے بڑی خبر دی ہے اروند سنگھ۔“ میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کل شام، ابھی کافی وقت پڑا ہے۔“ اروند نے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر یہ کام کرنا ہے تو ہوسکتا ہے۔

”اس سے بھی اہم بات میرے ذہن میں آئی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”یار کیوں نہ ہم اسے ایک تنظیم ہی بنادیں۔ جس کا تہلکہ مچ جائے۔“ میں نے کہا۔

”یہ ممکن ہے اور اسے ہم اس نہج پر چلا سکتے ہیں لیکن اس میں ایک بات بہرحال سامنے آئے گی اور وہ یہ ہے کہ سب لوگ صرف مذہب کے لیے کام نہیں کرتے، بہت کم ہوتے ہیں سر پھرے، اس کے لیے فنڈ اور دولت چاہئے ہوگی اور......“ اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سمجھایا

”دولت کی فکر مت کرو، تمہیں پتہ ہے کہ اس وقت بلین ڈالر ہمارے پاس ہیں، ہاں یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ ان لوگوں کو بھی استعمال کیا جائے، جو بہرحال دولت کے لیے سب کرتے ہیں۔ خیر، یہ انسٹیٹیوٹ والا معاملہ دیکھو، پھر اسے پوری طرح منظم کرتے ہیں۔“

”اوکے ڈن ہو گیا، ہم اس پر آج ہی سے کام کرتے ہیں۔“ اروند سنگھ نے کہا۔

”اچھا، یہ درویش کا کھانا کھاتے ہیں تو اسی پر کام کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور پھر اسی موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ بہت کچھ ہم نے وہیں بیٹھے طے کرلیا۔

☆......☆......☆

امرتسر شہر سے شمال مشرق کی جانب تقریباً پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک شاندار فارم ہاؤس تھا۔ سورج مغرب میں ڈوب چکا تھا۔ ابھی تک وہاں پر مہمان تو کیا میزبان بھی نہیں آیا تھا۔ وہاں سیکورٹی کے چند لوگ تھے۔ یا پھر وہ لوگ جو کھانا وغیرہ تیار کر رہے تھے اور اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر وہاں سے جانے والے تھے۔ دو تین لوگ وہاں رہ گئے تھے۔ جنہوں نے کھانا وغیرہ سرو کرنا تھا۔ یہ اسی فارم ہاؤس کے ہی ملازم تھے۔ وہ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہیں بالکل بھی یہ خبر نہیں تھی کہ سہ پہر سے ان کی ریکی ہو رہی ہے۔ چند لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں، فارم ہاؤس کی لوکیشن سمجھ چکے ہیں۔ وہ چھ تھے اور اسلحہ کے ساتھ پوری طرح لیس تھے۔ وہ اسی انتظار میں تھے کہ وہ کب آتے ہیں اور یہ اپنا کام کر کے وہاں سے نکل جائیں۔ انہوں نے وہاں سے نکلنے کے لیے پورا بندوبست کرلیا ہوا تھا۔

اس وقت جسپال سنگھ ان سے پوری طرح رابطے میں تھا۔ اس نے سردار رتن دیپ سے مدد تو کیا انہیں بتایا تک نہیں تھا کہ امرتسر کے نواح میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ چھ لوگ پنجاب کے مختلف شہروں سے جمع ہوئے تھے۔ دوپہر کے وقت وہ دربار صاحب پر ایک دوسرے سے ملے اور انہوں نے اس کا پلان کرلیا تھا۔

پارٹی کا بندوبست فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت سے ذرا فاصلے پر ایک لان میں گیا تھا۔ وہاں میزیں لگا دیں گئی تھیں۔ ضروری سامان رکھ دیا گیا تھا۔ ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ دھیمی روشنی تھی۔ کافی حد تک کیف آور ماحول بنا دیا گیا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی سب سے پہلے میزبان ہی کی گاڑی اس فارم ہاؤس میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلا ہی تھا اور وہ آتے ہی سارے انتظامات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کچھ دیر وہاں رہا اور پھر اندر چلا گیا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں وہاں دو گاڑیاں آ گئیں، اس میں سے تین مرد اور چار نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں۔ ان لڑکیوں نے بہت شوخ، مختصر اور بھڑکیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ وہ ہنستے، قہقہے لگاتے ہوئے رہائشی عمارت کے اندر چلے گئے۔ وہ کچھ دیر اندر رہے، پھر بھی باہر آ گئے۔ ان کا رخ اسی لان کی طرف تھا، جہاں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئیں تھیں۔ ان کے بیٹھتے ہی میوزک کی آواز کچھ زیادہ ہو گئی۔ وہ سیدھے اس میز کی جناب بڑھے جہاں شراب کی مختلف برانڈ کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہیں جام دھرے ہوئے تھے۔ ہر کسی نے اپنی پسند کی شراب سے جام بھرا اور ٹہلنے والے انداز میں بکھر گئے۔ یہ بڑے صبر آزما لمحات تھے۔

ان کی نگرانی کرنے والے چھ لوگ فارم ہاؤس کے اندر آ چکے تھے۔ یہاں پر ان کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا تھا۔ ان کے گمان میں تھا کہ وہ سب ایک جگہ بیٹھ جائیں گے تو ان پر حملہ کیا جائے گا لیکن وہ جوڑے جوڑے کی صورت میں بکھر گئے تھے۔ اب انتظار کے سوا چارہ نہیں تھا۔ سو وہ اپنی اپنی جگہ دب کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لان میں پھرتے ہوئے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ موت ان کے کس قدر قریب پہنچ چکی ہے۔

آدھا گھنٹہ اسی انتظار میں گزر گیا۔ وہ لوگ سرور میں آ چکے تھے۔ ممکن ہے وہ ٹہلتے ہوئے تھک بھی گئے ہوں، اس لیے ایک کے بعد ایک جوڑا آ کر اس میز کے گرد بیٹھنے لگا۔ جیسے ہی سب بیٹھ گئے۔ میزبان نے کھانا لگانے کا اشارہ کر دیا۔ ملازم شاید اسی انتظار میں تھے۔ وہ کھانا لگانے لگے۔ دس منٹ کے اندر کھانا لگ گیا۔ جیسے ہی انہوں نے کھانا شروع کیا۔ ملازم وہاں سے ہٹ گئے۔ ایسے میں وہ چھ کے چھ اچانک نکلے۔ لان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس وقت پتہ چلا جب وہ ان کے سر پر پہنچ گئے۔ تبھی انہیں میں سے ایک نے اٹھ کر اونچی آواز میں للکارتے ہوئے کہا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے، ایک برسٹ اس پر پڑا، جو اس کے سینے سے لے کر اس کے چہرے تک میں سوراخ کر گیا۔ فائرنگ کی آواز نے ماحول کو ہلا کر رکھ دیا تھا، چیخوں کی آوازوں سے وہاں ہلچل مچ گئی۔

(ان شاءاللہ تعالیٰ باقی آئندہ ماہ)

احساس

نسیم سکینہ صدف

زندگی ہزارہا رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کا ہر رنگ ایک نئی کہانی کا عکس ہوتا ہے۔ بعض رنگ اتنے گہرے اور سفاک ہوتے ہیں کہ وہ زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیتے ہیں۔

ایک عورت کا فسانہ' اس کی شخصیت دو کشتیوں میں سوار تھی۔

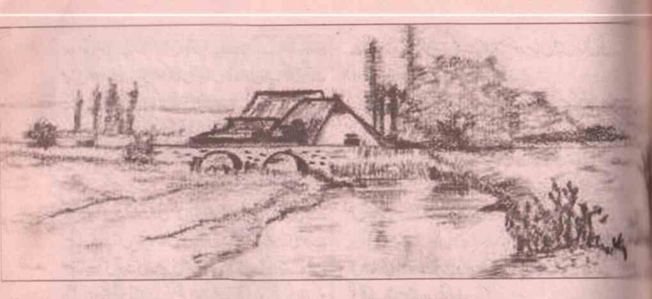

میں حسب معمول اسپتال کے شعبہ اضطراری کے دفتر میں بیٹھی تھی کہ نرس نے آ کر کہا۔

''ڈاکٹر صاحبہ آپ کا فون۔'' میں نے اٹھایا تو جانی پہچانی آواز آئی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! میں پروین (مسز محمود) بول رہی ہوں۔''

''فرمائیے کیا خدمت کروں؟'' میں نے احتراماً کہا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! اگر آپ کے پاس فرصت ہو تو ہماری ایک دوست ہیں' کبھی اسکول میں پڑھاتی تھیں ان کے سر میں بہت درد ہے' بہت تکلیف میں ہیں۔ آپ انہیں گھر آ کر دیکھ لیں۔'' میں نے ہامی بھر لی' اپنے کام سے فارغ ہو کر شام چھ بجے مسز محمود کے گھر پہنچ گئی۔ گھنٹی بجائی تو دروازہ کھلا' مسز محمود کی بجائے سینتیس اڑتیس سال کی ایک خاتون ساڑھی میں ملبوس میرے سامنے کھڑی تھیں۔ پتلا جسم' سانولا چہرہ' تیکھے نقوش' بڑی بڑی آنکھیں' میں تھوڑا جھجکی کیونکہ میں نے انہیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ خاتون نے شاید میری جھجک کو بھانپ لیا' بولی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! میں پروین کی سہیلی ہوں۔ آپ اندر آیئے۔''

''تو آپ بیمار ہیں؟'' میں نے استفسار سے کہا۔

''جی ہاں۔'' وہ بولی۔ ڈرائنگ روم میرا دیکھا بھالا تھا۔ مسز محمود اور اس کے بچے وہاں نہیں تھے۔

''آپ کا نام؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے عطیہ کہتے ہیں۔'' غم زدہ چہرے پر کچھ اجنبیت سی تھی۔

''سر میں کب سے درد ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا جواب میں عطیہ نے ساڑھی کے پلو میں منہ چھپا لیا اور صوفہ میں دھنس کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ منظر دیکھنے کی توقع نہ تھی میں کچھ سٹپٹا گئی اور پھر سوال کرتے ہوئے گفتگو کو آگے بڑھانا چاہا۔

''آپ کو کیا تکلیف ہے؟ سر کے کس حصے میں درد ہے؟ کچھ علاج کیا اب تک؟'' عطیہ نے سر اونچا کیا اور کہنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحبہ! پروین سے سنا تھا کہ آپ اس شہر میں بہت مشہور ہیں' بڑے بڑے وزیروں کی بیگمات کا علاج کرتی ہیں۔ میں تو غیر معروف فرد ہوں' ہے وقت آپ کے پاس میری کہانی سننے کا؟'' میں نے عطیہ کا چہرہ غور سے دیکھا' اس میں دکھ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

''میرا خیال ہے آپ کو کسی نسخے کی ضرورت نہیں۔ آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟'' عطیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ڈاکٹر صاحبہ آپ نے صحیح تشخیص کی ہے' میرے درد کا علاج یہی ہے کہ کوئی میری کہانی سن لے۔'' عطیہ کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

''ایک شام سمندر کے کنارے میں بغیر کسی مقصد کے ٹہل رہی تھی' جب ذرا رکی تو دیکھا سمندر کی لہریں اچھل اچھل کر ریت پر آتیں اور ریت کو دھو کر ایسا شفاف بنا دیتیں جیسے کسی معمار نے سنگ مرمر کے ذرات تراش کر سمندر کے کنارے بچھا دیے ہوں اور لہریں میرے پیروں کو چھو کر واپس جاتیں۔ مجھے ان لہروں پر پیار آ رہا تھا' لہریں اب میری ساتھی بن چکی تھیں شاید یہ لہریں اب میرے تمام چھپے ہوئے رازوں سے بھی واقف ہونا چاہتی تھیں۔ یہی معصوم لہریں میرے ہوسٹل کی تنہائیوں کا مضبوط سہارا تھیں' اس جنگل کے گاؤں اور ان لہروں پر مجھے بڑا یقین تھا۔ رات کو جب خاموشی ہوتی اور ہر پل سناٹا چھا جاتا تو یہ لہریں میرے کمرے کی کھڑکی سے نیچے ٹکرا ٹکرا کر شور کرتیں جیسے مجھے بلا رہی ہوں لیکن اب مجھے ان لہروں اور اس ماحول کو خیر آباد کہنا پڑا۔

اب مجھے شہر کی مصروف شہری زندگی سے نجات حاصل کر کے جب میں اس گاؤں میں بطور استانی مقرر ہوئی تو میں خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ سندھ کے اس جنگلی گاؤں میں کتنا سکون تھا لیکن اب مجھے پھر شہر میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ وہ شہر کے روکھے روکھے لوگ ہر طرف بھاگ دوڑ مجھے پھر اس کا سامنا تھا جس سے میں گریز کرنے کے لیے اپنا شہر چھوڑ کر آئی' ہوسٹل کا ڈرائیور عبدل تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا اور مجھے سلام کرتا ہوا گزر گیا۔

اچانک میری نظر وقار پر پڑی جسے میں ایک ماہ پہلے سمندر کے کنارے سے اٹھا کر لائی تھی' وقار بے چارہ اکیلا اداس میری طرح سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ مجھے بہت پیارا لگا' میں اسے ہوسٹل لے آئی اور وہ میرے ساتھ رہنے لگا' میں نے وقار کو ناشتہ دیا' اسے خشک مچھلی بہت پسند تھی۔ میں سوچ رہی تھی اب اگر میں یہاں سے چلی گئی تو وقار کو ناشتا کون بنا کر دے گا۔ کیا اسے کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں' جب میں نئی جگہ اور نئے شہر پہنچی تو تھکان کے مارے جسم ٹوٹ رہا تھا' ہڈیاں تھک گئی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے جو پلکوں پر اٹکے ہوئے تھے' میرا دل بوجھل تھا' مجھے ہر نئی چیز سے خوف آنے لگا۔ نہ جانے یہاں کیسے ماحول کا سامنا ہو' رونے کو دل چاہا مگر آنسو روکے بیٹھی رہی جب نئے ہوسٹل پہنچی تو لوگ ملنسار نکلے۔ ذرا ڈھارس بندھی' استانیاں مختلف جگہوں کی تھیں نواب شاہ' حیدر آباد اور سکھر سے۔ اب میں سندھی آہستہ آہستہ سیکھ رہی تھی' بول چال میں آسانی ہونے لگی۔ شہر کی گہما گہمی میں پرانے ہوسٹل کی خاموشی کو بدل دیا۔ کمرے کی ایک ساتھی لڑکی سکھر سے تھی' بہت خوش اخلاق تھی' مجھے ہر وقت ہنسانے کی کوشش کرتی' بار بار پوچھتی کہ تم اداس کیوں رہتی ہو' میں نے اس ماحول کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔

میں پاکستان انٹرنیشنل کڈز اسکول میں پڑھاتی تھی' پڑھے لکھے آزاد خیال لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ بعض لوگ اپنے مسائل اور حالات سنانے کے لیے آتے' گفتگو چلتی رہتی' اکثر جلد ہی گھل مل جاتے۔ میں بھی اسکول میں مقبول ہوتی جا رہی تھی' وقت گزرتا گیا' آہستہ آہستہ میری ملاقاتوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا' مختلف سرکاری و غیر سرکاری پارٹیوں کے دعوت نامے آنا شروع ہو گئے' میں اپنے ہوسٹل میں دیر سے آنے لگی۔ اب وقت دبے پاؤں

بھاگتا نظر آنے لگا' کہاں وہ گاؤں کے نزدیک سمندر اور وہ میری دوست لہریں اور کہاں یہاں کا ماحول' ایسا لگتا وقت کے ساتھ میں بھی بھاگ رہی ہوں۔

میری زندگی کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہوچکی تھی' ایک دن ایسی ہی ایک محفل میں مجھے محسوس ہوا کہ ایک صاحب مجھے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا تصور بھی نہ تھا کہ کوئی بھی اس عمر میں مجھ میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ میں سترہ سال کی جوان نہ تھی اور کچھ ایسی خوب صورت بھی تو نہ تھی۔ میری عمر تو اب پختگی کے دائرے میں داخل ہوچکی تھی' میں نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی اس کو خاص اہمیت نہ دی اور نہ ہی کوئی بات آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ ابھی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا اور وہ تاجر تھا۔ اس تک پہنچنا تو خواب وخیال میں بھی ممکن نہ تھا۔ اچانک اس نے مڑ کر میرا نام پوچھا اور ساتھ ہی سوال بھی کیا ''کیا کرتی ہو؟'' جواب سن کر اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

''مجھے ایک نجومی نے بتایا تھا کہ تمہیں ایک بار پر ایک شادی شدہ عورت سے محبت ہوگی۔'' پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی در و دیوار بھی ہنسنے لگے' سارا ڈرائنگ روم ہنسنے لگا۔ مجھے ایسا لگا میرا جسم تپ رہا ہے۔

خالد درمیانے قد کا تھا' گٹھا ہوا جسم' بھیگی مونچھیں' کنپٹی پر سفید اور کالے بالوں کا امتزاج' جیسے مغرب کے وقت غروب ہوتے ہوئے سورج کی سفید شعائیں اور کالی لکیریں مل جاتیں مگر ان سب چیزوں میں کوئی کشش تھی اگر کشش تھی تو اس کی آنکھوں میں۔ ایسی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھی تھیں' گہری نیلی اور وہ آنکھیں میری روح میں پیوست ہوتی جارہی تھیں۔ ان آنکھوں میں معصومیت بھی تھی اور شیطانیت بھی تھی پھر مسکراہٹ' جس میں معنی خیز جاذبیت بھری ہوئی تھی۔ میں ان آنکھوں کے سحر میں کچھ بھول گئی' مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں ایک بیوی ہوں اور ایک ماں ہوں' ان آنکھوں نے میرے دل میں اس کی محبت کو جگادیا۔ جس کا میں مدتوں سے انتظار کررہی تھی' اس محبت کا جو منظور میاں بیس سال کی ازدواجی رفاقت میں بھی نہ دے سکے۔

وہ محبت جس کا اظہار مشرقی عورت کے لیے گناہ ہے' میں ان جذبات میں کھوئی ہوئی تھی کہ خالد نے مڑ کر پوچھا۔

''تم مجھے کس نام سے پکارو گی؟'' اور میرے منہ سے نکل گیا۔

''صاحب......''

ہماری ملاقات گھریلو اور سرکاری پارٹیوں میں ہونے لگی' ایک شام میں نے کہا۔

''خالد! مجھے کسی کی تحریر دیکھ کر اس کی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں مہارت حاصل ہے' تم لکھ کر دکھاؤ۔'' خالد مسکرایا اور اس کاغذ پر کچھ سطریں لکھ دیں۔ اس شام وہ گاڑی میں آیا مجھے سیر کے لیے چلنے کو کہا اور بولا۔

''ہاں عطیہ! بتاؤ میری لکھائی سے کیا پتا چلا؟ بتاؤ میں کیا ہوں؟ کیا مستقبل ہے میرا؟'' میں نے کہا۔

''تم گاڑی روکو تو بتاؤں گی۔'' ہم سمندر کے کنارے رکے تو شام ہوچکی تھی۔

میں نے اپنا تجزیہ بتادیا' خالد بہت متاثر ہوا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک کمی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ عورتیں میری کمزوری ہیں۔'' میں یکدم سناٹے میں رہ گئی۔ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اس قدر دیدہ دلیری سے ایسی بات کہہ دے گا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے مجھے میرے ہوسٹل میں چھوڑ دیا' ایک ہفتہ بعد میں نے خالد کو فون کیا۔

''میں واپس لاہور جارہی ہوں' گھر والوں سے ملے ہوئے دیر ہوگئی ہے۔''

دو دن بعد وہ میرے ہوسٹل کے سامنے کھڑا تھا' ہم جنگل میں گاڑی چلاتے ہوئے کوسوں دور چلے گئے اور کہا۔

''ہاں ادھر لاؤ۔'' اور اس نے میرے ہاتھ میں جہاز کے دو ٹکٹ تھمادیئے۔

''جاؤ فیملی سے مل آؤ۔'' میرے ہاتھ اس کے ہاتھ

سے ٹکرائے' بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں نے خالد کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

''یہ تم کیا کررہے ہو؟'' اس نے میری ہتھیلی کو چوما' پھر میرے ماتھے پر پیار کیا اور کہا۔

''یہ تو میں اس دن سے کوشش کررہا ہوں جس دن سے تمہیں دیکھا۔''

اس رات میں سونہ سکی' دماغ کچھ کہہ رہا تھا ضمیر کچھ اور دل کچھ اور پتا نہیں خالد کو دیکھ کر میرے دل میرے جسم میں بجلی کی لہر کیوں دوڑ جاتی تھی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی' دو دن بعد وہ مجھے ایک ہوٹل میں نظر آیا۔ میں نے کوشش کی کہ آنکھ ملا کے نہ دیکھوں' ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ بغیر کسی بات کے اس نے میرا بیگ اٹھایا اور کار میں رکھ دیا' اس نے مجھ پر کیا جادو کردیا تھا میں اس کے ساتھ لاشعوری طور پر کار میں بیٹھ گئی۔ میری ذہنی کیفیت کیا تھی اس کا مجھے کچھ اندازہ نہ تھا۔ لاشعور اور شعور سب گڈمڈ ہورہے تھے۔

میں ان میں تمیز کرنے سے قاصر تھی جب میں ہوش میں آئی تو ہم شہر کی حدود پار کرچکے تھے' جنگل کے درمیان وہ ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا اس نے گاڑی ایک جگہ روکی اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا ان کا بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے میرے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کردی' میری حالت میرا دل میرا جسم کوئی بھی چیز میرے قابو میں نہ تھی۔ میں کس مقام پر تھی اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ میرا تمام جسم انگارے کی طرح دہک رہا تھا' اس کی لو خالد کے چہرے پر پڑرہی تھی اس کے بعد ہم اس مقام پر تھے جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ اگلے دن وہ مجھے ائرپورٹ چھوڑنے آیا۔

''جلد واپس آنا' یہ آنکھیں تمہارا انتظار کریں گی۔'' یہ الفاظ اس نے انگریزی میں کہے جس سے عجب سا لطف ابھرا تھا۔

میں لاہور ائرپورٹ پر اتری تو جواد درخشاں اور منظور میاں کو دیکھ کر خوشی ہوئی' منظور میاں دو چار دن تو خوش نظر

AANCHALPK.COM
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ماہنامہ آنچل کراچی
ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول' ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
ٹوٹا ہوا تارا
امید وصل اور محبت پر کامل یقین رکھنے والوں کی ایک دل نشیں پر خوشبو کہانی سمیرا شریف طور کی زبانی
شب ہجر کی پہلی بارش
محبت و جذبات کی خوشبو میں بسی ایک دلکش داستان نازیہ کنول نازی کی دلفریب کہانی
موم کی محبت
پیار و محبت اور نازک جذبوں سے گندھی معروف مصنفہ راحت وفا کی ایک دلکش و دل ربا نایاب تحریر
AANCHALNOVEL.COM
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (021-35620771/2)

آئے مگر اس کے بعد اپنے طور طریقوں کی طرف پلٹ گئے۔ چھٹیاں جلد گزر گئیں، میں واپسی پر جہاز پر سوار تھی۔ فیصلے کا وقت قریب آتا جارہا تھا، خالد کا چہرہ سامنے تھا۔ سندھ، جنگل، سمندر، آنکھیں...... میں نے جذبات کو قابو میں رکھنا چاہا میں نے سوچا میں کام میں خود کو اس قدر مشغول کرلوں گی کہ ماضی فراموش ہوجائے۔ میں ضرور کوشش کروں گی، ضرور کروں گی۔

صرف دو دن ہی گزرے تھے کہ میں نے خالد کو فون کیا، وہ شام کو آیا ہم دونوں ہوٹل کھانے کے لیے گئے۔ ہوٹل میں رومانوی ماحول تھا، خالد آج سنجیدگی کے موڈ میں تھا، اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سونے کے چار چار کنگن میری کلائیوں میں چڑھادیے اور بولا۔

''عطیہ یہ میرا بندھن ہے اب تم ان کے ساتھ مجھ سے بندھ چکی ہو میں تم سے پیار کرتا ہوں۔'' میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے ایسا تانتا بندھا ہوا تھا کہ رکتے نہ تھے۔ یہ بات منظور میاں نے بیس سال کی رفاقت میں بھی نہ کہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں کیا سن رہی ہوں، میں نے خالد کے ہاتھوں کو چوما اور واپس آگئی۔

نئے اسکول کھلنے کے بعد کام بہت بڑھ گیا تھا، چھٹیاں جلد آگئیں اور میں گرمیوں میں لاہور پھر واپس آگئی، جواد تیزی سے جوان ہورہا تھا۔

درخشاں بھی بالغ ہوچکی تھی، منظور کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اسی طرح زرخرید غلام سمجھتے رہے جیسا برسوں سے سمجھتے آرہے تھے لیکن انہیں بھی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ عطیہ کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہے۔ جواد بہت دنوں سے مصر تھا میں کراچی جانا چاہتا ہوں اور وہاں میری پڑھائی کا بندوبست کیا جائے، میں نے خالد کو فون کیا اور اپنے پروگرام سے مطلع کیا۔ ہم کراچی اپریل کے آخر میں پہنچے۔ رات میں خنکی تھی، بہار کی آمد تھی خالد ائرپورٹ پر موجود تھا وہی مسکراہٹ، وہی آنکھیں، جواد، میں اور خالد کراچی میں کئی علاقوں کی سیر کرتے رہے، ہر طرف سبزہ، پھول، رنگینی، بہار کا سماں۔ خالد، جواد کی موجودگی میں میرے زیادہ قریب نہ آسکا، کبھی کبھی اسی وجہ سے اس کا رویہ مختلف نظر آنے لگا۔

شام کے کھانے کے بعد خالد میرے کمرے میں آیا اور اچانک عطر کی پوری شیشی میرے کپڑوں پر انڈیل دی اور بولا۔

''عطیہ میں تمہاری عصمت اور عزت کا محافظ ہوں۔''

یہ حسین وقت بھی جلد گزر گیا۔ منظور میاں سے ازدواجی تعلقات ایک عرصہ سے خراب تھے، ان کو تو ایک ہی کام سے غرض تھی، جنسی اختلاط اور اس کے بعد باورچی خانہ نہ جذبات اور نہ محبت۔ عطیہ ان کے لیے ایک مشین تھی، پیسہ کمانا اور ان کو بھیجنا اور ان کا حکم بجالانا، اس جمود میں کوئی انقلاب آئے تو منظور میاں اس کو قبول کرنے کے قابل نہ تھے۔ جواد جوان ہورہا تھا، اس کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ ابو اور امی میں شادی کی کمزور رسّی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ جواد کو اس انتخاب میں بہت مشکل پیش آرہی تھی اگر ابو اور امی میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو اس کی محبت کا کیا بنے گا۔

درخشاں بھی اکثر خلا میں گھورتی رہتی شاید وہ اس بات کا انتظار کررہی تھی یا اندازہ کررہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ میرا دل و دماغ فیصلہ کرنے سے انکار کررہا تھا، اگلے دن جہاز میں سوار ہونا تھا منظور میاں کا موڈ بہت خراب تھا۔ رات کے کھانے کے بعد منظور میاں نے محبت کی زبان بولنے کی کوشش کی، میرا دل و دماغ کہیں اور تھا بات بڑھ گئی۔ میرے انکار سے ان کا درجہ حرارت شوٹ کرگیا۔

''جاؤ چلی جاؤ، تم جیسی بازاری عورتیں سڑک پر بہت ملتی ہیں۔'' پھر آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا، نہ جانے کب جہاز پر سوار ہوئی اور کب درخشاں اور جواد کو خیرباد کہا۔ جہاز کا رخ پھر اسی کراچی کی طرف تھا جہاں خالد کی آنکھیں میرا انتظار کررہی تھیں۔ میں دوراہے پر کھڑی تھی مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ یہ کشتی کس کنارے لگے گی۔ درخشاں اور جواد کو چھوڑ دوں، منظور میاں کو چھوڑ دوں، اولاد اور بیس سال کی رفاقت کیسے چھوڑ دوں۔ جواد بھی کوئی بچہ نہیں تھا، اسے احساس تھا کہ امی کس مشکل میں ہیں مگر سامنے وہ بھی کچھ نہ کہتا تھا۔

دو راتیں بہت کوفت میں گزریں، مجھے کام سے پیار تھا۔ اگلے دن صبح میں نے خالد کو فون کیا، میری آنکھوں میں آنسو تھے میری آواز کپکپا رہی تھی۔

''خالد...... خالد میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں واپس جارہی ہوں۔'' پھر میں نے فون بند کردیا۔

شام کو خالد مجھے لینے آیا، مجھے اپنے سامنے بٹھایا وہ بہت سنجیدہ تھا اس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی اس نے بیگ سے ایک خوب صورت سلکی ساڑھی نکالی اور کہا۔

''اسے پہنو اور میرے ساتھ آؤ۔'' تاروں بھری رات تھی، ہم دونوں ایک وادی میں چلے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھ سے دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

''تم جارہی ہو میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن ایک بات یاد رکھنا میں نے تم سے ہر جگہ، ہر موسم میں ہر شہر میں محبت کی ہے اور جب تک میں زندہ رہوں گا اگر پوجنا حرام نہیں ہے تو میں تمہیں پوجوں گا۔ میں تم سے پیار کرتا رہوں گا۔'' میرے دل و دماغ میں میرے پورے جسم نے رونا شروع کردیا۔ پھر اس نے ساڑھی کا پلّو اٹھا کر میرا سر ڈھکا اور دعا کی۔

''اے پروردگار! ایک روز میری عطیہ کو مجھ سے ملادے تو ہر چیز پر قادر ہے۔'' ہم کار میں بیٹھے میری اور خالد کی آنکھیں لال ہورہی تھیں۔ نہ جانے کب ہوسٹل آیا نہ جانے کیسے راستہ کٹا۔ خالد نے خاموشی سے کار کا دروازہ کھولا اس نے مڑ کر نہیں دیکھا وہ گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہوگیا۔

اگلے دن میں لاہور واپس آگئی جواد اور درخشاں ائرپورٹ پر موجود تھے، منظور میاں کے چہرے پر اطمینان تھا۔ میں نے سوچا آخر یہ مرد میرا گناہ کیسے معاف کرے گا۔

''کیسا گناہ...... کون سا گناہ...... عطیہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ محبت کو گناہ نہیں کہتے۔'' میں کسی گہرے خواب سے بیدار ہورہی تھی۔ میں حقیقت کو کیسے چھپاؤں، محبت کی یادوں کو کیسے بھلادوں، وہ جنگل میں میری کتنی یادیں دفن ہیں۔ میری زندگی کا خوب صورت موڑ اس کا انجام صرف میرے آنسو ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ کے پاس کوئی درد کی گولی نہیں؟ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔''

''عطیہ! تمہیں کسی گولی کی ضرورت نہیں، تمہیں کسی کندھے کا سہارا چاہیے وہ شخص چاہیے جو تمہاری کہانی سن سکے۔''

''ڈاکٹر صاحبہ اگر برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔ آپ کی آنکھیں بہت گہری ہیں ان میں کوئی راز چھپا ہے؟''

''عطیہ میری آنکھیں گہری ضرور ہوں گی، ہاں ان میں بھی راز چھپے ہیں مگر یہ نیلی نہیں کالی ہیں۔'' میں نے دروازہ بند کیا اور اسپتال واپس آگئی۔

خالد آج بھی کراچی میں تاجر ہے اس کی دونوں بیٹیوں کی شادی ہوچکی ہے۔ عطیہ اب بھی لاہور میں رہتی ہے، وہ بھی تین نواسیوں کی نانی بن چکی ہے اور میں آج بھی لاہور میں ہوں اور میرا عملِ جراحی جاری ہے۔

☆☆مسکراہٹیں☆☆

شیخ کے گھر سے چوہا باہر جارہا تھا۔
"شیخ! کیا لے کر جارہے ہو؟"
چوہا "بھائی بھوکا مرنے سے تو بہتر ہے بندہ ہجرت کرجائے۔"

ایک دوست اپنے ہاتھ پر بلیڈ سے لڑکی کا نام لکھ رہا تھا کہ اچانک زور زور سے رونے لگا۔
دوست "پیار کرتا ہے تو روتا کیوں ہے؟"
دوست! "یار اسپیلنگ غلط ہوگئی ریحانہ ملک کی جگہ رحمان ملک لکھ دیا۔"

☆☆ارشد علی......لاہور☆☆

اسیر غم

مہر پرویز احمد

جاگیردارانہ سماج میں عورت کی حیثیت غلام کی سی ہوتی ہے' اس کے نہ جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات' اسے صرف اور صرف مٹی کا مادھو سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ سچی کہانی ہمارے دیہی سماج کے ہر گاؤں کی ہے' جہاں بیٹیوں پر غیرت کے نام پر ہر ظلم روا سمجھا جاتا ہے۔

سائیں قادر کو اللہ تعالیٰ نے علاقے میں بڑا نام دیا تھا' وہ تھا بھی بڑا رحم دل' ہر دلعزیز' غریبوں کا خیال رکھنے والا۔ اعلیٰ ظرفی اور غریب پروری کی وجہ سے پورا علاقہ اس کو انتہائی عزت و احترام سے دیکھتا تھا اس کا ہر حکم سر آنکھوں پر رکھا جاتا۔ علاقے میں کوئی بھی مسئلہ پیدا ہوتا اس کا فیصلہ سائیں کے ڈیرے میں ہوتا۔ اس کے حکم کی خلاف ورزی کا سخت بُرا منایا جاتا کیونکہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ فریقین کو مکمل انصاف دیا جاتا یوں اس کے انصاف کا چرچا بھی ہر خاص و عام کی زبان پر جاری تھا۔ ہر مسئلے کا حل سائیں کے ڈیرے پر موجود تھا' یوں اس کی شہرت کو چار چاند لگے ہوئے تھے لیکن برادری کے کچھ لوگ اس کے خلاف بھی باتیں کرتے تھے مگر جسے اللہ تعالیٰ عزت دے اسے کوئی شخص چھین نہیں سکتا اور نہ ہی کمی بیشی کر سکتا ہے۔

پورے علاقے کے لوگوں پر اس کا اثر و رسوخ دیکھ کر سیاستدان بھی اکثر اس کے ڈیرے کا طواف کرتے یوں اس کی عزت اور اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ سیاستدانوں کا بھی وقت اور فاصلہ بچ جاتا' در در کی ٹھوکریں کھا کر ووٹ مانگنے کی صعوبت سے جان چھوٹ جاتی۔ صرف سائیں کی حمایت پانے سے ان کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ اخراجات بھی کم ہوتے اور ووٹ بھی توقع سے بڑھ کر ملتے یوں سائیں کی حمایت کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا۔ گاؤں کی گلیوں' بازاروں سے لے کر اقتدار کے ایوانوں تک اس کے نام کا چرچا تھا۔

اس نے بھی اپنے کردار' گفتار' اخلاق' انسانیت' شرافت اور انصاف کی بنا پر اپنی شہرت کی حرمت کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ کوئی بھی حریف آج تک اس کو نیچا نہ دکھا سکا تھا۔ برادری کے لوگ اس کی شہرت سے نالاں تھے' اکثر دبے لفظوں میں اس کی شکایت بھی کرتے لیکن اس کے فیصلے کے خلاف بولنے کی جرأت نہ رکھتے تھے اور ویسے بھی اس کی برائی کیا کرتے' بغاوت پر لوگوں کو کیسے اکساتے وہ تو خلوص و شرافت کا پیکر تھا۔

برادری کے کم ظرف لوگ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے کہ سائیں کی کوئی کمزوری ان کے ہاتھ لگے لیکن وہ ہمیشہ ناکام رہتے پھر سائیں کے انصاف کو چیلنج کرنے کا موقع انہوں نے خود پیدا کر دیا۔ محسن نامی نوجوان سائیں کے قریبی عزیز وڈیرے سلیم کا سرکش بیٹا تھا۔ وڈیرہ سلیم اندر ہی اندر سائیں قادر کا سخت مخالف تھا مگر حرف مدعا زبان پر نہ لاتا تھا۔ منہ پہ سائیں کی تعریف کرتا' پیٹھ پیچھے برائی کرتے نہ تھکتا۔ ہمیشہ اس کی شہرت سے جلتا اور کڑھتا رہتا۔

محسن اوباش قسم کا نوجوان تھا' اکثر گاؤں کی لڑکیوں کے راستے میں کھڑا ہو کر آواز کستا' کام کرتا نہیں تھا۔ چوری چکاری اس کا پیشہ تھا' نکھٹو بے کار لوگوں کی فوج ظفر موج پال رکھی تھی۔ نالائق لوگوں کا میلہ ہمیشہ محسن کے ڈیرے پر لگا رہتا۔ خوب موج میلہ مستی ہوتی' چرس' بھنگ اور شراب کے دور چلتے وہیں پر بیٹھ کر چوری ڈکیتی کے پروگرام بنائے جاتے۔ پورے علاقہ کو انہوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ کوئی امیر غریب ان کے شر سے محفوظ نہ تھا' ان کا اوڑھنا' بچھونا بے عزتی تھی' اس لیے کوئی بھی غیر اخلاقی کام کرتے ہوئے رائی برابر نہ گھبراتے۔ لوگوں کو تنگ کر کے' ان کو سکون ملتا تھا۔

کسی بھی شخص کی عزت مال' جان ان کے شر سے محفوظ نہ تھی' ایسے شر پسند کو رشتہ دینا گویا لڑکی کو زندہ درگور کرنے کے مترادف تھا۔ اسی لیے ابھی تک کنوارا تھا' والدین نے اپنی بھرپور کوشش کی مگر کہیں بھی بات نہ بنی۔ جس شخص کے پیچھے چوبیس گھنٹے پولیس لگی ہوئی ہو' شرافت سے دور دور کا واسطہ نہ ہو' ہر شخص سخت نفرت کرتا ہو اس کو بیٹی کا رشتہ کون دیتا جب والدین نے ہر طرف کوشش کر کے دیکھ لی کہیں سے بھی مراد بر نہ آئی تو وہ لوگ مایوس ہو گئے اور محسن کو بھی صورت حال سے آگاہ کیا اور کرتوت چھوڑنے کی تلقین کی۔

''جب تک یہ بُرے دھندے' گندی عادات ترک نہیں کرو گے کوئی تمہیں منہ نہیں لگائے گا۔''

محسن بھلا کب اپنی روش بدلنے والا تھا' اس نے معاشرے سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور اس کا ہدف معاشرے کا ایک پسماندہ شخص رحمت تھا جو سائیں قادر کا مزارع تھا' ایک جوان خوب صورت' سلیقہ شعار بیٹی کا باپ تھا جس کی غربت کی کشتی بے بسی کے گرداب میں پھیرے لے رہی تھی اور وہ مدتوں سے اس کو نکالنے کے لیے تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔

ایک دن اپنے چند اوباش ساتھیوں کے ہمراہ محسن نے رحمت کی جوان بیٹی کو زبردستی اغواء کر لیا' پورے گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ ہر کوئی اس ظلم پر اشکبار تھا' لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کر رہے تھے۔ اک مجبور بے بس غریب آدمی کو دکھوں کے پہاڑ تلے دبا دیا گیا۔ زندگی کی بقیہ سانسوں کو اجیرن بنا دیا گیا۔ سکھ سے اس کا ناتہ توڑ دیا تھا' ایسے ظلم پر تو سات آسمانوں کے اوپر بیٹھا ربّ ذوالجلال بھی جوش میں آجاتا ہے۔ زمین پر اس کی وحدانیت کا اقرار کرنے والا اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہر غریب و مجبور کو گھر کی دہلیز پر انصاف پہنچانے والا سائیں قادر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ اتنا بڑا ظلم اس کے گاؤں میں ہوا اور سائیں خاموش

رہے یہ بھلا کیسے ممکن تھا جونہی سائیں کو پتا چلا وہ رحمت کے گھر پہنچ گیا' دکھ درد بٹانے لگا ہر طرح اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور پھر اس نے اصل صورت حال دریافت کی تو رحمت بولا۔

''وڈیرہ سلیم ایک دن میرے گھر آیا' گھر بار کا احوال پوچھنے کے بعد یوں گویا ہوا'' رحمت تم جانتے ہو میں سائیں قادر کا قریبی عزیز ہوں' ہمارا علاقے میں بڑا نام ہے کسی میں ہمارے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں۔ عزت دولت' شہرت کون سی نعمت ہے جو اللہ نے ہمیں نہیں دی۔ ڈیرے اور حویلی میں ملازم کام کرتے ہیں' کسی چیز کی کمی نہیں۔ میرا بیٹا محسن لا اُبالی بہت ضدی قسم کا نوجوان ہے جو بات منہ سے نکالتا ہے اسے پورا کر کے دم لیتا ہے۔ ہم نے کئی جگہ اس کی شادی کی بات کی ہے مگر وہ مانتا ہی نہیں وہ آپ کی بیٹی کو پسند کرتا ہے اسے اپنانا چاہتا ہے۔ اگر وہ اسے نہ ملی تو وہ خودکشی کر لے گا' وہ نجمہ کے بغیر نہیں جی سکتا۔ وہ اسے رانی بنا کر رکھے گا' اپنی تمام بُری عادات چھوڑ دے گا اس کا تابعدار بن کر رہے گا۔ ان کی جوڑی مثالی ہوگی۔ ہم آپ کی بیٹی کی جھولی خوشیوں سے بھر دیں گے' اس کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیں گے۔ اس کی تمام خواہشات پوری کریں گے' ہمارے گھر میں وہ راج کرے گی۔ ہم آپ کے تمام مطالبات پورے کریں گے آپ سے جہیز لینے کی بجائے آپ کو جہیز کے لیے منہ مانگی رقم دیں گے۔ آپ کی بیٹی کے نام رقبہ لگوائیں گے' شہر میں کوٹھی لے کر دیں گے۔ زندگی کے ہر دکھ درد میں آپ کا ساتھ دیں گے' ہماری وجہ سے کوئی آپ کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ آپ کے مکان پر برسوں سے منڈلاتے غربت کے بادل ہمیشہ کے لیے چھٹ جائیں گے۔ خواہشات کی چکی میں پسنے کی بجائے سکھ کی چھاؤں میں سکون سے بیٹھو گے۔ دکھوں' پریشانیوں اور روزی کی تنگی سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا جاؤ گے۔''

''میں اگرچہ غریب آدمی ہوں لیکن ایک نوجوان بیٹی کا باپ ہوں' زندگی کی کتنی ہی گرم و سرد شامیں گزار چکا ہوں' حقیقت کے عفریت سے کئی بار پالا پڑ چکا ہے۔ زمانے کے اونچ نیچ سے اچھی طرح آگاہ ہوں' میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ مخمل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ میرے پاس جتنا مرضی پیسہ آ جائے' میں پھر بھی بے نام ہی رہوں گا کیونکہ غریب کا نہ کوئی نام ہوتا ہے نہ مقام' ذات پات' برادری کچھ بھی نہیں ہوتا۔ غریب تو صرف دوسروں کی خدمت کے لیے پیدا ہوتا ہے اس کو پیدا کر کے امیروں کو ہنسنے مسکرانے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ غریب کی مجبوری' بے بسی وڈیروں کے لیے سکون اور راحت کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وڈیرے مجبوروں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر جب ان کو نشان عبرت بناتے ہیں تو ان کو روحانی خوشی ہوتی ہے۔

غریبوں کو رات کو نیند میں سنہرے خواب نہیں آتے' اب مجھ کو دن میں خواب دکھا رہے ہیں۔ محسن کی بجائے اگر میں اپنی جیتی جاگتی بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکا دے دوں تو یہ اس پر احسان ہوگا۔ ایک ہی دفعہ مر جائے گی اور زندگی سے جان چھوٹے گی۔ محسن تو اس کو روزانہ موت کے حوالے کرے گا مگر مرنے نہیں دے گا۔ میری بیٹی موت کے حصول کے لیے بھی محسن کی محتاج ہوگی۔ میں اس کو بے بسی سے مرتے نہیں دیکھنا چاہتا' میں غریب ہوں مجھے غریب ہی رہنے دیں۔ یہ کٹیا ہی میرا محل ہے' مجھے اور میری بیٹی کو اسی میں زندگی کی بقیہ سانسیں پوری کرنے دیں۔ مجھے زر و جواہر کے بھاری پتھروں سے مت کچلیں' میری بیٹی کسی بھٹے پر اینٹیں تو تھاپ سکتی ہے مگر آپ کی حویلی کا نرم مخملی پلنگ اس کے نصیب میں نہیں۔ یہ تو خود ملازمہ ہے یہ کسی خادمہ پر کیسے حکم چلا سکتی ہے' وڈیرا سائیں! مجھے اس نگری میں مت آباد کریں جہاں اندر جانے کا تو راستہ ہے مگر باہر نکلنے کا نہیں۔''

یوں منت سماجت اور اپنی اوقات بتا کر میں نے وڈیرے سائیں سے معذرت کر لی لیکن میرے انکار کی گستاخی وہ برداشت نہ کر سکا اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا یہاں سے چلا گیا پھر تھوڑے ہی دن گزرے ہیں کہ دن دہاڑے میری بیٹی کو اغواء کر لیا گیا اور اغواء کرنے والا سائیں سلیم کا بیٹا محسن تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے نجمہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی یا سائیں قادر کو بتایا یا دیگر کوئی قانونی چارہ جوئی کرنے کی کوشش کی تو وہ ہماری کٹیا کو آگ لگا دے گا۔ یہ بھی دھمکی دی کہ میں الزام لگا دوں گا کہ دو لاکھ روپے میں نجمہ کو اس کے باپ سے خریدا ہے۔ گواہوں کی میرے پاس کمی نہیں' تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اب نجمہ کو بھول جاؤ یہ محسن کی امانت تھی جو واپس لے کر جا رہا ہے۔

''اب یہ محسن کی عزت ہے' وہی اس کو پاس رکھے گا اب تمہاری ذمہ داری ختم اور محسن کی ذمہ داری شروع ہوگئی ہے۔ اب اس کے دکھ درد' خوشی غم کا ساتھی محسن ہے۔''

محسن اور وڈیرے سلیم کے خلاف کس سے فریاد کروں' کس سے انصاف مانگوں۔ اپنے ارمانوں کا کہاں ماتم کروں' کون ہے جو مجھ پر ترس کرے' مجھے انصاف دے' مجھے میری بیٹی واپس دلا دے۔''

رحمت کی روداد سن کر اسی شام سائیں قادر نے وڈیرے سلیم کو ڈیرے پر بلوایا' محسن کے ظلم کی بات کی تو وڈیرا سیخ پا ہو گیا۔ بیٹے کی صفائی دینے لگا اور اس کی شرافت اور معصومیت کے گن گانے لگا۔

''اگر محسن نے غلطی کر لی ہے تو ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے' بچہ ہے نادان اور ناسمجھ ہے۔ آپ کا بھی عزیز ہے' جوانی کے جوش میں اگر اس سے غلطی سرزد ہوگئی ہے تو آپ درگزر کریں' رحمت کو مطمئن کریں' میں تلاش میں لگا ہوں جونہی ملتا ہے میں اس سے لڑکی واپس لے کر آپ کو دوں گا۔ آپ تسلی رکھیں' میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔'' سائیں قادر اور وڈیرے سلیم کے جواب سے مطمئن نہیں تھا' وہ اپنے انصاف کی لاج رکھنا چاہتا تھا' اپنا کردار داغ دار اور انصاف کا قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ فیصلہ وہ مثالی کرنا چاہتا تھا صرف لوگوں کے لیے منصف نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ اپنی ذات پر بھی فیصلوں کا اطلاق کرنا چاہتا تھا'

حکمت کی باتیں

+ جب زمانہ امن کا ہو اور حالات جنگ جیسے ہو تو سمجھو عذاب ہے۔

+ جو سوچو گے وہی پالو گے اس لیے اپنی سوچ مثبت اور تعمیری رکھیں۔

+ بامقصد زندگی انسانیت کا پتا دیتی ہے۔

+ یادیں ماضی کا حسن اور مستقبل کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

+ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے لیکن سچا دوست بننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

+ تعلیم انسانیت بخشتی ہے لیکن بہت کم لوگ اس کی حقیقت سے باخبر ہیں۔

+ کسی انسان کا پہلا پیار بننا کوئی بڑی بات نہیں بننا ہے تو کسی کا آخری پیار بنو۔

فیاض اسحاق مہانہ...... سلانوالی

سو وہ حق کے لیے ڈٹ گیا اور پھر ایک ایسا فیصلہ کیا جو سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل تھا۔ اس نے وڈیرے سلیم کو دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا۔

"میں تم کو دو دن کا وقت دے رہا ہوں' اگر تم نے اس مدت کے دوران رحمت کی بیٹی واپس کردی تو ٹھیک ہے وگرنہ میں تیری بیٹی کا نکاح رحمت کے بیٹے سے کردوں گا۔"

یہ سننا تھا کہ وڈیرے سلیم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہ غصے میں آگ بگولا ہوگیا' تھرتھر کانپنے لگا مگر مجبور تھا۔ اتنی جرأت نہ تھی کہ سائیں کو انکار کرتا۔ سو غصے میں لال پیلا ہوتا گھر کو روانہ ہوگیا۔ گھر جاتے ہی رونا دھونا شروع کردیا تمام صورت حال گھر والوں کو بتائی۔ سائیں کے فیصلے کو ظالمانہ اور دشمنی پر مبنی قرار دیا جو منہ میں آیا سائیں کے خلاف بولا۔ برادری کا دشمن قرار دیا' رحمت کو بھی بُرا بھلا بولا اور فیصلے کو سازش قرار دیا۔

وڈیرے سلیم کی بیٹی کی منگنی سائیں کے بیٹے جواد سے کی گئی تھی' اب یہ سائیں کی غربت پروری اور اپنے انصاف کی انتہا تھی کہ اس نے اپنے بیٹے اور بہو کی بھی پروا نہ کی اور اپنا فیصلہ وڈیرے سلیم پر ٹھوس دیا۔ وڈیرا سلیم سخت مشکل میں پھنس گیا تھا اور اب بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔

رات کو دونوں میاں بیوی نے جواد کو بلوایا اور سائیں کے فیصلے کے بارے میں اس کو بتایا۔ رحمت سے سائیں کی ہمدردی کے بارے میں بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں کیں' رو دھو کر اور بہت سی اچھی بُری باتیں بتا کر بیٹے کا دشمن ثابت کیا۔ اس کی خواہشات اور ارمانوں کا قاتل قرار دیا اور زور لگا کر یہ باور کرایا کہ

"سائیں تمہاری شادی کرنا ہی نہیں چاہتا' اس کو آپ سے ذرّہ برابر محبت نہیں اگر وہ آپ کو بیٹا سمجھتا تو یہ آپ کی بیوی کے بارے میں باتیں نہ کرتا۔"

جواد سخت غصے میں گھر گیا اور وہاں ہنگامہ کھڑا کردیا' سائیں کے بارے میں جو زہر وڈیرے سلیم اور اس کی بیوی نے اس کے ذہن میں بھرا تھا وہ وہاں جاکر اُگلا اور اپنے باپ سے بغاوت پر اتر آیا۔ سائیں کو یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا جواد کو قریب بٹھا کر بڑے پیار سے سمجھایا۔

"بیٹا! میں نے صرف بات کی ہے اور وڈیرے سلیم کو اتنا دکھ ہورہا ہے اور وہ سخت غصے میں ہے۔ مرنے مارنے پر تل گیا ہے' تم کو میرے خلاف بھڑکایا ہے' ہم باپ بیٹے میں دراڑ ڈالنے کی کوشش کررہا ہے۔ نجمہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے' رحمت بھی تو بیٹی کا باپ ہے۔ وہ بھی وڈیرے سلیم کی طرح غیرت مند ہے' اس کو بھی اپنی بیٹی کی عزت عزیز ہے۔ محسن تو اس کا لگتا بھی کچھ نہیں' وہ بھی تو دو دن سے اس کی بیٹی کے سات گل چھرے اڑا رہا ہے۔ اس کے اندر بھی آگ جل رہی ہے' اس کی آنکھوں میں بھی خون اترا ہوا ہے' وہ بھی محسن کو دانتوں تلے چبا جائے اگر وہ اسے مل جائے۔"

"بیٹا! میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا جس سے تمہاری عزت پر حرف آئے۔ میرا تمہارے سوا کون ہے' میرا سب کچھ تمہارا ہے' مجھے اپنی بہو بہت عزیز ہے' میں اس کی طرف اٹھنے والی میلی آنکھ کو نکال دوں گا۔ میں نے تو صرف دھمکی دی ہے تاکہ غریب رحمت کی بیٹی واپس مل جائے' اس مجبور کو بھی سکھ کا سانس نصیب ہو' اس کے دکھوں کا مداوا ہو' اس کا اجڑا آنگن پھر سے آباد ہوجائے۔" اب ساری بات جواد کی سمجھ میں آگئی اس نے سائیں سے معذرت کی یوں باپ بیٹے کے درمیان نفرت کی دیوار تعمیر ہونے سے قبل ہی زمین بوس ہوگئی۔

دو دن وڈیرے سلیم نے بھاگ دوڑ کرکے' محسن کے دوستوں کو ساتھ لیا اور محسن کو تلاش کیا' نجمہ اس سے لے کر سائیں قادر کے حوالے کی۔ سائیں نجمہ کو لے کر رحمت کے گھر گیا' نجمہ کو باپ کے حوالے کیا اک عجیب منظر تھا جب باپ بیٹی ملے۔ دکھ لہو کی مانند ان کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا' آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔ ان کے کربناک بین دل کو ریزہ ریزہ کررہے تھے سائیں بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا' سائیں ان کو روتا دھوتا چھوڑ کر گھر آ گیا۔

دوسرے دن رحمت نے وہ گاؤں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے دور کے رشتے دار کے پاس کافی دور ایک دوسرے گاؤں میں چلا گیا۔ وڈیرے سلیم کو لڑکی واپس کرنے کا بہت دکھ تھا' ایک تو اس کے بیٹے کی من کی مراد پورے ہوتے ہوتے رہ گئی' دوسرا برادری میں بھی بڑی جگ ہنسائی ہوئی تھی' لوگوں نے وڈیرے سلیم کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔

وڈیرا سلیم سائیں قادر کی وجہ سے علاقے میں بدنام ہوا تھا جس نے لڑکی واپس کروا کر وڈیرے سلیم کی ہتک کروائی تھی۔ اب وڈیرا سلیم کھل کر سائیں کی مخالفت کرنے لگا اس کو زک پہنچانے کے منصوبے بنانے لگا پھر ایک ایسا پلان بنانے میں کامیاب ہوگیا جس سے وہ سائیں سے بدلہ لینے لگا اور سائیں کی عزت کو داغ دار کرنے میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوگیا۔

اپنی بیٹی جس کی منگنی اس نے سائیں کے بیٹے جواد سے کی ہوئی تھی' اس منگنی کو توڑ دیا اور بیٹی کی منگنی ایک ایسی جگہ کردی جو لوگ سائیں قادر کے سخت مخالف تھے۔ پچھلے الیکشن میں انہوں نے سائیں کے مخالف امیدوار کو ووٹ دیئے تھے اور سائیں سے ہر قسم کا قطع تعلق کرلیا تھا اگرچہ سائیں کو منگنی ٹوٹنے کا افسوس تو بہت ہوا تھا اور وہ دوسری جگہ منگنی رکوا بھی سکتا تھا مگر اس نے برداشت سے کام لیا اور وڈیرے سلیم کو اس کے حال پر چھوڑ دیا یوں وٹے سٹے کی شادی ہوگئی' وڈیرے سلیم نے تو فوراً بیٹی کی شادی کردی مگر اس کے بدلے میں محسن کی شادی کچھ عرصہ بعد ہونا قرار پائی یوں وڈیرے سلیم نے سائیں سے ہمیشہ کے لیے انتقام لیا اور اس کو نیچا دکھایا۔

وقت کا کام ہے چلتے رہنا' یہ رک کر کب مسافروں کا انتظار کرتا ہے' بہتے دریا کی طرح چلتا رہتا ہے جو ساتھ دے وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور جو رک جائے اسے پاؤں تلے روند کر آگے نکل جاتا ہے۔

آخرکار وہ دن آہی گیا جو محسن کی شادی کے لیے مقرر کیا گیا تھا' بڑی دھوم دھام سے تیاری ہوئی وڈیرے سلیم کے گھر خوشیوں کا اک جہاں آباد تھا ہر

آبروئے نسواں

لڑکیوں کی عزت کانچ کی طرح ہوتی ہے جو ہلکی سی ٹھیس سے چکنا چور ہوجاتا ہے' اسی طرح کسی کی اٹھی ایک غلط نگاہ لڑکی کے کردار کے آئینے میں ایسا بال ثابت ہوتی ہے جو کبھی نہیں نکلتا اس لیے اپنی عزت کی اور اپنے آنچل کی حفاظت کیجیے۔

یاد رکھیں غلاف میں مقدس اور قیمتی چیزیں چھپا کر حفاظت سے رکھی جاتی ہیں جیسے کعبہ کی عمارت' جیسے قرآن پاک اور جیسے تجوری اور ڈبوں میں رقم اور زیورات' ہمیں بھی اللہ نے ایک بے حد قیمتی شے سے نوازا ہے جو آبرو کا موتی ہے اس لیے اسے پردے کے غلاف میں لپیٹ کر رکھیں' سرعام کھلا نہ چھوڑیں۔

عورت کے لفظی معنی ہیں ڈھکی ہوئی چیز اس لفظ کی لاج رکھیں اور نسوانیت کے نام کو مجروح نہ کریں۔

سید بشیر احمد ...... لاہور

چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ زرق برق لباس میں ملبوس لوگ شادی کی خوشیوں میں مگن تھے‘ ہڑبونگ مچی ہوئی تھی کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے‘ محسن کے خوشی سے پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔

جس کو لوگ سلام لینا گوارا نہیں کرتے تھے‘ اس کے نام سے نفرت کرتے تھے آج اسی محسن کو ایک انتہائی سگھڑ‘ خوب صورت اور تعلیم یافتہ لڑکی مل رہی تھی۔ جہیز کی شکل میں بہت کچھ مل رہا تھا اس خوشی کے موقع پر اس کے لفنگے دوست پیش پیش تھے۔ شادی کے تمام انتظامات انہوں نے سنبھال رکھے تھے‘ ہر کام ان کے مشورے سے سرانجام دیا جارہا تھا پھر شادی پر انہوں نے خرچہ بھی دل کھول کر کیا تھا۔ بارات کو لے جانے کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے‘ بینڈ باجے‘ جھومر کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔ کاروں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ بارات میں شامل ہر باراتی کا انگ انگ خوشی سے دمک رہا تھا‘ محسن کے دوستوں کی خوشیاں دیدنی تھی۔ ہوائی فائرنگ کر کے پورے آسمان کو ابر آلود کردیا گیا تھا۔

پورا گاؤں خوشیوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا‘ جب بارات روانہ ہوئی تو وہ منظر دیدنی تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے بہت بڑے نواب کے شہزادے کی بارات جارہی ہو‘ گاڑیوں کی ایک طویل لائن تھی صرف کاروں کا انتظام کیا گیا تھا منظر آنکھوں کو چکا چوند کررہا تھا۔ ہر باراتی اپنے انداز میں خوشی کا اظہار کررہا تھا۔ محسن کے دوست بے پناہ فائرنگ کررہے تھے‘ راستے میں انہوں نے شراب کے جام بھی چڑھانا شروع کردیئے جب بارات دلہن کے گھر پہنچی تو وہاں استقبال بارات اور کھانے کے وسیع انتظامات تھے۔ شامیانوں کا اک شہر آباد تھا‘ بہرے وردی پہنے انتظامات میں مصروف تھے‘ کثیر تعداد میں دیگیں پک کر تیار ہوچکی تھیں‘ مزید کھانا تیار کیا جارہا تھا۔

بارات جونہی پہنچی شراب کے نشے میں محسن کے دوستوں نے اپنی رائفلوں کے دہانے کھول دیئے۔ یوں لگتا تھا جیسے دشمنوں کے ساتھ جنگ لڑی جارہی ہو۔ بے تحاشہ فائرنگ سے آسمان آگ کے الاؤ کی طرح دہکنے لگا‘ یوں لگتا تھا جیسے دشمن نے چڑھائی کردی ہو اور اس سے بچنے کے لیے اپنے تحفظ میں فائرنگ کررہے ہوں۔ رہی سہی کسر بارود کے گولے چلانے والوں نے پوری کردی۔ پھلجڑیوں کی بہار سے رنگوں کی قوس و قزح بن گئی تھی۔ یوں باراتیوں نے گولیوں‘ بارود کو پٹرول کی طرح آگ لگادی تھی جن کے پھٹنے سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے مگر یوں لوگ خوشی سے چور اس شغل میں مصروف تھے۔

میزبانوں نے منت سماجت کرکے فائرنگ سے روکا‘ کرسیوں پر بٹھایا اور ٹھنڈے مشروبات سے ان کی خاطر مدارت کی۔

نکاح کے بعد دلہا کو دیگر رسموں کی ادائیگی کے لیے گھر کے اندر بلایا گیا اس دوران محسن کے دوست بھی ساتھ ہولیے۔ میزبانوں نے ان کے جانے پر اعتراض کیا محسن اور دیگر رشتے کو بتایا۔

”ہم تو رشتے دار ہیں مگر یہ نوجوان لڑکے صرف مہمان ہیں اور ہمارے لیے اجنبی ہیں اندر آپ کی اور ہماری خواتین ہیں‘ یہ لوگ شراب میں بدمست ہیں ہوسکتا ہے ان سے بدتمیزی کریں‘ کہیں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہوجائے ہم کس کس خاتون کو ان سے پردہ کرائیں گے اور پھر اندر ان کا کام بھی کوئی نہیں یہ تو صرف خواتین کو دیکھنے جارہے ہیں‘ اس میں ہماری ہی بے عزتی ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان کو باہر ہی رہنے دیں۔“ اب اپنے دوستوں کی بے عزتی

بھلا محسن کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ وہ تو اسی کی شہ پر اس کے ساتھ تھے‘ لڑکے جب باتیں سن کر واپس جانے لگے تو محسن نے ان کو روکا اور خود بھی اندر جانے سے انکار کردیا اور اپنے دوستوں کے ساتھ واپس پلٹنے لگا اور ان کا مان بڑھایا اگر انہوں نے محسن کی شادی پر دل کھول کر خرچہ کیا تھا اس کی شادی کو چار چاند لگائے تھے تو محسن بھی ان کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا‘ ان کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی محسوس کررہا تھا اب جب محسن نے اندر جانے سے انکار کیا تو میزبانوں کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے مجبوراً ان کو خاموش ہونا پڑا پھر محسن اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں اندر کی طرف روانہ ہوا۔

کھانے کے بعد دودھ پلائی کی رسم شروع ہوئی‘ دلہن کی بہنیں اور ان کی سہیلیاں دودھ لائیں تو یوں لگا جیسے حسن کا دہانہ کھل گیا ہو‘ چاند ستارے زمین پر اتر آئے ہوں۔ نور کی بارش ہورہی ہو‘ لڑکیاں کیا تھیں وہ تو حسن کا شاہکار تھیں‘ جیسے جنت ارضی پر حوریں اتر آئی ہوں۔ اتنی حسین دوشیزائیں دیکھ کر محسن کے دوستوں کی باچھیں کھل گئیں‘ وہ تو ان کے حسن کی گہرائیوں میں کھو گئے حسن کا جادو ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا پھر وہ سب کچھ بھول بھال کر ان کے حسن سے فیض یاب ہونے کے لیے ان سے چھیڑ خانی کرنے لگے۔ میزبان مرد حضرات نے ان کو اوچھی حرکتوں سے روکا مگر وہ ہوش میں کب تھے جو رکتے یا احتیاط کرتے۔ ان کے تو من کی مراد برآئی تھی۔

وہ تو ان حسیناؤں کو اپنے من کے جنگل میں چھپانا چاہتے تھے سو وہ حواس باختہ ہوگئے‘ ہاتھ پاؤں اور ان کے چہرے کو چھونے لگے ان کے بھائی یہ سب کچھ کب تک برداشت کرتے۔ وہ بھی ہتھے سے اکھڑنا شروع ہوگئے۔ پہلے تو ان کو سختی سے روکا لیکن وہ باز نہ آئے‘ بات اس وقت ہاتھ سے پھسلی جب ایک لڑکے نے دلہن کی بہن کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا بس پھر کیا تھا ایک چنگاری تھی جو بھڑک کر آتش فشاں پہاڑ بن گئی تھی۔ بارود کے ڈھیر کو پٹرول چھڑک کر آگ لگادی گئی تھی۔ لڑکی کے بھائیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تابڑتوڑ تھپڑوں کی بارش کردی۔ ان کی دیکھا دیکھی دیگر کاموں میں مصروف لڑکے بھی سب کچھ چھوڑ کر ان پر ٹوٹ پڑے اور مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔ دلہا اور ساتھیوں کی وہ ٹھکائی ہوئی کہ خدا کی پناہ...... دلہا کا سہرا بکھر گیا‘ ماتھا پھٹ گیا‘ دوستوں کے سر اور ہاتھ پاؤں زخمی ہوگئے‘ پسلیاں ٹوٹ گئیں غرضیکہ سب لوگ زخمی ہوگئے۔ لڑائی شدت اختیار کرتی گئی‘ باراتیوں نے جب دیکھا کہ دلہا اور اس کے ساتھیوں کی ٹھکائی ہورہی ہے وہ شدید زخمی ہیں اور لڑائی بڑھتی جارہی ہے ان کا جدھر منہ آیا اپنی جانوں کو بچا کر بھاگ گئے۔

دلہا اور اس کے ساتھیوں کو بڑی مشکل سے میزبانوں کے چنگل سے چھڑایا گیا‘ یوں باراتی جیسے آئے تھے ویسے ہی خالی ہاتھ زخموں کے ہار

آنسو

کتابِ ماضی میں ثبت
یادیں
بے جان تتلی
سوکھے گلاب
اور
چند آنسو
جو لکھے لفظوں میں گھل
چکے ہیں
مفہومِ الفت بدل چکے ہیں

شناس گل..... رحیم یار خان

لے کر واپس چلے گئے۔ شادی والے گھر میں افسردگی پھیل گئی۔

بارات والا گھر افسردگی کی آماجگاہ بننے پر ہر شخص ہکا بکا رہ گیا تھا' کتنے ہی لوگوں کی زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ بارات بے عزت ہوکر' مار کھا کر بغیر دلہن کے واپس چلی گئی تھی۔ یوں شام تک پورے علاقے میں خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی' ہر سننے والا شخص انگشت بدنداں تھا' یہ کیا ہوگیا تھا؟ میزبان کیسے تھے جنہوں نے اپنے داماد کو یوں برادری اور دوست احباب کے سامنے زخمی کر کے رسوا اور ذلیل کر کے بغیر دلہن کے واپس کردیا تھا۔ لوگوں کو ایک موضوع مل گیا تھا پھر خوب مرچ مصالحہ لگا کر اس واقعہ کو ہر چوک' دکان' تھڑے اور بیٹھک پر بیان کیا جارہا تھا۔ وڈیرے سلیم کی وہ بے عزتی ہوئی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کی ذات پر جائز و ناجائز کیچڑ اچھالا جارہا تھا' کچھ لوگ اس کی ہتک اور توہین پر خوش ہورہے تھے' کچھ افسوس کررہے تھے اور اس کی عزت خاک میں ملنے پر ہمدردی کا اظہار کررہے تھے۔

بارات واپس کرنے والوں کی بھی خوب جگ ہنسائی ہوئی جتنے منہ اتنی باتیں' کچھ لوگ تو دلہن کی عزت پر کیچڑ اچھال رہے تھے کچھ میزبانوں کے کردار کو ہدف تنقید بنارہے تھے' کچھ لوگ تو سائیں قادر کی تیار کردہ سازش قرار دے رہے تھے کہ سائیں قادر نے دلہن والوں کے ساتھ صلح کی اور پھر ان کو وڈیرے سلیم اور اس کے بیٹے محسن کے خلاف بہکایا ان کو ذلیل کر کے بارات واپس کرائی اور یوں اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا جو بے عزتی وڈیرے سلیم نے اس کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی منگنی توڑ کر کی تھی۔

اکثر لوگ لڑکی والوں کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے کہ ان کو برداشت سے کام لینا چاہیے تھا' اگر لڑکوں نے بدتمیزی کی تھی تو تحمل سے کام لینا تھا۔ اس بدتمیزی کا اتنا بھیانک انتقام کہ بارات ہی واپس کردی یہ بہت بڑی زیادتی تھی۔ بارات جب خالی ہاتھ واپس لوٹی تو وڈیرے سلیم نے یوں اپنی خاک میں ملی عزت کو سنبھالا دیا کہ اپنے بھائی کی بیٹی سے محسن کا نکاح کردیا' یہ وہ لڑکی تھی جو بہت خوب صورت اور تعلیم یافتہ تھی۔ محسن اور اس کا کوئی جوڑ نہ تھا اور وڈیرے سلیم کو بھائی نے کافی عرصہ قبل اس بیٹی کا رشتہ محسن کے لیے دینے سے انکار کردیا تھا کہ دونوں کے بیچ زمین آسمان کا فرق تھا مگر جب انا غیرت اور خودداری کا مسئلہ بنا' وڈیرے سلیم کو اپنی توہین کا اور کوئی حل نظر نہ آیا تو اس نے اپنی سگی پڑھی لکھی بھتیجی کو انا کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کیا اور پھر اس کی مرضی پوچھے بغیر اس کو محسن کے پلے باندھ دیا۔

ایک بنت حوا کو قربانی کی صلیب پر لٹکا کر معاشرے سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا مگر اس معاشرے کے ٹھیکیداروں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے بشریٰ کے ارمانوں کو جلا کر بھسم کردیا۔ اس مشرق کی بیٹی نے صرف اپنے چچا کی داغ دار پگ کو صاف شفاف کرنے کے لیے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کردیا۔

دوسری طرف دلہن والوں کی علاقے کے لوگ خوب درگت بنارہے تھے' ان کو آنے والے دنوں کی ہولناکی سے آگاہ کررہے تھے۔ ان کے سرانجام دیئے گئے کارنامے کے خوفناک نتائج سے آگاہ کررہے تھے' ان کے بھیانک چہروں کی رعونت سے ان کو آگاہ کررہے تھے۔

''وڈیرے سلیم کی سرشت میں معافی نام کا کوئی لفظ نہیں' آخر وہ سائیں قادر کا رشتہ دار ہے بے شک آپس میں نہ بولیں ہیں' تو رشتہ دار۔ یہ صرف

وڈیرے سلیم کی بے عزتی نہیں' سائیں قادر بھی اب سر اٹھا کر فخر سے ڈیرے میں فیصلے نہیں کرسکے گا اور محسن اور اس کے دوست وہ تو کسی صورت تم کو معاف نہیں کریں گے۔ وہ تمہارا کوئی ایسا نقصان کریں گے جسے تم صدیوں تک پورا نہیں کرسکو گے۔

تمہاری بہتری اسی میں ہے جس طرح بھی ممکن ہو وڈیرے سلیم کو راضی کرو' آج کی معذرت اور منت سماجت مستقبل کے بہت سے مسائل سے تم کو نجات دے گی۔ اس تکلیف کا صلہ تم کو آنے والے دنوں میں ملے گا ورنہ آنے والے دنوں میں ہوسکتا ہے تم پوری برادری سے نکال دیے جاؤ۔ کوئی تم سے رشتہ ناتہ نہ رکھے' تمہارے دکھ درد میں شریک نہ ہو۔ یوں رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوجائے گی' تنہا برادری سے کٹ کر معاشرے میں کیسے جیو گے۔''

بات بڑی وزنی تھی ان کی سمجھ میں آ گئی' برادری کے بزرگوں کو اکٹھا کیا تمام صورت حال ان کے سامنے رکھی' وہ بھی صلح کے حق میں تھے ان کے ساتھ گھر کی خواتین' بہو بیٹیوں کو لیا اور وڈیرے سلیم کے گھر پہنچ گئے۔ جاتے ہی وڈیرے سلیم کے قدموں میں بیٹھ گئے' مردوں نے اپنی پگڑیاں اور خواتین نے اپنے دوپٹے اس کے پاؤں پر رکھ دیئے سب لوگ منت سماجت کرنے لگے' اپنی غلطی تسلیم کی۔ شرمندگی اور ندامت سے نگاہیں جھکائے بیٹھے تھے' صرف معافی کے خواستگار تھے پھر سخت گریہ زاری اور منت سماجت سے وہ وڈیرے سلیم کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

یوں رات کو دوبارہ بارات تیار ہوئی اور دلہن کو لینے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے' اس بات کی خبر جب محسن کے ساتھ نکاح پڑھنے والی لڑکی کو ملی تو وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر خاموش نہ رہ سکی۔ ابھی تو سہاگ کی سیج پر بیٹھی ہی تھی کہ اس کے ارمانوں پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ اس کو وہیں بیٹھے چھوڑ کر دوسری دلہن بیاہنے چلے گئے' وہ دکھ' غم' غصے اور کرب سے لرز گئی اور تو کچھ نہ کرسکی بارات کی روانگی کے بعد گھر میں پڑی زہریلی اسپرے کی بوتل کو منہ لگایا اور کتنے ہی زہر کے گھونٹ پی گئی۔ زہر گلے سے نیچے اترا ہی تھا کہ اس کی زندگی کی سانسیں ہڑپ کر گیا اور لمحوں میں زندگی سے اس کا رشتہ توڑ دیا۔

ادھر جب بارات دلہن کے گھر پہنچی تو اس کو بھی دوبارہ بارات کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ انسانوں کے ہاتھوں کھلونا بن چکی تھی' کبھی دلہن اور کبھی بیوہ سے بھی بدتر۔ سہاگ رات سے قبل ہی طلاق کا جھومر' وہ انسانوں کے اس ظلم کو برداشت نہ کرسکی اور گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔

یوں دو دھیاں نمانیاں انسانی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

نظر فریب

حسام بٹ

انسان کی زندگی اور شطرنج کی بساط میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ عملی زندگی میں ہماری ذرا سی لغزش مستقبل میں کیا رنگ دکھاتی ہے' اس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس طرح شطرنج میں غلط چال پوری بساط کو لپیٹ دیتی ہے۔

ماضی کی ایک لغزش کا قضیہ جو مستقبل کے لیے تباہ کن بن رہی تھی۔

معروف آسٹرولوجسٹ وسیم قریشی کی ڈائری سے۔

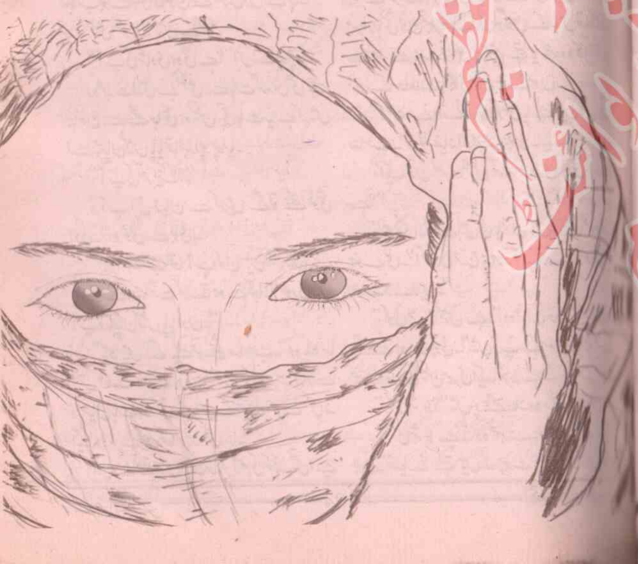

ایک رات میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بج اٹھی میں نے تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں دھیرے سے کہا۔

”ہیلو۔“

کال اٹینڈ کرنے سے پہلے میں ”سی ایل آئی“ کا ڈائل دیکھ چکا تھا وہاں پر دکھائی دینے والا نمبر میرے لیے ناشنا سا تھا۔

”ہیلو قریشی صاحب!“ ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”اللہ کا کرم ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اللہ آپ کو صحیح اور سلامت ہی رکھے۔“ دوسری جانب بولنے والی خاتون نے خلوص دل سے کہا۔

”جی شکریہ۔“ میں نے کہا۔

”آپ کی شادی ہوگئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

وہ عورت ایسی بے تکلفی سے بات کر رہی تھی جیسے برسوں سے مجھے جانتی ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اسے پہچان نہیں پایا تھا لہٰذا پوچھ لیا۔

”آپ کی تعریف؟“

”آپ اپنی زبان سے کریں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”میرا مطلب تھا آپ کون ہیں؟“ میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”سوری میں آپ کو پہچان نہیں پایا ہوں۔“

”پہچانیں گے کیسے قریشی صاحب۔“ وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”آج پہلی مرتبہ ہمارے درمیان بات ہو رہی ہے اس سے پہلے ہم نے کبھی نہ ایک دوسرے کو دیکھا اور نہ کبھی سنا۔“

اس کے قہقہے میں ایک خاص قسم کی کھنک تھی اپنے لب و لہجے سے وہ زندہ دل اور خوش مزاج محسوس ہوتی تھی۔ اس کی سریلی آواز نے میری سماعت میں رس گھول دیا تھا مجھے یوں لگا تھا جیسے جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے اس سے ایک اہم سوال پوچھ لیا۔

”محترمہ آپ کو میرا نمبر کس نے دیا ہے؟“

میرا کانٹیکٹ نمبر میرے وزیٹنگ کارڈ پر پرنٹ تھا لہٰذا اس نمبر کا کسی کو علم ہونا کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن میرے لیے الجھن اور حیرت کا باعث یہ تھا کہ میرے وزیٹنگ کارڈ پر میرا اسیل نمبر اور آفس کے لینڈ لائن نمبرز پرنٹ تھے جبکہ اس اجنبی خاتون نے میرے گھر کے نمبر پر فون کیا تھا اور وہ بھی آدھی رات کو میرا رہائشی فون نمبر صرف انہی لوگوں کے پاس تھا جن سے میرے بہت قریبی مراسم تھے یا پھر وہ کلائنٹس جن کے معاملات ہنگامی نوعیت کے ہوں۔

”ڈھونڈنے والے تو خدا کو بھی پا لیتے ہیں، قریشی صاحب۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

”ایک فون نمبر حاصل کرنا کون سی بڑی بات ہے؟“

”پھر بھی۔“ مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ ”اگر کوئی حرج نہ ہو تو آپ میرے سوال کا جواب دے دیں۔“

”کوئی حرج نہیں ہے۔“ وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گی لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”اصلی شرط ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”سیانے کہتے ہیں کہ چوٹ پر چوٹ نہیں لگنا

چاہیے اور سوال پر سوال نہیں کرنا چاہیے لہٰذا پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں اس کے بعد میں آپ کے سوال کا جواب دوں گی۔“

”آپ کا کون سا سوال؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ کی شادی ہوگئی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی تک اس نعمت سے محروم ہوں۔“

”گڈ۔“ اس کی چہک بھری آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی۔ میں نے کہا۔

”اب میرے سوال کا جواب۔“

”میں وعدے کی بہت پابند ہوں اور دوسروں سے بھی ایفائے عہد کی توقع رکھتی ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”پتا نہیں، میری یہ عادت ٹھیک ہے یا غلط لیکن بس، میں ایسی ہی ہوں۔“

”آپ بہت اچھی ہیں۔“ میں نے اس کی اس عادت پر بے لاگ تبصرہ کر ڈالا۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور میری تعریف کریں گے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ”لیکن یہ کام آپ نے میری توقع سے بہت پہلے کر ڈالا“ ”پہلی ملاقات سے بھی پہلے۔“

”اب آپ اپنے کیے ہوئے وعدے کو نبھائیں۔“ میں نے یاددہانی کے انداز میں کہا۔

”دو روز پہلے میں نے آپ کے آفس فون کیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”بس وہیں سے مجھے آپ کا نمبر مل گیا۔“

مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا کیونکہ میں نے اپنی سیکرٹری انیلا کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ میرے گھر کا نمبر کسی کو نہیں دینا اور اگر دینا ناگزیر ہو تو پہلے مجھ سے ضرور پوچھنا، انیلا کو میں اچھی طرح جانتا تھا وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

”کیا انیلا نے آپ کو میرا یہ نمبر دیا ہے؟“

”جی نہیں، وہ کوئی صاحب تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت ہی شائستہ اور مہذب انداز میں بات کر رہے تھے میں نے آپ کا نمبر حاصل کرنے کے لیے ان شریف النفس صاحب سے ایک جھوٹا بھی بولا۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”بے حد معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میرے آفس میں میرے علاوہ صرف میری سیکرٹری انیلا ہی ہوتی ہے پتا نہیں آپ کن صاحب کا ذکر کر رہی ہیں۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں قریشی صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”اور غلط میں بھی نہیں ہوں۔“

”پھر کنفیوژن کہاں ہے؟“ میں تھوڑا اچڑ سا گیا۔

”کنفیوژن آفس میں ہے۔“ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میری الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

”آپ اپنا آسٹرولوجی والا آفس سمجھ رہے ہیں اور میں دوسرے آفس کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ پہیلیاں بجھوانے والے انداز میں بولی۔ میں نے کہا۔ ”مگر میرا تو ایک ہی آفس ہے۔“

”نہیں، اب آپ کے دو آفس ہیں۔“ وہ اصراری لہجے میں بولی۔

”ایک وہ جہاں آپ اپنے کلائنٹس سے ملاقات کر کے انہیں مفید مشورے دیتے ہیں اور دوسرا آفس وہ جہاں سے آپ کے کارناموں کو شائع کیا جاتا ہے

یعنی نئے افق ڈائجسٹ کا آفس۔
''اوہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔''تو آپ نے ڈائجسٹ کے آفس فون کیا تھا؟''
''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔
''میں نے نئے افق ڈائجسٹ میں آپ کی کہانی ''ماتم بہار'' پڑھی تو آپ کے علم سے بہت متاثر ہوئی بس پھر میرے دل میں آپ سے ملنے کی جستجو جاگ اٹھی۔ آپ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کا کانٹیکٹ نمبر چاہیے تھا۔ لہٰذا میں نے ڈائجسٹ کے آفس فون کیا اور جن صاحب نے میری کال اٹینڈ کی میں نے ان سے جھوٹ بول کر آپ کا نمبر حاصل کرلیا۔''
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نئے افق ڈائجسٹ سے متعلق کسی بھی شخص کے پاس میرے گھر کا نمبر نہیں تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دوسری طرف بولنے والی غلط بیانی سے کام لے رہی ہو، میں نے اپنا شک رفع کرنے کی خاطر سوال کیا۔
''کیا ان صاحب نے آپ کو میرے گھر کا نمبر دیا تھا؟''
''جی نہیں۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی
''وہاں سے مجھے آپ کا سیل نمبر ملا تھا اور وہ بھی بڑی مشکل سے پہلے دن تو مجھے ٹال دیا گیا اگلے روز میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں ''پرائم منسٹر ہاؤس آزاد کشمیر کے اسٹاف میں ہوتی ہوں چنانچہ انہوں نے مجھے آپ کا سیل نمبر دے دیا اور.....'' لمحے بھر کو رک کر اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''یہ میں نے ان صاحب سے غلط بیانی کی تھی میرا پرائم منسٹر ہاؤس آزاد کشمیر سے کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ میرے ایک رشتے دار وہاں کے اسٹاف میں ضرور ہوتے ہیں۔ میں اسلام آباد میں رہتی ہوں اور میرا نام مونا ہے۔''
''مونا یا میمونہ؟'' میں نے اچانک پوچھ لیا۔
''اصل نام تو میمونہ ہی ہے لیکن عام بول چال میں مونا ہی استعمال ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا جب مجھے آپ کا سیل نمبر مل گیا تو پھر میں نے اپنے ذرائع استعمال کرکے آپ کے گھر کا نمبر بھی حاصل کرلیا یہ ہے کل کہانی۔''
''کہانی تو کافی دلچسپ ہے۔'' میں نے کہا۔
''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب آپ کو میرا سیل نمبر مل گیا تھا تو پھر لینڈ لائن نمبر کا کھوج لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ موبائل فون پر مجھے کال کرلیتیں۔''
''بجا فرمایا آپ نے۔'' وہ توانا لہجے میں بولی ''لیکن مجھے آپ کے ساتھ اطمینان سے فرصت میں بات کرنا تھی جو گھر کے نمبر پر ہی ہوسکتی تھی۔''
''اوکے۔'' میں نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔''حکم کریں۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''
''مجھے آپ کا اپائنٹمنٹ چاہیے دو روز بعد کا۔'' اس نے کہا۔
''اپائنٹمنٹ لے کر کیا کریں گی۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔''آپ مظفر آباد میں ہیں اور میں کراچی میں آپ فون پر ہی بات کرلیجیے گا۔''
''دو روز بعد کا اپائنٹمنٹ اسی لیے مانگ رہی ہوں کہ اس سے پہلے میں بھی کراچی پہنچ جاؤں گی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''مجھے آپ کا ڈبل ٹائم چاہیے کیونکہ مجھے بڑی تفصیل سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرنا ہے اس کے لیے میں آپ کو ڈبل فیس

بھی دوں گی۔''
''ڈبل فیس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''میں اپنے تمام کلائنٹس کی بات پوری توجہ اور تفصیل ہی سے سنتا ہوں آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''
''بہت خوب مجھے یقین تھا کہ آپ ایسے ہی ہوں گے۔'' وہ پرستائش لہجے میں بولی۔ میں نے استفسار کیا۔''مثلاً کیسے؟''
''ہم درد، مخلص، خیرخواہ اور سچے انسان۔'' اس نے جواب دیا''تو قریشی صاحب دو دن کے بعد آپ کے آفس میں ملاقات ہوتی ہے، اوکے۔''
''اوکے اینڈ ڈن۔'' میں نے کہا۔
الوداعیہ کلمات کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ منقطع ہوگیا میں نے ریسیور کو کریڈل کیا اور میمونہ عرف مونا کے بارے میں سوچنے لگا۔
وہ جتنے بے باک اور بولڈ انداز میں بات کررہی تھی اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور اس کا تعلق کسی نمایاں، کھاتے پیتے گھرانے سے تھا یہ سب اندازے اپنی جگہ لیکن سچی بات پوچھیں تو میں مونا کے حوالے سے کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا اس اسٹائل کی کسی خاتون سے پہلے کبھی میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔

❀......❀......❀

میمونہ عرف مونا اپنی آواز سے زیادہ دلکشی و دل نشیں تھی دو روز قبل میں نے فون پر اس کی آواز سنی تھی اور اب وہ بہ نفس نفیس میرے سامنے بیٹھی تھی میں نے اس کی عمر کا اندازہ تیس کے اریب قریب لگایا۔ ازاں بعد میرا یہ اندازہ صد فیصد غلط ثابت ہوا وہ تینتالیس ویں سال میں تھی۔
رسمی علیک سلیک کے بعد وہ اپنی روایتی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔
''قریشی صاحب ماشاء اللہ آپ کافی ہینڈسم اور اسمارٹ ہیں پھر ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟''
اگر میری جگہ اور کوئی ہوتا تو مونا کے بے باکانہ انداز سے یہی تاثر لیتا کہ وہ ''لائن'' مار رہی ہے لیکن میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی ایسا خیال نہیں ابھرا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ میں اس کی کلاس کو سمجھ گیا تھا وہ معاشرے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کو دیکھ کر میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا باقی چیزیں تو رہیں ایک طرف، میں یہاں پر صرف مونا کے ہینڈ بیگ (پرس) ہی کا ذکر کروں گا۔ وہ بیگ کسی بھی طور دو لاکھ روپے مالیت سے کم کا نہیں تھا۔ اینی ہاؤ، میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔
''مونا جی اگر شادی کا تعلق شکل وصورت سے ہوتا تو پھر کم صورت اور بدصورت خواتین وحضرات تو اس حسرت نما خواہش یا خواہش نما حسرت کو سینے میں لے کر ہی اس دنیا سے رخصت ہوجاتے۔''
''واہ، کیا شاعرانہ جواب ہے۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔''تو پھر اب تک شادی نہ کرنے کا سبب؟''
''بس، اس حوالے سے کبھی سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔'' میں نے گول مول سا جواب دیا۔
''او ہاں یاد آیا آپ تو مصنف بھی ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔''جب دو دو کام کریں گے تو پھر اس حوالے سے سوچنے کی فرصت کب ملے گی۔''
''میں مصنف نہیں ہوں۔'' میں نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔
''تو پھر وہ نئے افق ڈائجسٹ والی کہانی کون لکھتا

ہے۔" اس نے پوچھا۔

"اس کہانی پر مصنف کا نام بھی شائع ہوتا ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں حسام بٹ صاحب کو کیس کے پوائنٹس نوٹ کرادیتا ہوں اس کیس کو کہانی کا رنگ وہ خود دیتے ہیں کرداروں کے نام اور مقامات تبدیل کردیے جاتے ہیں کہانی کی بنیادی ضرورت اور دیگر تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تھوڑی بہت رنگ آمیزی بھی کی جاتی ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کیس کی صحت متاثر نہ ہو۔"

"گڈ۔" اس نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "میرے خیال میں کہانی والا یہ سلسلہ ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "مونا جی ابھی تک آپ نے اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا؟"

اس نے اپنے بیش قیمت پرس میں سے ایک پرچہ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان صاحب کے بارے کچھ پوچھنا ہے۔"

میں نے مذکورہ پرچہ کھول کر دیکھا اس میں نعمان نامی کسی شخص کی تاریخ پیدائش، وقت پیدائش اور مقام پیدائش لکھا ہوا تھا گویا زائچے کی بنیادی ضروریات مکمل تھیں میں نے اپنے کمپیوٹر پر وہ ڈیٹا فیڈ کر کے ہاروسکوپ (زائچے) کا پرنٹ آؤٹ لے لیا۔ معزز قارئین کی آسانی کے لیے عرض کردوں کہ ہارو اسکوپ یا زائچہ یا جنم کنڈلی یا جنم پتری ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔

جس دوران میں، میں نعمان صاحب کا زائچہ بنا رہا تھا مونا گہری دلچسپی سے مجھے تکتی رہی تھی۔ یقیناً یہ شخص مونا ایسی امیر و کبیر عورت کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہوگا میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ مونا نے ابتدائی تعارف میں مجھے بتایا تھا کہ اس کے والد صاحب لگاتار تین مرتبہ ایم این اے منتخب ہوچکے تھے۔ ازیں علاوہ وہ دو سیمنٹ فیکٹریوں، ایک لوہا فیکٹری اور گروپ آف کمپنیز کے مالک بھی تھے جس میں کنسٹرکشن کا بزنس بھی شامل تھا۔ یہ اپنے علاقے کا نام ور خاندان تھا خاندان کے تمام مردوزن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے عہدوں پر فائز تھے مردوں میں پچاس فیصد افراد نیوی، ایئر فورس، آرمی میں آفیسرز رینک میں تھے مونا خود انکم ٹیکس آفیسر کی بیوی تھی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "مونا جی آپ نعمان صاحب کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟"

"یہ...... ہی...... کہ...... ان کی شادی کب ہوگی؟" وہ اٹک اٹک کر بولی "اکتالیس سال کے ہوگئے ہیں اور......!"

"ایک منٹ مونا جی۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "کیا آپ نے نعمان صاحب کی تاریخ پیدائش بالکل درست بتائی ہے؟"

"ہنڈریڈ پرسنٹ ایکیوریٹ۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ مذاق تو نہیں کررہی ہیں؟"

"بالکل نہیں قریشی صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "آپ کو ایسا کیوں لگا؟"

"یاخدا۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ "کیا میری ساری زندگی امتحان دیتے ہی گزر جائے گی۔"

"میں کچھ بھی نہیں قریشی صاحب۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

"مونا جی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے جو ڈیٹ آف برتھ، ٹائم آف برتھ اینڈ پلیس آف برتھ دیا ہے اس کے مطابق بننے والا زائچہ بتاتا ہے کہ حامل زائچہ یکم مئی تا سات مئی سن دو ہزار دو عیسوی میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ اٹ از ہارواسکوپ آف آ ڈیڈ مین۔"

میرے الفاظ نے گویا اس پر صور پھونک دیا وہ سناٹے میں آ گئی تھی اور کسی سنگی بت کی مانند یک ٹک مجھے دیکھے چلی جارہی تھی میں منتظر تھا کہ وہ کچھ بولے مگر دوسری جانب موت کا سکوت طاری تھا۔

"مونا جی......!" میں نے اسے پکارا۔

اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ "مونا جی، سب خیریت تو ہے نا، آپ خاموش کیوں ہیں؟"

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ان لمحات میں وہ "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کی عملی تفسیر بنی ہوئی تھی میں نے اپنی سیکرٹری کا نمبر ملایا۔

"انیلا، دو فریش لائم ودھ لیمن۔"

"اوکے سر...... ابھی بھجواتی ہوں۔" انیلا نے کہا۔

"ابھی نہیں، پانچ چھ منٹ کے بعد۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

ریسیور رکھنے کے بعد میں نے اپنی میز پر زوردار ہاتھ رسید کیا اور بہ نسبت بلند آواز میں پکارا "مونا جی۔"

یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور اس کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں یا میں کوئی بہت بڑا جادوگر ہوں جس نے اپنے کسی طلسماتی عمل سے اسے سحر میں جکڑ لیا ہو۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی میں ٹھیک ہوں۔" وہ سنبھلے ہوئے انداز میں بولی۔

"یہ آپ کو اچانک کیا ہوگیا تھا؟"

"آپ نے میرے سر پر ایٹم بم پھوڑ ڈالا اور اب پوچھ رہے ہیں کہ مجھے کیا ہوگیا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ بھی کمال کے آسٹرولوجسٹ ہیں قریشی صاحب۔" اسی دوران میں انیلا ایک ٹرے میں دو فریش لیمن اینڈ لائم کے گلاس لے آئی میں نے انیلا کے جانے کے بعد کہا۔

"یہ لیں اس سے آپ کی طبیعت پوری طرح بحال ہوجائے گی۔"

وہ فریش لائم کی چسکی لینے کے بعد بولی۔ "قریشی صاحب کیا آسٹرولوجی اتنا گہرا علم ہے۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی لیکن اس کے لیے دو چیزیں نہایت ہی اہم ہیں ایک، درست ڈیٹا، دوم ماہر آسٹرولوجسٹ۔" پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ نعمان صاحب ہیں کون اور آپ کو میرا امتحان لینے کی کیا سوجھی؟"

"نعمان میرا چھوٹا بھائی ہے...... مطلب تھا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا اور اپنی موت سے پہلے عرصہ دس سال سے وہ اسٹیٹس میں مقیم تھا۔ اس نے امریکا ہی میں اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر وہیں اسے اچھی جاب بھی مل گئی۔ وہ نیویارک کی جس آرگنائزیشن میں کام کررہا تھا اس کا آفس ڈبلیو ٹی سی میں تھا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟" لمحاتی توقف کر کے اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"ڈبلیو ٹی سی کا مطلب ہے ورلڈ ٹریڈ سینٹر جسے "ٹوئن ٹاورز" بھی کہا جاتا تھا۔"

"جب نائن الیون کا واقعہ ہوا تو اس وقت نعمان اپنے آفس میں موجود تھا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا اور خاموش ہوگئی۔

اس کے بعد کچھ بتانے کے لیے بچا ہی نہیں تھا۔ وہ واقعہ اس دنیا میں پیش آنے والے خوفناک واقعات میں سے ایک تھا۔ جس میں پانچ ہزار سے زائد افراد آنا فانا میں لقمۂ اجل بن گئے تھے اور ہزاروں شدید زخمی، ان زخمیوں میں سے اکثریت چند روز یا چند ہفتے ہی جی پائے تھے نعمان بھی انہی افراد میں شامل تھا جسے ملبے میں سے شدید زخمی حالت میں نکالا گیا تھا وہ لگ بھگ آٹھ ماہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا تھا اور بالآخر چار مئی دو ہزار دو عیسوی کی دوپہر کو وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا تھا۔

"میرا ٹیسٹ تو آپ نے لے لیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری اور میرے علم کی عزت بھی رکھ لی۔" میں نے مونا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب یہ بھی بتادیں کہ میں مزید آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"ضرور بتاؤں گی۔" وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"پہلے آپ بتائیں کہ آسٹرولوجی اتنی گہرائی تک کیسے اتر جاتی ہے۔"

"ویری سمپل۔" میں نے کہا۔ "نعمان صاحب کے پیدائشی زائچے (NATAL CHART) میں طالع پیدائش یعنی لگن (LAGAN) جوزا ہے اور اس لگن میں زحل بیٹھا ہوا ہے جو آٹھویں گھر یعنی جدی کا حاکم ہے۔ آٹھویں گھر کا حاکم جب کسی زائچے کے پہلے گھر یعنی لگن میں آکر بیٹھ جائے تو یہ بہت ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے اور اسے ڈیتھ پلینٹ (DEATH PLANET) بھی کہا جاتا ہے پھر روٹین میں جب بھی زحل اس مقام سے گزرتا ہے اس وقت اگر کسی دشمن سیارے سے اس کا ملاپ ہوجائے تو ان دونوں سیاروں کی باہمی دھینگا مشتی حامل زائچہ کی موت کا سبب بنتی ہے اور یہ موت یا تو طویل لاعلاج امراض کی وجہ سے ہوتی ہے اور یا پھر اچانک کسی بڑے حادثے کے باعث زائچہ چونکہ نعمان صاحب کی صحت کو سپرفٹ ظاہر کر رہا تھا لہٰذا میں نے یہی اندازہ قائم کیا کہ موصوف کو کوئی خطرناک حادثہ پیش آگیا ہوگا لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ سے مزید کوئی سوال کرتا آپ پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔"

"جہاں اتنا کچھ بتایا ہے وہاں یہ بھی بتادیں کہ اس کمینے زحل کی اپنے کس دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی تھی؟" وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

"مونا جی کسی بھی انسان کے زائچے کے تین گھر بہت فتنہ پرور اور شر انگیز ہوتے ہیں۔" میں نے نہایت ہی سادہ الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یعنی چھٹا گھر، آٹھواں گھر اور بارہواں گھر آسٹرولوجی کی زبان میں اسے "شیطانی گھر" کہا جاتا ہے کیونکہ ان گھروں کی منسوبات سے انسان کی زندگی میں آنے والی مشکلات، پریشانیوں، تباہ کاریوں اور بربادیوں کو ناپا جاتا ہے جیسے چھٹے گھر سے صحت کے تمام معاملات بارہویں گھر سے خفیہ دشمنوں کے معاملات اور آٹھویں گھر سے زندگی اور موت کے معاملات اب میں نعمان صاحب کے زائچے کی بات کرتا ہوں۔" میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے نعمان کے زائچے کے پہلے گھر یعنی لگن جوزا میں موت کا سیارہ زحل موجود تھا "موت کا سیارہ" اس لیے کہ زحل آٹھویں گھر کا حاکم بھی ہے اب میں نے یکم مئی تا سات مئی دو ہزار دو کا جو وقت بتایا اس دوران میں زحل لگن میں موجود تھا اور اس کا دشمن مریخ بھی یہاں پر موجود تھا ایسا نہیں ہے کہ یہ دونوں خبیث الاخبث اسی ہفتے جوزا میں داخل ہوئے ہوں زحل تو لگ بھگ ایک سال سے یعنی 2001ء سے یہاں موجود تھا اور مریض بھی مہینہ بھر پہلے یہاں آیا تھا۔ ایک ہی گھر میں موجود ہونے کے باوجود بھی ان دونوں کے بیچ اچھا خاص فاصلہ موجود تھا۔ میں نے خصوصی طور پر مئی 2002ء کے جس ہفتے کا ذکر کیا اس دوران میں یہ دونوں شیطان ایک ہی درجے پر دست و گریباں تھے۔"

"اوہ میں سمجھ گئی سب۔" وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

"جب سمجھ گئی ہیں تو اب آپ اپنی آمد کا اصل مقصد بھی بتادیں۔؟" میں نے کہا۔

"میرا ایک ہی بیٹا ہے جبران۔" اس نے بتایا۔ "عمر بیس ہے ابھی پچھلے سال اس نے (A-LEVEL) کیا ہے۔ جبران کی وجہ سے سخت پریشان ہوں کیونکہ اس نالائق کو ایک لڑکی سے طوفانی قسم کا عشق ہوگیا ہے لڑکی کا نام ثوبیہ اور عمر انیس سال اور ثوبیہ اکلوتی اولاد ہے۔"

"تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "عشق کرنا تو اس دنیا کا عظیم کام ہے۔"

عشق میں بو ہے کبریائی کی
عشق جس نے کیا خدائی کی

"میں ان لوگوں کے عشق کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔" وہ اپنے بیگ کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولی۔ "اس عشق کے سائیڈ ایفیکٹس نے مجھے خوفزدہ کر رکھا ہے۔"

"یہ تو انیس اور بیس کا حسین سنگم ہے۔" میں نے کہا "انہیں آٹھ دس سال عشق کرنے دیں جب تک ان کی تعلیم بھی مکمل ہوجائے گی اور عشق میں پختگی بھی آجائے گی پھر ان کی شادی کردیجیے گا البتہ سائیڈ ایفیکٹس والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ابھی سمجھاتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں نے انیس سالہ ثوبیہ اور بیس سالہ جبران کے حسین سنگم اور ان کے آٹھ دس سال کے عشق کے حوالے سے اوپر جو بات کی ہے وہ بعض قارئین کو ناگوار بھی گزری ہوگی۔ ایسے قارئین سے میں انتہائی معذرت خواں ہوں، ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کردوں کہ میرا وہ تبصرہ معاشرے کی جس روشن خیال کلاس کے لیے تھا ان کے ہاں ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ دقیانوسی تصور کیا جاتا ہے۔

"یہ جبران اور ثوبیہ کا ڈیٹا ہے۔" وہ ایک تہ شدہ کاغذ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"آپ پہلے ان کے زائچے دیکھ لیں پھر میں اپنی پریشانی کا سبب بتاؤں گی اور......!" لمحاتی توقف کر کے اس نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"آپ اپنے وقت کی فکر نہیں کیجیے گا قریشی صاحب میں نے آپ کی سیکرٹری سے معلوم کرلیا ہے آپ ایک زائچے کی جو فیس لیتے ہیں میں اسی حساب سے ان تمام زائچوں کی فیس ادا کروں گی جو یہاں بنائے جائیں گے جیسے ایک زائچہ آپ نے نعمان کا بنایا دو زائچے جبران اور ثوبیہ کے بنا رہے ہیں

یہ ہو گئے تین، ان کے علاوہ دو یا تین زائچے میں مزید ڈسکس کروں گی کل پانچ زائچے ہوں یا چھ میں سب کی فیس ادا کروں گی۔''

میں نے مونا سے تو کچھ نہیں کہا اور اپنے کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہو گیا تاہم دل میں یہ خود کلامی ضرور کی۔

''مونا جی اللہ میرے تمام کلائنٹس کو آپ جیسا اصول پسند بنا دے۔''

جب زائچے تیار ہو گئے تو میں نے مونا سے کہا۔

''بہت عمدہ میچ ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''جبران کا سن سائن کینسر اور مون سائن ٹاؤرس جبکہ ثوبیہ کا سن سائن ٹاؤرس اور مون سائن کینسر ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''اگر دو افراد کا سن اور مون ایک دوسرے کے اوپر پڑے تو ان دونوں کے بیچ غضب کی باہمی کشش پائی جاتی ہے ان کی دوستی اور محبت مثالی ثابت ہوتی ہے پھر ٹاؤر (ثور) اور کینسر (سرطان) کے حاکم سیاروں قمر (مون) اور زہرا (وینس) کی بھی آپس میں گہری دوستی ہے۔ ازیں علاوہ......!'' میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کر کے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جبران کا زہرہ (VENUS) ثوبیہ کے قمر (MOON) پر برج سرطان میں ہے زہرہ اور قمر کی باہمی کشش کے بارے میں میں آپ کو بتا چکا ہوں انہی نظرات (ASPECTS) کی بنا پر میں نے ثوبیہ اور جبران کے میچ کو آئیڈیل قرار دیا تھا البتہ۔''

''البتہ کیا قریشی صاحب؟'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے مستفسر ہوئی۔

''ثوبیہ کا مشتری (CAPRICON) چھٹے گھر اور وہ برج جدی میں ہے۔ مشتری یہاں بہت خراب ہوتا ہے۔ لہٰذا ثوبیہ کو کبھی بھی جگر کا کوئی خطرناک ایشو ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے اب آپ میری پریشانی کا احوال بھی سن لیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''میں آپ کے علم کو چیلنج کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس سلسلے میں ایک تجربہ ہی کافی ہے۔ آپ نے اپنے علم کی روشنی میں نعمان کا زائچہ دیکھ کر جو انکشاف کیا اس نے مجھے اندر باہر ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' وہ رکی ایک طویل بوجھل سانس خارج کی پھر کہا۔

''میں یہ چاہتی ہوں کہ جبران ثوبیہ کو اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔'' اس کی آواز میں گہرا کرب چھپا ہوا تھا۔

''میں اس محبت اور شادی کے حق میں نہیں ہوں۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''مگر کیوں؟''

''اس لیے کہ ثوبیہ جبران کی بہن ہے۔''

اب مونا نے میرے اوپر بم پھوڑا تھا میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپ نے تو بتایا تھا کہ جبران آپ کی اکلوتی اولاد ہے؟''

''میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جبران میری اور اسد کی اکلوتی اولاد ہے جبکہ ثوبیہ اسد اور نورین کی اکلوتی اولاد ہے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ثوبیہ کی والدہ نورین نے اسد سے شادی کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو یہ بات ثوبیہ اور جبران کے علم میں ہونا چاہیے اور انہیں اس قسم کے عشقیہ چکروں سے پرہیز کرنا چاہیے۔''

''ان دونوں بچوں کو کچھ پتا نہیں ہے قریشی صاحب۔'' وہ شکستہ دلی سے بولی ''حتیٰ کہ یہ راز اسد کو بھی معلوم نہیں اسد یہی سمجھتا ہے کہ ثوبیہ نورین اور خالد کی اولاد ہے اسی لیے ان سے ان کی محبت سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ سارا عذاب واقف حال کے لیے ہوتا ہے میں چونکہ اس راز کو جانتی ہوں اسی لیے اذیت میں مبتلا ہوں اور چاہتی ہوں کہ آپ میری اس پریشانی کا کوئی حل نکالیں۔''

''آپ کی باتوں کا لب لباب تو یہ ہے کہ ثوبیہ اسد اور نورین کی ناجائز اولاد ہے۔'' میں نے دوٹوک الفاظ مین کہہ دیا۔

''جی ایسا ہی ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''کالد بھی اسد ہی کے رینک کا آفیسر ہے اسد کا اکثر اس کے گھر میں آنا جانا تھا اور اسد یہ بات تسلیم بھی کرتا ہے کہ نورین کے ساتھ اس کا بہت کلوز معاملہ رہا ہے۔''

''اگر وہ یہ تسلیم کرتا ہے تو پھر وہ اس بات پر بضد کیوں ہے کہ ثوبیہ خالد کی اولاد ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''وہ اس لیے کہ اسد، خالد کے ایک راز سے واقف نہیں ہے۔'' وہ اسرار بھرے لہجے میں بولی۔

''راز۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیسا راز؟''

''یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی پہلے آپ مزید تین زائچے بنائیں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر اپنے قیمتی بیگ کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ کے علم نے اس راز کو فاش نہ کیا تو پھر میں کھل کر آپ کو بتاؤں گی۔''

میں نے اپنی سیکرٹری کے سیل فون پر میسج کیا اور پوچھا کہ وزیٹنگ روم کا کیا حال ہے اس کا رپلائی آیا کہ کوئی بھی کلائنٹ ویٹنگ پر نہیں ہے میں نے کہا مجھے میڈم مونا کے ساتھ ابھی مزید ٹائم لگے گا اگر کوئی کلائنٹ آ جائے اور کوئی ایمرجنسی کا معاملہ نہ ہو تو آپ کل کا ٹائم دے دیں اس کا رپلائی آیا اوکے سر۔ یہ مختصر ٹیکسٹ چیٹنگ میں نے اس لیے کی تھی کہ مونا کو کچھ فیل نہ ہو پھر میں نے انٹر کام پر انیلا سے کہا۔

''عمدہ قسم کے سینڈوچز اور چائے آرڈر کر دیں۔''

''میرے لیے کافی قریشی صاحب۔'' مونا نے کہا۔

''اوکے۔'' میں نے کہا پھر انیلا کو نوٹ کرا دیا۔

''میرے لیے چائے اور میڈم مونا کے لیے کافی۔''

مونا نے ایک کاغذ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''قریشی صاحب یہ نورین خالد اور اسد کا ڈیٹا ہے آپ ان کے زائچوں پر ایک ماہرانہ نگاہ ڈالیں پھر بات کرتے ہیں۔''

دس منٹ میں، میں نے وہ تینوں زائچے تیار کر لیے پھر جب میں نے ان پر سرسری نگاہ ڈالی تو ایک سفاک حقیقت کھل کر میرے سامنے آ گئی میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور الجھن زدہ نظر سے مونا کی طرف دیکھا۔

''جی قریشی صاحب۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا ریڈ کیا آپ نے؟'' ''ریڈ تو بہت کچھ کیا ہے۔'' میں نے کہا ''شروع کہاں کروں؟''

''جہاں سے دل چاہے، شروع ہو جائیں۔'' وہ فراخ دلی سے بولی۔

اور میں شروع ہو گیا۔ ''نورین کے زائچے میں آٹھویں گھر کا حاکم پانچ ویں گھر میں بیٹھا ہے پانچ واں گھر اولاد سے منسوب ہے لہٰذا آٹھویں گھر کا حاکم

یہاں پر بے اولادی یا بچوں کی موت یا ابارشن یا مس کیرج کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس زائچے میں یہ خرابی اتنی خطرناک نہیں ہے کیونکہ نورین کا قمر (MOON) گیارہویں گھر میں ہے جو کہ امیدوں اور خواہشات کا گھر ہے اور قمر خاص طور پر اولاد کے معاملات کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں کہ مشکل اور پریشانی تو پیش آسکتی ہے مگر نورین ایک نہ ایک دن صاحب اولاد ضرور ہوں گی۔"

"اور خالد کا زائچہ کیا کہتا ہے؟" مونا نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"آٹھویں گھر کا حاکم ساتویں گھر میں بیٹھا ہے اور وہ بھی راہو کے ساتھ۔" میں نے بتایا۔

"نتیجہ...... بد قسمت شادی، ناخوش گوار ازدواجی تعلقات، شریک حیات کی موت یا علیحدگی آٹھویں گھر پر مریخ، زحل اور مشتری قابض، وہ بھی اس طرح کہ زحل اور مشتری حالت قران (CONJUCTION) میں، مریخ آٹھویں گھر میں اختلافات، جھگڑے رنجشیں لاتا ہے بار بار حادثات اور قانونی معاملات میں الجھاتا ہے بے پروا، بے فکر اور فضول خرچ بناتا ہے اور اس کے ساتھ ہی شہوانی بیماریاں اور پوشیدہ اعضا کی خرابیاں بھی دیتا ہے اور......!" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اور...... اگر کسی شخص کے زائچے کے آٹھویں گھر میں زحل اور مشتری حالت قران میں پائے جائیں تو لازمی نامردی (IMPOTANCY) لاتے ہیں۔"

"اب آپ کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے؟" مونا نے مجھ سے پوچھا۔

"یہی کہ نورین کی قسمت میں اولاد تو ہے مگر اس شوہر سے نہیں بلکہ کسی اور شوہر سے۔" میں نے صاف گوئی مگر محتاط الفاظ کے استعمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"بس یہی وہ راز ہے جو میں آپ کو بتانا چاہ رہی تھی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھے بہت پہلے خالد کی اس خامی کا علم ہو گیا تھا۔"

"مگر آپ کو کیسے پتا چلا تھا؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"خالد اور نورین کی شادی کے دو سال بعد تک جب ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو حسب روایت علاج معالجے کا سلسلہ شروع ہوا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میری ایک دوست اسلام آباد کے ایک بہت مہنگے پرائیویٹ اسپتال کی لیبارٹری انچارج ہیں ایک روز میں اپنی دوست کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے مجھ سے کہا۔

"مونا تمہارے ہزبینڈ کا دوست بڑا عجیب و غریب انسان ہے۔"

"میرے ہزبینڈ کے تو درجنوں نہیں، سیکڑوں دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم کس دوست کی بات کر رہی ہو؟"

"ارے یار وہ نورین کا ہزبینڈ نہیں ہے۔"

کون...... خالد۔"

"ہاں، ہاں وہی۔" وہ جلدی سے بولی۔

"کیا کر دیا خالد نے؟" میں نے پوچھا۔

"نورین کا کسی گائنی کے پاس علاج چل رہا ہے۔" اس نے بتایا۔

"ظاہر ہے جب کوئی گائنی اولاد کے حوالے سے علاج شروع کرتی ہے تو شوہر کا ٹیسٹ بھی کراتی ہے تاکہ اس کی اہلیت/ نا اہلیت کو بھی چیک کیا جا سکے خالد نے اپنا ٹیسٹ ہماری لیبارٹری سے کرایا اور اس کی رپورٹ نل یعنی زیرو ہے۔ اس کے صاحب اولاد

ہونے کے امکانات صفر کے برابر ہیں اپنی رپورٹ پڑھنے کے بعد وہ مجھ سے ملا اور مجھ سے درخواست کی کہ اگر میں اس کی رپورٹ کو پازیٹیو کر دوں تو وہ مجھے پچاس ہزار تک دینے کو تیار ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ پاؤں پٹخ کر چلا گیا اور جاتے ہوئے خاصے دھمکی آمیز الفاظ میں کہہ گیا "آپ نے میرا کام نہیں کیا ٹھیک ہے لہٰذا برائے مہربانی اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیے گا۔ مجھے پتا ہے جس کام کے وہ مجھے پچاس ہزار دے رہا تھا وہی کام کسی ضمیر فروش لیبارٹری والے نے پانچ دس ہزار میں کر دیا ہوگا مجھے چونکہ اس سے اور اس کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی اور کسی سے ذکر نہیں کیا۔"

میں اپنی دوست کے پاس سے اٹھ کر گھر آ گئی۔ اس دن میں کئی بار یہ خیال آیا کہ اسد سے ذکر کروں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اللہ پردے کو پسند فرماتا ہے مجھے خالد کے کسی انتہائی نازک معاملے کی تشہیر نہیں کرنا چاہیے لیکن جب یہ آگ میرے گھر کو لپیٹنے کے درپے ہے تو میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہے نا آخر۔"

"صرف اسی مسئلے کا نہیں بلکہ دنیا کے ہر مسئلہ کا حل نکالنا چاہیے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کا مسئلہ تو بالکل آسان ہے۔"

"آسان ہے کیا مطلب؟" وہ سینڈوچ کی بائٹ لیتے ہوئے بولی۔

"آپ نے اب تک خالد کے راز کو سینے میں دبائے رکھا۔" میں نے کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ اپنے شوہر سے ڈسکس کریں اور اسد کو بتائیں کہ خالد کے ساتھ کون سا میڈیکل ایشو ہے اور اسے یہ بھی بتائیں کہ ثوبیہ......!" میں بولتے بولتے اچانک رکا۔

"کیا ہوا قریشی صاحب؟" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

"مونا جی ثوبیہ کی تاریخ پیدائش 1996ء کی ہے۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "آپ کو کب پتا چلا کہ اسد اور نورین کے بیچ کوئی سنجیدہ تعلق رہا ہے؟"

"چند سال پہلے یہ راز میرے علم میں آیا تھا۔" اس نے جواب دیا "میں نے جب اس موضوع پر اسد سے بات کی تو وہ پہلے تو آئیں، بائیں شائیں کرتا رہا پھر میں نے اس سے قبول کرا ہی لیا ہمارے بیچ تھوڑی سی بدمزگی ہوئی اور پھر اسد نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ نورین سے ہر تعلق ختم کر لے گا اور پتا ہے اس نے یہ وعدہ کہاں پر کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "نہیں میں نہیں جانتا۔"

"دو سال پہلے ہم لوگ یورپ کے ٹور پر تھے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"ہمارا قیام نیدر لینڈ کے ایک مضافاتی قصبے لمبرگ (LIMBURG) میں تھا۔ تاہم جرمنی، بیلجیم اور فرانس اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ انہی دنوں سپر مون کی رات ہم پیرس میں تھے۔ سپر مون (SUPER MOON) کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کیونکہ یہ آسٹرولوجیکل معاملہ ہے خیر، تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ اس سپر مون کا نظارہ ہم نے ایفل ٹاور کے اوپر کھڑے ہو کر کیا تھا پیرس ہی میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کے اندر آپ کو لاتعداد تالے پڑے نظر آئیں گے یہ محبت کرنے والوں کا "کارنامہ" ہے۔ روایت کے مطابق، محبت کرنے والے جوڑے مختلف عہد و پیماں کو تالوں میں بند کر کے پانی سے بھرے ہوئے حوض میں ڈال دیتے ہیں اس روز اسد نے "تالا بند عہد" بھی کیا تھا

اور پھر اب تک وہ اپنے عہد پر قائم ہے۔"

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور آخر میں کہا۔

"جب آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ اسد اور نورین کے بیچ کچھ خطرناک چل رہا ہے اس وقت ثوبیہ کی عمر کتنی تھی؟"

"تیرہ یا چودہ سال۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر آپ اتنے وثوق سے ثوبیہ کو اسد کی بیٹی کیسے کہہ سکتی ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ثوبیہ خالد کی بلڈ لائن نہیں لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ انہی دنوں نورین کا کسی اور مرد سے بھی "اٹیچمنٹ" رہا ہو؟"

"آپ کا سوال اپنی جگہ پر بہت اہم ہے قریشی صاحب لیکن ثوبیہ میں اسد کی شباہت پائی جاتی ہے۔" اس نے اپنے جواب سے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"میں شباہت والے معاملے پر بھروسا نہیں کر سکتا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "عورت جس مرد سے سچی محبت کرتی ہے اس شخص کی صورت ہر وقت اس کے تصور میں موجود رہتی ہے اور اگر یہ تصور بہت زیادہ گہرا ہو تو نو ماہ تک اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ بھی وہی خال و خط اختیار کر لیتا ہے جو تصور والے شخص کے ہوتے ہیں اس کی سب سے بڑی مثال امرتا پریتم اور ساحر لدھیانوی کی ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے لیکن ساحر کی بزدلی شادی کے راستے کی رکاوٹ بن گئی تاہم دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ امرتا پریتم کا بیٹا ساحر کی ڈٹو کاپی تھا۔"

"محبت کا معاملہ الگ ہے قریشی صاحب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ تو ایک الوہی جذبہ ہے یہ جسم کا نہیں، روح کا رشتہ ہے اور روحانی معاملات میں یہ سب کچھ ممکن ہے لیکن نورین کا کیس مختلف ہے اور اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تو آپ نورین، اسد اور ثوبیہ کے زائچوں کو میچ کر کے دیکھ لیں کہ یہ ایک ہی فیملی ہے یا نہیں۔"

"اگرچہ میں ان تینوں زائچوں کی اسٹڈی سے کسی منطقی اور حتمی نتیجے پر پہنچ سکتا ہوں۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

"لیکن میں ایسے کام نہیں کرتا۔"

"کیوں قریشی صاحب؟" وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اس لیے کہ میرے اللہ کو پردہ بہت پسند ہے ثوبیہ خالد کی بیٹی ہے یا اسد کی یا پھر کسی اور کی یہ صرف ہمارے بیچ ڈسکس ہو رہا ہے لیکن میرے پروردگار نے پچھلے انیس سال سے اس راز پر پردہ ڈال رکھا ہے اور دنیا والے یہی سمجھتے ہیں کہ ثوبیہ خالد کی بیٹی ہے اسی حقیقت کو اسٹیبلش رہنا چاہیے بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور اس "رحمت" کو آسٹرولوجی کی آپریشن ٹیبل پر لا کر اپنی زندگی کو "زحمت" کا تحفہ نہیں دینا چاہیے پتا نہیں اس مالک کائنات نے ہمارے کن کن عیوب پر پردہ ڈال رکھا ہے۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں قریشی صاحب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی "لیکن میں آنکھوں دیکھی مکھی کو نگل نہیں سکتی۔"

"تو آپ اسد سے کہیں کہ وہ نورین سے بات کرے۔" میں نے مشورہ دیا۔ "نورین کو اعتماد میں لے کر یہ سارا معاملہ سلجھایا جا سکتا ہے۔"

"نورین سے بات نہیں ہو سکتی، ناممکن۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا "وجہ۔"

"لاسٹ دسمبر میں اسے فالج کا اٹیک آیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہ پچھلے پانچ ماہ سے بیڈ پر ہے ایک زندہ لاش کی مانند نہ ہل سکتی ہے نہ چل سکتی ہے، نہ سن سکتی ہے نہ بول سکتی ہے بے تاثر آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہتی ہے۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کی "یہ تو واقعی خاصی گمبھیر صورت حال ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "خالد سے بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ حقیقت اس سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ باپ بننے کے قابل نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس معاشرے کے سامنے وہ پچھلے انیس سال سے ایک بیٹی کا باپ ہے ظاہر ہے وہ نورین کی بے وفائی سے بخوبی آگاہ ہے اور وہ یہ بھی بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ نورین سے زیادہ کلوز کون رہا ہے لہٰذا اسے بھی اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ ثوبیہ اس کی بیٹی ہے۔"

"تو پھر خالد اس مسئلے کو بآسانی ہینڈل کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے چاہیے کہ وہ ثوبیہ کو کنٹرول کرے۔"

"وہی تو ثوبیہ کو کنٹرول کر رہا ہے۔" مونا نے زہر ماند لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے خالد کا زائچہ بنایا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"آپ کو اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ وہ کتنا کینہ ور، بھڑے باز اور گھٹیا خیالات کا مالک ہے۔ اس وقت ثوبیہ کا ذہن پوری طرح خالد کی مٹھی میں ہے۔ وہ ثوبیہ کا "بیسٹ پاپا" ہے کیونکہ اس نے ثوبیہ کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے وہ ثوبیہ کے ذریعے جبران کو شکار کر کے اسد سے اور نورین سے انتقام لینا چاہتا ہے اب آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔"

"بالکل سمجھ گیا ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ثوبیہ اس کی نظر میں بیٹی نہیں بلکہ ایک کھلونا ہے ریس کا ایک گھوڑا ہے شطرنج کا ایک مہرہ ہے لہٰذا وہ بڑے صبر و سکون کے ساتھ یہ بازی کھیل کر آپ لوگوں کی فیملی کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔"

"اب آپ بتائیں ان حالات میں، میں کیا کروں؟" وہ روہانسی ہو گئی

میں نے کہا۔ "صرف ایک کام۔"

"کون سا ایک کام؟" اس نے پوچھا۔

"آپ بھول جائیں کہ نورین نام کی کوئی عورت اس دنیا میں موجود ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اس بات کو بھی فراموش کر دیں کہ اسد کو اس معاملے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس زہر کو بھی اپنے ذہن میں جگہ نہ دیں کہ خالد ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت آپ لوگوں کی فیملی کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے بس، آپ کا فوکس جبران پر ہونا چاہیے۔"

"قریشی صاحب میرا فوکس جبران پر ہی ہے۔" وہ اصراری لہجے میں بولی۔ "لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جبھی تو آپ کے پاس آئی ہوں بتائیں میں کیا کروں۔"

"آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی عامل کامل کے پاس جانے کی ضرورت ہے۔" پھر میں نے پوچھ لیا "آپ نے ابھی تک ایسی کوئی لڑائی کی تو نہیں؟"

"نہیں قریشی صاحب مجھے ان لوگوں سے گھن

آتی ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "اگر مجھے ان کے پاس جانا ہوتا تو پھر آپ کے پاس نہ آتی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"آپ میرے پاس آ چکیں، مجھ سے مل چکیں اور اپنی پریشانی تفصیل سے مجھے بتا چکیں میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اب آپ چپ چاپ واپس اسلام آباد چلی جائیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بے ساختہ بول اٹھی۔

"مطلب یہ کہ آپ اپنا کام کر چکیں اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔" میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"آپ گھر جائیں اور پھر جبران کی تین چیزیں کسی کوریئر سروس سے مجھے بھیج دیں۔"

"کون سی تین چیزیں قریشی صاحب؟" اس نے پوچھا۔

"نمبر ایک، ہاتھ یا پاؤں کے ترشے ہوئے چند ناخن، نمبر دو سر کے چند بال، نمبر تین اس کے بدن کا پہنا ہوا کوئی کپڑا۔" میں نے کہا "کوئی رومال، کوئی جراب، کوئی بنیان یا کوئی بھی شرٹ کیا آپ یہ کرلیں گی۔"

"جی بالکل کرلوں گی یہ کون سا مشکل کام ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ ان چیزوں کا کیا کریں گے؟"

"میں کوئی بولتا جادو فلاں ڈھمکان بابا" تو نہیں ہوں لیکن چند آزمودہ ٹوٹکے مجھے ضرور آتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں میں جو بھی عمل کروں گا اس کی کوئی فیس نہیں ہوگی۔"

"اگر آپ اس کام کے لیے بھاری سے بھاری فیس کا مطالبہ بھی کریں گے تو میں بصد احترام دوں گی۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ "کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تمام تر اختیارات اور مال و دولت ہونے کے باوجود بھی میں اس وقت کس قدر مجبور ہوں۔"

"اور کوئی اندازہ لگا سکے یا نہ لگا سکے مگر مجھے آپ کی حالت کا بخوبی اندازہ ہے۔" میں نے ہم دردی بھرے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اور میں کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کو گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں۔ آپ اپنے خدا پر کامل یقین رکھیں اور مجھے عمل کرنے دیں۔ ان شاء اللہ چالیس دن کے اندر نتائج برآمد ہوں گے، مثبت نتائج۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے قریشی صاحب۔" وہ فرط جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔"

"مونا جی میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے ہر انسان کو کسی دوسرے انسان کے کام آنے کے لیے پیدا کیا ہے اگر انسان اپنی اس ذمہ داری کا خود ہی احساس کر لے تو اس کی زندگی آسان اور پرسکون ہو جاتی لیکن اگر انسان غفلت میں پڑ کر صرف اپنی ذات کا ہو کر رہ جائے اور اسے مخلوق خداوندی کا کوئی احساس نہ ہو تو پھر وہ قدرت کی پکڑ میں ایسا آتا ہے کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکل جاتی ہیی کیونکہ جو بھی ضرورت مند شخص چل کر آپ کے پاس آتا ہے وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ کہ اللہ آپ سے خوش ہے وہ آپ کے فیض کو عام کرنا چاہتا ہے، آپ کے ہاتھ سے دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ اگر آپ اللہ کے بھیجے ہوئے بندے کو نظر انداز کریں گے یا مایوس کریں گے یا دھتکاریں گے تو پھر آپ کس طرح اس ذات پاک سے کسی لطف و کرم کی

امید کر سکتے ہیں؟"

"میں آپ کی باتوں سے مکمل اتفاق کرتی ہوں قریشی صاحب۔" وہ عقیدت بھرے انداز میں بولی۔

"اتفاق کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہے۔" میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا "ایک لائن لکھ کر دے رہا ہوں آپ نے اسے روزانہ رات تین اور چار بجے کے درمیان کسی بھی وقت صرف تینتیس مرتبہ پڑھ کر اپنے مقصد کے لیے اللہ سے دعا کرنا ہے کام بہت آسان ہے بمشکل پانچ سے دس منٹ میں نمٹ جائے گا لیکن اس وقت کو مینج کرنا بہت مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔"

"میں مینج کرلوں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں رات کو دیر تک جاگنے کی عادی ہوں۔ بعض اوقات تو فجر کی اذان بھی ہو جاتی ہے۔"

میں نے ایک پرچہ اس کی جانب بڑھا دیا اس نے پڑھا۔

"یا رحیم ارحمنی"

"بالکل درست۔" میں نے کہا "صرف 33 مرتبہ پڑھنا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی سمپل ہے قریشی صاحب۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

"ہاں سمپل تو ہے مگر اثر پذیری میں کسی عمل انگیز کی طرح کام کرتا ہے۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ سادہ سی لائن رحمت خداوندی کو جوش میں لے آئے گی۔"

اس نے میرا ڈھیروں شکریہ ادا کیا اور چھ زاپچوں کی فیس کی رقم کرارے نوٹوں کی شکل میں میری جانب بڑھا دی میں نے گنے بغیر وہ نوٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی میز کی دراز میں ڈال لیے اور یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

"اور اس دوران میں آپ نے کوئی بھی اسپیئر پارٹ نہیں کھانا۔"

"اسپیئر پارٹ...... مطلب؟" اس نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کلیجی، پائے، سری، مغز، پوٹا (سنگ دانہ) گردے...... وغیرہ۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"جی سمجھ گئی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

اس کے بعد اس نے مگرمچھ کی کھال سے تیار کردہ اپنا بیش قیمت پرس اٹھایا اور ممنونیت بھرے انداز میں مجھے "خدا حافظ" کہہ کر رخصت ہو گئی۔

❀......❀......❀

تین روز بعد جب میں آفس پہنچا تو میری ٹیبل پر ایک معروف کوریئر کمپنی کا پیکٹ پڑا ہوا تھا میں نے اس پیکٹ کو الٹا کر دیکھا تو وہاں بھیجنے والے کا نام میمونہ لکھا نظر آیا میں سمجھ گیا کہ اس پیکٹ میں کیا ہو سکتا ہے۔

میں نے مذکورہ پیکٹ کو کھولا تو اس کے اندر سے پیک کی ہوئی ایک استعمال شدہ مردنہ شرٹ برآمد ہوئی اس کے ساتھ ہی سیلوفین کی دو چھوٹی تھیلیاں بھی رکھی تھیں جن میں سے ایک میں ترشے ہوئے چند انسانی ناخن اور دوسری میں چند بال تھے میں نے ناخن اور بالوں والی دونوں تھیلیوں کو اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور شرٹ کو اپنے بریف کیس کے ساتھ رکھ لیا۔

"میں روزانہ جب آفس آتا اور جاتا تھا تو اللہ والی چورنگی سے میرا گزر ہوتا تھا وہاں چورنگی پر میں نے ایک ملنگ کو کھڑے دیکھا تھا جس نے شلوار کے اوپر ایک شرٹ پہنی ہوتی تھی اس کی شرٹ پر میل کی اتنی تہیں جمی ہوئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ

شرٹ چیک دار تھی دھاری دار یا پلین وہ ملنگ کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا بس چپ چاپ ایک جانب کھڑا رہتا تھا کسی نے کچھ دے دیا تو فبہا ورنہ اللہ مالک ہے میں نے یہ شرٹ اس ملنگ کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہمیں پیشہ ور بھکاریوں اور فقیروں میں فرق ضرور کرنا چاہیے پیشہ ور بھکاری اپنی کمائی اور دھندے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو وہ اس طرح آپ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتی ہے جبکہ فقیر اور ملنگ کبھی آپ سے کوئی تقاضا نہیں کرتے۔ دراصل وہ اس لیے ہاتھ نہیں پھیلاتے کہ انہیں کسی چیز کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ وہ بھیک مانگنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ڈیوٹی پر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں ان کے اندر روحانی طاقتوں کے کون کون سے خزانے چھپے ہوتے ہیں ان کی ڈیوٹی کون لگاتا ہے اور کیوں لگاتا ہے یہ ایک طویل موضوع ہے اس کہانی کے محدود صفحات ایسے حساس موضوع پر تفصیلی گفتگو کے متحمل نہیں ہو سکتے لہٰذا میں بھی صرف نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں بس اتنا بتا دوں کہ ان میں بعض ایسے ملنگ اور فقیر بھی ہوتے ہیں جو بیک جنبش نگاہ اس کائنات کو الٹا سکتے ہیں۔ اگلے روز مونا کا فون آ گیا رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''قریشی صاحب میں نے آپ کی مطلوبہ چیزیں بھیج دی ہیں امید ہے آپ کو مل گئی ہوں گی۔''

''جی بالکل مل گئی ہیں اور میں نے گزشتہ رات ہی سے عمل بھی شروع کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''گڈ۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولی۔ ''آپ نے اطمینان دلایا ہے تو میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اللہ خیر کرے۔''

''اللہ خیر ہی کرتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''لیکن اکثر اوقات انسان کو یہ ''خیر'' راس نہیں آتی اور وہ ''شر'' انگریزی کی کوششوں میں مبتلا رہتا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ اللہ پر کامل بھروسا رکھیں اور پھر دیکھیں کہ چالیس روز کے اندر کیا ہوتا ہے؟''

''جی...... بہت بہت شکریہ۔'' وہ تشکرانہ انداز میں بولی۔ دو چار مزید باتوں کے بعد ہمارے بیچ ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔ اس روز جب میں اپنے آفس سے نکلا تو جبران کی استعمال شدہ شرٹ پیک حالت میں میرے بریف کیس کے اندر موجود تھی۔ جب میں اپنی گاڑی میں بیٹھا تو میں نے وہ شرٹ بریف کیس میں سے نکال کر پسنجرز سیٹ پر رکھ لی تھی۔ جب میری گاڑی اللہ والی چورنگی پر پہنچی تو وہ ملنگ مجھے نظر آ گیا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

میں نے اس کے بالکل قریب پہنچ کر گاڑی روک دی پھر اپنی سائیڈ کا شیشہ گرا کر میں نے مذکورہ شرٹ اس ملنگ کی جانب بڑھا دی۔

اس نے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے شرٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

''بچہ نادان ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انجان ہے جب تک پاک پروردگار توفیق نہ دے کوئی کچھ نہیں کر سکتا کوئی کچھ نہیں جان سکتا، کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔'' اس نے سرخ انگارہ آنکھوں سے گھور کر مجھے دیکھا پھر چپ چاپ وہ شرٹ مجھ سے لے لی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس ملنگ نے وہ قیمتی برانڈڈ شرٹ اپنی میلی کچیلی شرٹ کے اوپر پہن لی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر انداز میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا میں نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

آئندہ روز جب میں اللہ والی چورنگی سے گزرا تو یہی توقع کر رہا تھا کہ آج اس ملنگ نے میلی شرٹ اتار کر اجلی شرٹ پہن لی ہو گی لیکن وہ ملنگ ہی کیا جو آپ کی سمجھ میں آ جائے اگر کسی ملنگ کے بارے میں آپ کے اندازے صد فیصد درست ثابت ہوں تو پھر وہ ملنگ، ملنگ نہیں رہتا اور آپ ایک عام انسان نہیں رہتے جب آپ کے انداز و اطوار اور سوچ بچار ایک عام انسان کی ذہنی سطح سے بلند ہو جاتی ہے تو پھر چیزوں کی حقیقت آپ پر آشکار ہونے لگتی ہے تب پتا چلتا ہے کہ ملنگ کے روپ میں وہ شخص کون تھا۔

اس ملنگ نے میرے اندازے کی ایسی کم تیسی کر ڈالی میلی اور اجلی شرٹ کا معاملہ تو رہا ایک طرف وہ تو سرے سے غائب ہی ہو گیا تھا جہاں میں روزانہ اسے دیکھتا تھا اب وہ جگہ خالی تھی خالی اور خاموش بالکل اس ملنگ کی طرح چپ چاپ......!'' اس دن کے بعد سے پھر وہ ملنگ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا نہ اللہ والی چورنگی پر اور نہ ہی شہر کے کسی حصے میں کم از کم میرے روٹ پر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ مکروہات زمانہ کی مصروفیت کے باعث چند روز بعد میں بھی اسے بھول گیا۔

لگ بھگ ایک ہفتے بعد مونا کی کال آئی اس وقت میں اپنے گھر میں تھا۔

''السلام علیکم قریشی صاحب۔'' اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں نے اس وقت فون کر کے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

''اتنی گنجائش کہاں ہے کہ آپ کو کامیابی حاصل ہو سکے۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''کیا مطلب قریشی صاحب۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

''میرا مطلب یہ تھا کہ میں آل ریڈی اتنا ڈسٹرب ہوتا ہوں کہ کوئی مجھے مزید کیا ڈسٹرب کرے گا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''اوہ آئی ایم سوری قریشی صاحب۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ کیوں ڈسٹرب ہیں سب خیریت تو ہے نا۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔''

''نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں مونا جی۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں وہ ڈسٹرب والی بات میں نے ایک خاص تناظر میں کی تھی۔''

''کیا میں وہ تناظر جان سکتی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ضرور کیوں نہیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔

''آپ نے بلاٹنگ پیپر (BLOTTING PAPER) کا نام سنا ہے نا۔ میرا مطلب ہے سیاہی چوس؟''

''جی بالکل سنا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کالج کے زمانے میں کیمسٹری کے پریکٹیکل میں اکثر بلاٹنگ پیپر استعمال کرتے تھے لیکن یہاں اس بلاٹنگ پیپر کا آپ کے ڈسٹرب ہونے سے کیا تعلق؟''

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''جس طرح بلاٹنگ پیپر کی سیاہی چوسنے کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ سیاہی چوسنے کے قابل نہیں رہتا یعنی وہ اتنا ڈسٹرب ہو چکا ہوتا ہے کہ اسے مزید ڈسٹرب کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی میں بھی......!''

”سب سمجھ گئی۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

”آپ کے پاس آنے والا ہر شخص آپ کو اپنی دکھ بھری کہانیاں سناتا ہے آپ کو بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سب کی بپتا سننا پڑتی ہیں جس کی وجہ سے آپ کے اندر کرب اور اذیت کے زہر غیر محسوس انداز میں جمع ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب جی اوب جاتا ہے۔“

”آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے مونا جی۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

”واقعی بعض اوقات میں بہت فیڈ اپ ہوجاتا ہوں یہ میرے پیشے کی مجبوری ہے کہ کوئی خوش باش شخص میرے پاس بیٹھ کر گپ شپ نہیں کرتا بلکہ ہر کوئی اپنے عذاب ڈسکس کرنے آتا ہے۔“

”تو آپ شادی کیوں نہیں کرلیتے؟“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔ ”زندگی کا کوئی ساتھی ہوگا تو آپ اس کے ساتھ بیٹھ کر اپنی پسند کی گپ شپ کرسکیں گے۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے۔“ میں نے بھی شوخی سے کہا۔ ”اب دیکھیں کب خدا کو منظور ہوتا ہے۔“

”میں نے سنا ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔“ اس نے کہا ”آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“

”جب ہم آسمانوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ جب بھی ہم اللہ کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی آتا ہے کہ ہمارا پروردگار آسمانوں کے اوپر کسی مسند اولیٰ پر فروکش ہے جہاں سے وہ پوری کائنات پر نگاہ رکھے ہوئے ہے لیکن حقیقت تصور سے بالکل مختلف ہے پاک پروردگار کسی کمپنی کے بگ باس کی طرح انسانی وجود کا مالک نہیں ہے جو آسمانوں کے اوپر کسی بند ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا سی سی ٹی وی کی مدد سے سب کو واچ کررہا ہو۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ مالک کائنات ہے اور کائنات کے ذرے ذرے کے اندر موجود ہے وہ ایک طاقت ہے، ایک توانائی ہے جو ہر ذی روح کے اندر رواں دواں ہے اس کی تلاش میں دشت وصحرا کی خاک چھاننا، پہاڑوں کی چوٹیوں پر جھنڈے گاڑھنا اور سمندروں کی تہوں مین غوطے لگانا وقت اور توانائی ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ کوئی گم شدہ شے نہیں جسے ڈھونڈا جائے۔ وہ تو آپ کے اندر موجود ہے آپ کی شہہ رگ سے زیادہ قریب۔ بس ذرا خلوص نیت اور دیانتداری کے ساتھ اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت ہے آپ اسے پالیں گے۔ جو لوگ اللہ کو اپنے وجود کے باہر زمین و آسمان کی وسعتوں میں تلاش کرتے ہیں ان کی زندگی ٹامک ٹوئیاں مارتے گزر جاتی ہے اور اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس کائنات میں ہر کام کے ہونے یا نہ ہونے کا ایک وقت مقرر ہے اور اس قدرت مطلق کی مرضی کے بنا نہ تو کوئی جوڑا بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کی منشا کے بغیر کوئی جوڑا ٹوٹ سکتا ہے جب اس کا حکم ہوگا تو میری شادی بھی ہوجائے گی۔“

”بالکل ٹھیک قریشی صاحب۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا ”میں یہ پوچھ کر بات کو طویل نہیں کروں گی کہ آپ نے اپنا زائچہ بنا کر یہ پتا چلانے کی کوشش کی ہوگی کہ آپ کی شادی کب تک متوقع ہے کیونکہ اس وقت میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا تھا۔“

”کیسی خوش خبری مونا جی؟“ میں ہمہ تن گوش

ہوگیا۔

”جبران آسٹریلیا جانے کی ضد کررہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا۔“ میں نے متعدل لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”وہ کس سلسلے میں آسٹریلا جانا چاہتا ہے، سیر و تفریح کے لیے یا کوئی اور مقصد ہے۔“

”اسٹڈی کے لیے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا نا جبران نے حال ہی میں اے لیول کیا ہے اسد اس کا یہیں اسلام آباد میں ایڈمشن کرنا چاہ رہے تھے لیکن جبران کی ضد ہے کہ وہ اسٹڈی کے لیے آسٹریلیا جائے گا اصل میں اس کا ایک کلاس فیلو بھی آسٹریلیا جارہا ہے بس اس کے ساتھ جبران کا بھی پروگرام بن گیا ہے بارہ سے چودہ لاکھ کا خرچہ ہے لیکن یہ ہے کہ زندگی بن جائے گی۔ یہ پہلے تین سال کا خرچہ ہے بعد کے دو سال میں پانچ چھ لاکھ مزید لگ جائیں گے۔ اگر وہ پانچ سال آسٹریلیا میں رہ کر پڑھ لے گا تو اس میں اسی کا بھلا ہے۔“

”بالکل اسی کا بھلا ہے اور بہت زیادہ بھلا ہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔

”وہ آسٹریلیا کی کس اسٹیٹ میں جائے گا۔“

”میلبورن میں“ اس نے بتایا۔ ”آپ اس کے زائچے کی روشنی میں بتائیں کہ یہ کام اس کے لیے کیسا رہے گا؟“

”بہت مفید اور کارآمد رہے گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”وہ جیسا کہ آپ نے بتایا آسٹریلیا بزنس کی تعلیم حاصل کرنے جارہا ہے تو آج کل بزنس ہی کا زمانہ ہے جبران کے زائچے میں زہرہ (VENUS) اور عطارد (MERCURY) کا برج سرطان میں قران ہے دونوں سیارے انیس ڈگری پر حالت قران میں ہیں ان دونوں سیاروں کا ملاپ ایک انسان کو ذہین، چالاک، جائیداد اور گاڑیوں کا مالک بنادیتا ہے۔

وہ شخص تفریح کا اور فنون لطیفہ کا شوقین ہوتا ہے اسے بدنظمی سے نفرت ہوگی یہ ملاپ ایک خوش گوار شادی شدہ زندگی کی نشان دہی بھی کرتا ہے اور خوب صورت شریک حیات کی گارنٹی دیتا ہے۔ ایسا شخص سماجی اور معاشی دونوں میدانوں میں بہت زیادہ کامیابیاں سمیٹتا ہے اگر یہ قرآن زائچے کے تیسرے یا نویں یا دسویں گھر میں ہو تو حامل زائچہ پڑھنے کا شوقین ہوگا ادب اور شاعری کی جانب اس کا خصوصی رجحان ہوگا۔ خوش قسمتی سے جبران کے زائچے کے نویں گھر یعنی سرطان میں یہ ملاپ ہورہا ہے اور اس کا شمس بھی برج سرطان ہی میں ہے جہاں شمس کو اوج حاصل ہوتا ہے لہٰذا قدرت کی طرف سے جو بھی ہورہا ہے ہونے دیں، جبران کو فوراً آسٹریلیا بھیج دیں اس میں جبران کی بھلائی اور بہتری ہے۔ وہ ثوبیہ سے دور چلا جائے گا تو اس زہریلے عشق کا بخار خود بخود اتر جائے گا۔“

”میں نے آپ کے بارے میں اسد سے ذکر کیا تھا۔“ مونا نے بتایا ”وہ بھی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اگر آپ کے پاس وقت ہو تو دو باتیں ان سے بھی کرلیں۔“

”کیا اسد اس وقت آپ کے پاس موجود ہیں۔“ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھ لیا۔

”نہیں، وہ دوسرے روم میں ہیں۔“ مونا نے بتایا۔

”بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن مجھے بریف کردیں کہ آپ نے اسد کو

میرے بارے میں کیا کیا بتا رکھا ہے تاکہ میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جسے بعد میں آپ کے لیے مینج کرنا مشکل ہوجائے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں میں نے اسد کے سامنے آپ کے علم اور تجربے کی تعریف ہی کی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں اسے بتا چکی ہوں کہ میں نے کراچی میں آپ سے ملاقات کی تھی اور آپ سے کچھ معاملات ڈسکس کیے تھے دراصل جب میں کراچی آکر آپ سے ملی تھی تو اس وقت اسد بھی میرے ساتھ کراچی آیا ہوا تھا ہم کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے اور ایک دن کے بعد ہی واپس اسلام آباد آگئے تھے میں نے آپ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں اسد کو بعد میں بتایا تھا۔"

"کیا اسد یہ بات جانتا ہے کہ آپ مجھے اس کے اور نورین کے "خفیہ تعلقات" کے بارے میں بتا چکی ہیں؟" میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولی۔ "اگر یہ بات اسد کے علم میں آئی تو اسے یقیناً برا لگے گا۔ لہٰذا آپ بھی اس سے بات کرتے ہوئے محتاط رہیے گا۔"

"شیور۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے بھی اسی احتیاط کے پیش نظر ہی آپ سے یہ سوال کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کی اسد سے بات کراتی ہوں۔" اس نے کہا۔

ایک منٹ کے بعد مونا کا شوہر اسد لائن پر تھا اس نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔

"اسلام علیکم قریشی صاحب کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا کرم ہے اسد بھائی۔" میں نے کہا۔ "آپ سنائیں کیسی گزر رہی ہے؟"

"بس سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔ "بھئی میری بیگم تو آپ کے علم کی معتقد ہوگئی ہے کبھی اسلام آباد آنا ہو تو ہمیں شرف میزبانی ضرور بخشیے گا۔"

"جی......ضرور......!" میں نے کہا۔

"پورے پاکستان میں آپ کا انکم ٹیکس کا کوئی ایشو ہو تو آپ بلا تکلف مجھے بتا سکتے ہیں۔" وہ دوستانہ انداز میں پیش کش کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کے کسی بھی کام آکر مجھے دلی مسرت ہوگی۔"

"اول تو یہ کہ میں اپنی سالانہ آمدنی پر بالکل نیٹ اینڈ کلین ٹیکس ادا کرتا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا اس طرف سے تو مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے۔ بہ فرض محال اگر کوئی ایشو کبھی سامنے آیا تو پھر آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔"

"موسٹ ویلکم۔" وہ خلوص دل سے بولا پھر پوچھا۔ "سیاسی حالات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں کیا موجود حکومت اپنی مدت پوری کرے گی؟"

"پاکستانی سیاست کے بارے میں پیش گوئی کرنا سب سے مشکل کام ہے، اسد صاحب۔" میں نے کہا۔

"اور پاکستان کی کرکٹ کے بارے میں بھی۔" وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "اس لیے میں ان دونوں شعبوں کے حوالوں سے لب کشائی کرتے ہوئے بہت محتاط رہتا ہوں البتہ جس روز اس الیکشن کے نتائج آئے تھے اور یہ حکومت بنی تھی میں نے پریس کلب میں اپنے چند دوستوں کے بیچ بیٹھ کر یہ بات کی تھی کہ اس حکومت پر آزمائش کے دو بڑے مرحلے آئیں گے اگر حکومت نے ان دونوں مراحل کا پریشر جھیل لیا تو پھر یہ اپنی

مدت ضرور پوری کرے گی۔"

"ذرا ان دونوں مراحل کے بارے میں بھی بتا دیں۔" اسد نے پوچھا۔

"پہلا مرحلہ تو وہ تھا جب آپ کے اسلام آباد میں دھرنا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "حکومت نے اپنے اعصاب کی مضبوطی کا مظاہرہ کیا اور اس طوفانی ریلے سے صحیح سلامت نکل گئی۔ دوسرا مرحلہ اس سال یعنی 2015ء میں جولائی کے اختتام سے ستمبر کے وسط تک کا ہے۔"

"اوہ......مطلب یہ کہ ملک میں کسی نئے انتشار کی آمد آمد ہے۔" اسد نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"میرا علم تو یہی بتاتا ہے۔" میں نے سادہ انداز میں کہا "باقی جو اللہ کو منظور۔"

"اللہ کرے سب خیریت گزرے۔" وہ امید بھرے لہجے میں بلا۔ "جمہوریت کو چلنا چاہیے۔"

"میں بھی جمہوریت کے چلنے کا قائل ہوں، بشرطیکہ وہ جمہوریت ہو۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ایسی جمہوریت جس کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو یہ شعر پڑھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اے مہرتاب ناک، تیری روشنی کی خیر
کچھ لوگ زیر سایہ دیوار جل گئے

"آپ نے بہت گہری بات کردی ہے قریشی صاحب۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ان شاء اللہ آپ سے ملاقات میں مزہ آئے گا۔"

"ان شاءاللہ۔" میں نے کہا۔

پھر مونا لائن پر آگئی میں نے پوچھا۔ "میں نے آپ کو پڑھنے کے لیے کچھ بتایا تھا۔"

"جی وہ میں نہایت پابندی سے پڑھ رہی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "اور وہ آپ کے بتائے ہوئے وقت پر ہی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "اللہ کرم کرے گا۔"

"قریشی صاحب آپ اپنا اکاؤنٹ نمبر مجھے ٹیکسٹ کردیجیے گا۔" مونا نے کہا۔

"وہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"گھبرائیں نہیں یہ کوئی انکم ٹیکس کا ایشو نہیں ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"پھر بھی بتائیں تو سہی۔" میں نے کہا۔ "آپ میرے اکاؤنٹ کی ڈیٹیل کیوں مانگ رہی ہیں؟"

"قریشی صاحب اس دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی شے وقت ہے۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔ "اور آپ نے مجھے اپنی یہ قیمتی چیز دی ہے لہٰذا میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔"

"اوکے۔" میں نے اس کے مقصد کی تہ میں اترتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آپ کو اپنی اکاؤنٹ ڈیٹیل سینڈ کرتا ہوں۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اختتامیہ کلمات کے بعد فون بند کردیا۔

❁......❁......❁

لگ بھگ ایک ماہ کے بعد مونا کی کال آئی اس وقت میں اپنے آفس میں موجود تھا۔ رسمی علیک سلیک

یاد رکھنا

زندگی میں انسان ہر قدم محض اپنی خوشی کے لیے نہیں اٹھاتا بعض اوقات اسے خود سے وابستہ لوگوں کے لیے بھی جینا پڑتا ہے ان کی خوشیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

احمد علی......ملتان

کے بعد میں نے پوچھا۔

”جبران کیسا ہے اس کے اسٹڈی پراسس کا کیا ہوا؟“

”وہ تو پچھلے ہفتے میلبورن جاچکا۔“ اس نے بتایا۔ ”اگست سے اس کی کلاسس شروع ہوجائیں گی۔“

”یہ بہت اچھا ہوا۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ”اب پانچ سال کے لیے آپ کو بیٹے کی جدائی برداشت کرنا ہوگی لیکن یہ ہے کہ ان کی زندگی بن جائے گی۔“

”پانچ سال کی جدائی برداشت کریں میرے دشمن۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”سال میں ایک آدھ چکر آسٹریلیا کا ہم لگائیں گے اور یونیورسٹی کی سالانہ چھٹیاں گزارنے وہ پاکستان آجایا کرے گا۔“

”دوسری پارٹی کا کیا حال ہے؟“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”سچ پوچھیں تو میں نے اس وقت ثوبیہ کے لیے آپ کو فون کیا ہے۔“ وہ پریشانی سے لبریز لہجے میں بولی۔

”کیوں۔“ میں نے سوال کیا ”کیا ہوا ثوبیہ کو؟“

”میں ذرا اس کے چارٹ کی اسٹڈی کرانا چاہتی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اگر آپ اس وقت فری ہوں تو ورنہ میں بعد میں فون کرلوں گی۔“

میں اس وقت فارغ ہی بیٹھا تھا لہٰذا میں نے کہا۔ ”آپ کے لیے میں فری ہی ہوں کہیں کیا معاملہ ہے۔“

”قریشی صاحب پچھلے چند روز سے ثوبیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے تشویش بھرے لہجے میں بتایا۔ ”پہلے تو میں یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ جبران کے آسٹریلیا چلے جانے کی وجہ سے ہے لیکن کل اس کے بارے میں ایک ہولناک انکشاف ہوا ہے۔“

”کیسا انکشاف؟“ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

”ثوبیہ کو ”سی“ ہوگیا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے ہیپاٹائٹس سی؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”جی، میرا یہی مطلب ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”ہیپاٹائٹس سی یعنی کالا یرقان۔“

”اوہ، یہ تو واقعی بڑی فکر مندی والی بات ہے۔“ میں نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس مرض میں ذرا سی بھی کوتاہی یا اس کے علاج میں تاخیر ہوجائے تو بڑے سنگین نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔“

سچی بات تو یہ ہے کہ ثوبیہ کی بیماری کا سن کر مجھے دلی صدمہ ہوا تھا مونا کے خانگی مسائل جو بھی رہے ہوں مگر اس میں ثوبیہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اسے بھری جوانی میں ایسا خطرناک مرض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ابھی محض انیس سال کی تھی۔ جبران انیس سو پچانوے کی پیدائش تھا اور ثوبیہ انیس سو چھیانوے کی یہ عمر تو زندگی کو انجوائے کرنے کی ہوتی ہے۔

”قریشی صاحب۔“ میری سماعت میں مونا کی آواز ٹکرائی۔ ”ثوبیہ کے سلسلے میں کوتاہی بھی ہوچکی اور تاخیر بھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونک اٹھا۔

اس نے بتایا ”جیسے ہی پتا چلا تھا کہ اسے ہیپاٹائٹس سی ہوگیا ہے تو فوراً کسی مستند ڈاکٹر سے اس کا میڈیکل ٹریٹ منٹ شروع ہوجانا چاہیے تھا لیکن یہاں ہوا یہ کہ ایک ہفتہ تو دم درود اور یرقان جھڑوانے میں گزر گیا اس سے ثوبیہ کا تو کچھ بھلا نہ ہوا تاہم بعض باباؤں کی خوب کمائی ہوگئی۔“ لمحے بھر کو وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر شکستہ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”قریشی صاحب۔ میں ثوبیہ کی دشمن نہیں ہوں وہ بہت پیاری، بہت معصوم بچی ہے پلیز آپ اس کا زائچہ اسٹڈی کر کے کوئی امید افزا بات بتائیں۔“

”میں آپ کے احساسات اور جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ اپنے منہ سے نہ بھی کہیں تو میں جانتا ہوں کہ آپ ثوبیہ کی دشمن نہیں ہیں آپ تو اپنے بیٹے کو محض اسے لیے ثوبیہ سے دور کرنا چاہتی تھیں کہ گناہ کے تسلسل کو روکا جاسکے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ ناسیدی انداز میں بولی۔

”اب بتائیں ثوبیہ کا زائچہ کیا کہہ رہا ہے؟“

”جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ ثوبیہ کا مشتری زائچے کے چھٹے گھر جدی میں بیٹھا ہے چھٹا گھر بیماری کو ڈیل کرتا ہے اور مشتری انسان کے جگر اور لبلبے کو کنٹرول کرتا ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ہیپاٹائٹس سی کا ڈائریکٹ تعلق جگر سے ہی ہے۔ مشتری ویسے بھی جدی میں حالت ہبوط (DEBILITATION) میں ہوتا ہے لہٰذا ثوبیہ کے ساتھ جگر کا کوئی ایشو تو ہونا ہی تھا جبکہ مشتری پانچویں اور آٹھویں گھر کا حاکم بھی ہے۔ آٹھویں گھر کا حاکم جب چھٹے گھر میں ہوتا ہے تو شدید نوعیت کی بیماری لاتا ہے۔ ازیں علاوہ......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ثوبیہ کے زائچے کے نویں گھر یعنی حمل (ARIES) میں زحل، کیتو اور مریض موجود ہیں۔ زحل، برج حمل میں حالت ہبوط میں ہوتا ہے جبکہ یہ مریخ (MARS) کا اپنا گھر ہے۔ کیتو (KETU) کی تاثیر مریخ کے برابر مانی جاتی ہے اور یہ دونوں یعنی مریض اور کیتو، زحل (SATURN) کے ازلی ابدی دشمن ہیں اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ ثوبیہ کے زائچے کے نویں گھر میں کیا اودھم مچا ہوگا جبکہ زحل چھٹے گھر کا حاکم بھی ہے۔ میرے خیال میں ثوبیہ کو دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔“

”اوہ، آپ تو مجھے مایوس کر رہے ہیں قریشی صاحب۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”نہیں، میں آپ کو مایوس نہیں کر رہا۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”میں تو آپ کو اللہ کے نزدیک کر رہا ہوں صرف دعا ہی اللہ اور بندے کے بیچ ڈائریکٹ تعلق ہے اور یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ صدقہ اور دعا ناممکن کو ممکن بنادیتے ہیں۔ کیونکہ کوئی کام انسان کے لیے ناممکن ہوسکتا ہے مگر پروردگار کے لیے نہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اس کے ”کن“

فلسفۂ زندگی

زندگی کو جب بھی دیکھا عجب ہی پایا‘ کبھی یہ دھنک کی طرح سات رنگ بکھیرتے ہوئے نظر آئی‘ کبھی گھرے بادل کی طرح اپنے اوپر اداسی کا گھرا خول لیے نظر آئی‘ کبھی میں نے زندگی کو دریاؤں اور سمندروں کی جوش مارتی ہوئی لہروں کی طرح متحرک پایا۔ کبھی میں نے زندگی کو برف پوش پہاڑوں کی مثل منجمد پایا‘ جو حرارت ملتے ہی چیخ جاتے ہیں‘ کبھی زندگی کو برستی ہوئی موسلا دھار بارش کی مانند پایا جو دکھوں اور غموں کی کثافت کو شفاف کردیتا ہے۔ کبھی زندگی کو الجھی ہوئی ڈور کی مانند پایا جو رشتوں میں الجھی ہوتی ہے‘ کبھی زندگی کو میں نے خوب صورت تتلی کی مانند دیکھا جو اُڑتی ہوئی سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیتی ہے لیکن جب میں نے زندگی کی حقیقت کو بہت قریب سے جانا تو سمجھ میں آیا کہ یہ تو خدا کی لازوال نعمت ہے جس کا ہم شکر ادا نہیں کرتے۔

شاہد ہاشم...... کھڈیاں خاص

کہنے سے "فیکون" ہوجاتا ہے۔

"اس بات سے تو میں اتفاق کرتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں کافی دیر تک اس کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا میری باتوں سے اسے خاصی تقویت حاصل ہوئی۔ میں نے اسے صدقہ کی تاکید کی۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا ٹیلی فونک سلسلہ موقوف کرنے سے پہلے کہا۔

"قریشی صاحب آپ اپنا اکاؤنٹ چیک کرلیجیے گا میں نے صبح آپ کی فیس آن لائن ڈیپازٹ کرادی تھی۔"

"شکریہ۔" میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ ثوبیہ کی بیماری کا سن کر میں بھی رنجیدہ ہوگیا تھا اور میری دلی دعا تھی کہ اللہ اسے صحت کاملہ عطا فرمائے۔

❀......❀......❀

دو روز بعد مونا کا فون آیا وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی میں اس وقت گھر ہی میں تھا اور آفس جانے کی تیاری کرر ہا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"قریشی صاحب، آپ کا عمل کہاں تک پہنچا؟"

سچی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی عمل ومل نہیں کرر ہا تھا اس کے بھیجے ہوئے جبران کے ناخن اور بال میں نے ڈسٹ بن میں پھینک دیے تھے البتہ میں نے کیلنڈر پر چالیس روز کی تاریخوں کو دائرہ بند کردیا تھا میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔

"آج چالیس واں دن ہے یعنی آج میرا عمل مکمل ہوجائے گا۔"

"آپ بہت باکمال انسان ہیں قریشی صاحب۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "میرا کام تو ہوگیا لیکن ایک بات کا مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا۔"

"آپ کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی ہے۔" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "سب خیریت ہے نا؟"

"قریشی صاحب پچھلی رات ثوبیہ کی ڈیتھ ہوگئی۔"

"اوہ ویری سیڈ۔" میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ "یہ سن کر بہت افسوس ہوا جو اللہ کی مرضی۔"

"قریشی صاحب ہم نے خلوص نیت سے جبران کو ثوبیہ سے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "کیونکہ ان کے بیچ جو معاملات تیزی سے پروان چڑھ رہے تھے وہ بہت زہریلے اور خطرناک تھے میں نے کبھی ثوبیہ کا برا نہیں سوچا تھا میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ گناہ کا جو ڈراما نورین اور اسد نے رچایا تھا اس کی اگلی قسط میں جبران اور ثوبیہ نئے کردار نہ ہوں۔"

"آپ بالکل مطمئن رہیں اور اپنے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالیں۔" میں نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں آپ کا قطعاً کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ مسئلہ نہ تو آپ کے بس کا تھا اور نہ ہی میری آسٹرولوجی کے بس کا اس لیے ہم نے اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ جب کوئی معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے تو پھر اس کی طرف سے آنے والے فیصلے کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس نے آپ کی سن لی مگر اپنے انداز میں، ہم پاک پروردگار کو ڈکٹیشن نہیں دے سکتے۔ صرف اس کے حضور درخواست ہی کرسکتے ہیں۔ آپ نے رات کے آخری پہر میں اپنے مسئلے کے لیے جو لائن پڑھ کر دعا کی اس کے معنی ہیں۔ "اے رحم کرنے والی ذات میرے حال پر رحم فرما۔" آپ نے اپنا کام کردیا اس کے بعد پروردگار کی مرضی کہ وہ اپنا

کام کس انداز میں کرے۔ مالک نے آپ پر رحم فرمایا اور جبران اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آسٹریلیا چلا گیا یعنی ثوبیہ سے دور ہوگیا۔ ثوبیہ کی موت میں سراسر اس کے ورثا کا ہاتھ ہے آپ خود کو قصور وار نہ سمجھیں اگر بروقت ثوبیہ کو میڈیکل ٹریٹمنٹ مل جاتی تو اس کی جان بچائی جاسکتی تھی۔ اینی ہاؤ...... اللہ کے معاملات کو اللہ پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں قریشی صاحب۔" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔"

"آمین۔" میں نے تہہ دل سے کہا۔

دو چار رسمی باتوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔

آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے جبران کو ثوبیہ سے دور رکھنے کے لیے کسی قسم کا کوئی عمل نہیں کیا اگر کبھی یہ کہانی مونا کی نظر سے گزری تو وہ بھی حقیقت حال کو سمجھ جائے گی اور اسے مطمئن کرنے کے لیے بھی میرے پاس بہت سے دلائل ہیں۔ جہاں تک ثوبیہ کو ہیپاٹائٹس سی ہوجانے کا تعلق ہے تو اس بیماری کا رحجان پہلے سے اس کے زائچے میں موجود تھا۔ اگر جبران کے ساتھ اس کا کوئی سنجیدہ معاملہ نہ بھی ہوتا تو زندگی کے کسی موڑ پر اس کے جگر نے بے وفائی تو کرنا ہی تھی اب باقی رہ جاتی ہے مونا کی آخر شب کی چالیس روزہ دعائیں بے شک وہ خالق سب کی سنتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق بندوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بھی بخشتا ہے۔ وہ مسبب الاسباب ہے لیکن میں اس کیس میں ایک اور پہلو کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور وہ پہلو ہے اللہ والی چورنگی سے غائب ہوجانے والے ملنگ کا۔ میں نے جبران کی شرٹ اس ملنگ کو دیتے ہوئے کہا تھا "بچہ نادان ہے، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انجان ہے جب تک پاک پروردگار توفیق نہ دے کوئی کچھ نہیں کرسکتا، کوئی کچھ نہیں جان سکتا، کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔"

اس ملنگ نے سرخ انگار آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے نہ صرف یہ کہ وہ شرٹ مجھ سے لے لی تھی بلکہ اسی وقت اسے اپنی میلی شرٹ کے اوپر پہن بھی لیا تھا گویا یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اس نے نادان بچے کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ پروردگار سے توفیق دلانا انہی لوگوں کے بس کی بات ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اندر اللہ کو تلاش کرچکے ہوتے ہیں اور ڈائریکٹ اس ذات باری سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ شمشیر برہنہ کی مانند ہوتے ہیں ان کے سامنے سوچ پر بھی پکڑ ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمان الٰہی ہے کہ جو میرا ہوجاتا ہے میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اس کی آنکھیں اور اس کی زبان بن جاتا ہوں۔

میری شدت سے خواہش ہے کہ وہ ملنگ مجھے دوبارہ نظر آئے تاکہ میں بھی اس کے توسط سے کسی نظر فریب نظارے سے مستفید ہوسکوں۔ اگر وہ ملنگ آپ کو کہیں دکھائی دے تو پلیز مجھے ضرور بتائیے گا...... شکریہ۔

منک کوٹ

محمد جاذب

چوری ایک قبیح حرکت اور ناقابل معافی جرم ہے لیکن چوری کا مال خریدنا بھی کسی جرم سے کم نہیں۔
خوب صورت اور قیمتی اشیاء کی شائق ایک حسینہ کا قضیہ' اس نے غلطی سے ایک مسروقہ منک کوٹ خرید لیا تھا۔

''ارے ممی یہ خبر سنیں۔'' انیبل نے چائے کی پیالی ایک طرف کھسکاتے ہوئے اخبار میز پر پھیلا دیا اور غور سے ایک خبر پڑھنے لگی۔

''میں ساری رات سو نہیں سکی ہوں انیبل۔'' اس کی ممی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ساری رات میری پلک بھی نہیں جھپکی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ گھر میں جو اتنی بڑی رقم رکھی ہے اس کو کہاں محفوظ کروں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس رقم کی وجہ سے ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔''

ممی آپ خبر تو سنیں۔'' انیبل نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی وہ خبر سنانے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا اور اس نے اشتہارات والا صفحہ کھولا ہوا تھا۔

''ایک خوب صورت منک کوٹ فروخت کے لیے موجود ہے جو بہت ارزاں قیمت پر دیا جائے گا خواہش مند جمعہ کی صبح جلد از جلد چار سو سولہ اسٹریٹ ولن پر پہنچ جائیں۔''

''اوہ، انیبل تمہیں کب عقل آئے گی؟'' اس کی ممی نے کہا۔

''ممی آپ ہمیشہ میری ہر بات پر انکار کر دیتی ہیں۔'' انیبل نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''لیکن یوں الٹی سیدھی چیزیں خریدنے پر رقم خرچ کرنا بھی تو حماقت ہے۔''

''آخر وہ رقم آپ کسی نہ کسی چیز کو خریدنے میں

خرچ کرنا بھی تو حماقت ہے۔''
''آخر وہ رقم آپ کسی نہ کسی چیز کو خریدنے میں

خرچ تو کریں گی؟'' انیبل نے کہا۔

''نہیں میں تمہیں منک کوٹ خریدنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''ٹھیک ہے میں آفس جاتے ہوئے راستے میں اس کوٹ کو ایک نظر دیکھوں گی تو ضرور کیونکہ اسے دیکھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔'' انیبل نے مردہ لہجے میں کہا۔

''اس سے زیادہ حماقت کی بات میں نے اور کوئی نہیں سنی۔ آخر تم اس کوٹ کا کرو گی کیا۔ آپ جانتی ہو ہم جن لوگوں کے درمیان رہتے ہیں وہاں تمہیں کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ انسان کو اپنے ماحول کے مطابق ہی رہنا چاہیے۔'' اس کی ممی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آخر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟''

''پھر کیا کرو گی؟ تمہیں تو اچھی فر کی بھی پہچان نہیں ہے۔'' اس کی ممی نے کہا۔

''مجھے سب پہچان ہے اور میرے پاس پانچ سو ڈالر بھی موجود ہیں۔'' انیبل نے اپنا کوٹ پہنتے ہوئے اس کی جیب پر ہاتھ مارا۔

''تم جانتی ہو کہ تم ایک اچھا اور نیا منک کوٹ پانچ سو ڈالر میں نہیں خرید سکتیں۔''

''آپ کو کچھ بھی پتا نہیں ہے۔'' انیبل نے چڑ کر

کہا اور دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی ابھی اس کا دفتر کھلنے میں کافی دیر تھی کیونکہ جمعے کو اس کا دفتر دیر سے کھلتا تھا وہ آفس جاتے ہوئے راستے میں بڑی آسانی سے اس کوٹ کو دیکھ سکتی تھی۔ گھر سے نکلتے نکلتے اس کی ممی نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ان کی ایک بھی نہیں سنی تھی۔

ولسن اسٹریٹ کے علاقے میں اس نے اپنی کار کی رفتار سست کر دی۔ جس گھر کا نمبر اخبار میں لکھا ہوا تھا اس پر دو نمبر پلیٹیں لگی تھیں۔ انیبل کو اس حماقت پر ہنسی آ گئی تھی۔ انیبل نے اس مکان کے سامنے کار روک دی اس کے سیدھے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا جس کا اشتہار والا صفحہ اب بھی اوپر ہی تھا۔ اشتہار پر اس نے ہرے رنگ کی روشنائی سے لہریے دار لائن کھینچ دی تھی۔

وہ کار سے اتر کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھی اس کے بائیں ہاتھ والے دروازے پر چار سو چودہ نمبر لکھا تھا اور چار سو سولہ نمبر اوپر تھا جس کے لیے دائیں ہاتھ پر زینہ بنا ہوا تھا ابھی انیبل وہاں کھڑی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ زینے سے اوپر جائے یا نہ جائے کہ بائیں ہاتھ کے دروازے کا پٹ کھلا۔ دروازے کے سامنے آج کا اخبار پڑا تھا پٹ کے پیچھے سے ایک ہاتھ باہر آیا اور اخبار اٹھا کر واپس اندر چلا گیا۔ انیبل کو اچانک خیال آیا کہ اب تک بہت سے لوگ صبح کا اخبار لے چکے ہوں گے اور ان میں سے کئی ہوں گے جو اشتہار دیکھ کر کوٹ خریدنا بھی چاہیں گے اس نے سوچا کہیں اسے یہاں پہنچنے میں دیر تو نہیں ہوگئی وہ تیزی سے زینے چڑھتی ہوئی اوپر پہنچ گئی اور دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔

دروازہ ایک دراز قد اور سرخی مائل بھورے رنگ کے بالوں والی عورت نے کھولا تھا۔

''جی؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اشتہار دیکھ کر آئی ہوں۔'' انیبل نے کہا۔

''اوہ اچھا، اندر آجاؤ۔'' عورت نے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا اور انیبل اندر داخل ہوگئی۔

''تم کافی جلدی آئی ہو۔'' اس عورت نے کہا وہ کچھ ہانپ رہی تھی۔

''کیا تم اکیلی ہو؟''

''ہاں میں اکیلی ہوں، کیا میں وہ کوٹ دیکھ سکتی ہوں؟'' انیبل نے کہا۔

''جی ہاں، ضرور۔'' اس عورت نے باہر کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور کمرے میں کھلنے والے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئی انیبل اپنی جگہ کھڑی تھی ایک لمحے کو اسے خیال آیا تھا کہ اس نے اپنی ممی کی بات نہ مان کر شاید کوئی غلطی کی ہے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کوٹ پرانا ہوتا پھر اس کے پاس صرف پانچ سو ڈالر کی رقم تھی جو کسی طرح بھی ایک منک کوٹ کی خریداری کے لیے کافی نہیں ہوسکتی تھی۔

چند لمحوں بعد سرخی مائل بھورے بالوں والی وہ دراز قد عورت کمرے میں دوبارہ داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک نیا منک کوٹ تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اسے پہن کر دیکھنا پسند کرو گی؟'' اس نے انیبل سے پوچھا اور انیبل نے کسی معمول کی طرح اپنا پرس قریب رکھی میز پر ٹکا دیا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار بھی رکھ دیا اور منک کوٹ تھام لیا۔ اس کی چکنی اور نرم آستین میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے انجانی خوشی محسوس کی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ یا تو وہ پاگل ہوگئی ہے اور یا یہ کوٹ ہی اتنا اچھا ہے کہ وہ اسے کسی قیمت پر اب خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی۔

''اس کی کیا قیمت ہے؟'' اس نے دراز قد عورت کو دیکھتے ہوئے کہا جبکہ اس کے ہاتھ کوٹ پر آہستہ آہستہ پھسل رہے تھے وہ اس کی نرمی کو محسوس کر رہی تھی۔

''تم کیا قیمت دے سکتی ہو؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''اس کے علاوہ میں یہ بتا دوں کہ میں کیش لینا پسند کروں گی۔''

''میرے پاس پانچ سو ڈالر ہیں اور بس۔'' انیبل نے کہا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ عورت اتنی کم رقم میں کوٹ دینے سے انکار نہ کردے۔

''رقم میں ابھی لوں گی تمہارے پاس اس وقت رقم ہے؟'' اس نے انیبل نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''یہ کوٹ نیا سا لگ رہا ہے۔'' انیبل نے خود سے سرگوشی کی۔

''ہاں یہ نیا ہی ہے۔'' وہ عورت جلدی سے بولی میں نے اب تک نہیں پہنا۔'' اس عورت کے لہجے میں بیزاری تھی، جیسے وہ جلد از جلد انیبل سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔ انیبل نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی وہ کوٹ اس کی لمبائی کے لحاظ سے بالکل ٹھیک تھا جبکہ دراز قد عورت کے لیے وہ چند انچ چھوٹا ہوگا۔

''کیا یہ تمہارا کوٹ نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ میرے لیے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ مجھے میری نند نے تحفے میں دیا تھا اس نے بھی اسے کبھی نہیں پہنا تھا مجھے اچانک رقم کی ضرورت پڑ گئی ہے اگر تم اسے پسند نہیں کرو گی تو اسے کوئی اور لے جائے

عشق

پیار......! انسیت اور اپنائیت کا نام ہے۔
محبت ہماری ضرورت ہے' بقاء ہے۔
پیار وقتی ضرورت ہوتا ہے
محبت اس سے بہت آگے ہوتی ہے' محبت میں قربانی ہوتی ہے' مان ہوتا ہے' ضرورت ہوتی ہے' اس کے بنا سانسیں چلنا دشوار ہوتی ہیں۔
عشق کا درجہ ان سب سے اوپر ہے' اس میں نہ کوئی چاہ اور نہ ہی تسکین ہوتی ہے۔
عشق مجازی' عشق حقیقی کا جز ہے۔ عشق مجازی کی سیڑھی عشق حقیقی تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ عشق حقیقی کرنا سکھا دیتی ہے' عشق مجازی میں طلب ہے' جنون ہے۔
عشق حقیقی میں سرور ہے' عشق حقیقی صرف اسے ملتا ہے جو اپنی تیسری آنکھ کھول لے۔ قسمت والوں کی تیسری آنکھ کھلتی ہے' وہ آنکھ سیکھنے سے نہیں کھلتی بلکہ جب انسان شعور و تدبر کی منزلیں طے کرلیتا ہے تو تیسری آنکھ کھل جاتی ہے۔ شعور کی بہت منزلیں ہوتی ہیں' لاتعداد انہیں طے کرتا کرتا' انسان بوڑھا بھی ہوجاتا ہے مگر صوفی کی منزل تک نہیں پہنچ پاتا اور کبھی انسان ایک سجدے میں ہی خدا کو پالیتا ہے' پھر جو پانے میں وجد اور تسکین ہوتی ہے وہ ہماری روح کو پروانہ بنا دیتی ہے۔ ہمارے دل کی' ہمارے اندر کی جب تیسری آنکھ کھلتی ہے تو علم غائب' ظاہر و باطن سب سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ تب جو نشہ تیسری آنکھ سے دیکھنے سے ملتا ہے وہ دو آنکھوں سے کہاں...... جو حقیقت' کامل یقین اور بھروسے سے سب دیکھتی ہے سب......

نورالدین......کراچی

اشتہار دیکھ کر بہت سے لوگ یہاں آئیں گے؟'' اس نے کہا۔

''نہیں یہ بات نہیں یہ مجھے پسند آیا ہے۔'' انیبل نے جلدی سے کہا۔

''پھر تم اسے لے کیوں نہیں لیتیں؟'' عورت نے کہا اور انیبل نے میز پر رکھا ہوا اپنا پرس اٹھایا۔ پھر اس میں رقم نکال کر اس دراز قد عورت کی طرف بڑھا دی۔

''پورے پانچ سو ڈالر ہیں؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے اچھا شکریہ۔'' عورت نے کہا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اب انیبل کو مزید برداشت نہیں کرنا چاہتی جبکہ انیبل ابھی تک اس کوٹ ہی میں الجھی ہوئی تھی وہ گھوم گھوم کر کوٹ کو دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے اوپر یہ کوٹ بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' اس عورت نے آخری تیر چھوڑا اور انیبل مسکرانے لگی اس کی برسوں کی حسرت پوری ہوئی تھی سالوں سے اسے تمنا تھی کہ وہ بھی ایک منک کوٹ کی مالک ہو اور اب یہ خواہش پوری ہوگئی تھی۔

''کیا میں اسے پیک کردوں؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔'' انیبل نے جلدی سے کہا۔ ''میں اسے پہنے ہی رہوں گی۔''

"اچھا تو پھر خدا حافظ۔" عورت نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"ارے کیا آپ مجھے رسید وغیرہ نہیں دیں گی؟" انبیل نے باہر نکلتے نکلتے رک کر کہا۔

"اوہ ضرور۔" عورت کہتی ہوئی اندر کی طرف پلٹی پھر وہ کمرے میں کوئی کاغذ تلاش کرنے لگی۔

"کوئی کاغذ ہی نہیں مل رہا۔" اس نے کہا۔

"یہ لیں۔" انبیل نے میز پر رکھے اپنے اخبار کا ایک کونا پھاڑ کر اسے دیا۔

"میرے پاس کوئی پین بھی نہیں ہے۔" عورت نے کہا۔

"یہ لیں۔" انبیل نے اپنا پین اس کی طرف بڑھایا جس میں ہری روشنائی بھری تھی۔

"لاؤ۔" اس عورت نے پین لیا اور اخبار کے پھٹے ہوئے کونے پر لکھنے لگی۔

"میں نے ایک منک کوٹ مس......!" وہ انبیل کی طرف پلٹی۔

"انبیل سائمن۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ پھر لکھنے لگی۔

"میں نے ایک منک کوٹ مس انبیل سائمن کو پانچ سو ڈالر میں فروخت کیا ہے۔"

بی بیلڈون

اس نے عبارت لکھنے کے بعد کاغذ اور قلم انبیل کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ...... بہت بہت شکریہ مس...... مسز بیلڈون۔" انبیل نے کاغذ قلم لیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" اس عورت نے کہا۔

"میرا خیال ہے تم زینے سے نیچے تو خود ہی اتر جاؤ گی۔" اس نے انبیل سے پوچھا۔

"مجھے جلدی ہے کیونکہ مجھے لباس تبدیل کرنا ہے۔"

"ہاں ہاں بالکل میں چلی جاؤں گی۔" انبیل نے جواب دیا اور اس عورت نے دروازہ بند کر دیا۔

انبیل اپنا پرس لیے کار میں آ بیٹھی اور آفس کی طرف روانہ ہوگئی۔

کار ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہ کوٹ خرید کر کہیں کوئی حماقت تو نہیں کی اسے شبہ تھا کہ شاید یہ منک کوٹ نقلی نہ ہو اس لیے اسے اتنا سستا ملا ہو۔

جب وہ دفتر پہنچی تو ساڑھے آٹھ بجے تھے جبکہ دفتر نو بجے کھلتا تھا اس نے کار پارک کی اور اس میں ہی بیٹھی رہی وہ بار بار منک کوٹ کی فر پر ہاتھ پھیر رہی تھی جو دھوپ پڑنے سے چمک رہی تھی وہ بالکل نیا کوٹ تھا اس پر کوئی ایسی شکن نہیں تھی جس سے اندازہ ہو کہ اسے کسی نے پہنا ہے۔ کوٹ کے کالر پر دو حروف "اے" اور "ایم" لکھے تھے۔ جو بی بیلڈون کا مخفف نہیں ہو سکتے تھے انبیل کو خیال آیا کہ حروف بیلڈون کی نند کے نام کا مخفف ہوں گے ان حروف میں سے "اے" انبیل کا مخفف ہو سکتا تھا جبکہ "ایم" اس کے لیے بے کار تھا۔

وہ پانچ منٹ تک اپنی کار میں بیٹھی رہی پھر کوٹ کو سنبھالتی ہوئی کار سے اتر کر فٹ پاتھ پر ٹہلنے والے انداز میں آہستہ آہستہ چلنے لگی کہ ایک اسٹور تھا جس پر کمبلری فرز کا بورڈ لگا تھا اچانک انبیل کے ذہن میں خیال آیا کہ منک کوٹ کے اصل یا نقل ہونے کی پہچان کے لیے یہ بہترین جگہ ہو سکتی ہے وہ اسٹور کے قریب پہنچ گئی اندر روشنی تھی اور کسی مرد کا ہیولا نظر آ رہا تھا اس نے شوکیس کے شیشے کو ہلکے سے کھٹکھٹایا اور کسی نے اسٹور کا دروازہ کھول دیا۔

"فرمائیے۔" دروازہ کھولنے والے نے پوچھا۔

"میں ایک مشورہ لینا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"آپ اندر تشریف لے آئیں۔" اس شخص نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا وہ ایک نوجوان تھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ اچھی فر کی پہچان رکھتے ہوں گے؟" اس نے نوجوان سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"مہربانی کر کے بتائیں کہ میں نے جو کوٹ پہنا ہوا ہے وہ کیسا ہے؟"

"تو پھر مہربانی کر کے آپ کوٹ اتار کر مجھے دے دیں۔" اس نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اس کا جائزہ لے کر آپ کو بتاتا ہوں۔"

انبیل نے اس کے کہنے پر کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا اور نوجوان نے کاؤنٹر پر کوٹ کو بچھا کر اس پر انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں وہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا یہ منک ہے؟" انبیل نے پوچھا۔

"جی ہاں بالکل یہ اصلی منک ہے۔" نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا یہ اچھی منک ہے، بہت اچھی؟" انبیل نے تجسس سے پوچھا۔

"جی ہاں بالکل۔" نوجوان نے کہا پھر وہ کاؤنٹر کے قریب سے ہٹ گیا۔

"آپ ایک منٹ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے کہا اور اندر کی جانب سے کھلنے والے ایک دروازے سے اسٹور کے اندرونی حصے میں چلا گیا وہ اب انبیل کو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ اس کی آواز کی ہلکی ہلکی گونج سن سکتی تھی۔ وہ کسی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا پھر چند لمحوں بعد وہ واپس آ گیا تھا۔

"اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو فر کے متعلق بہت کچھ بتا سکتا ہوں؟" اس نے انبیل کا نام جاننا چاہا۔

"انبیل...... انبیل سائمن۔" اس نے کہا پھر وہ اسے ایک اچھی منک کی خصوصیات بتانے لگا تھا اس نے اسے بتایا تھا کہ ایک اچھی منک کو کس طرح پہچانا جا سکتا ہے وہ غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد اسے دفتر کا خیال آیا لیکن اس نے آج منک کوٹ خریدنے کی خوشی میں چھٹی کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ یہ سارا دن خوش رہ کر گھوم پھر کر گزارنا چاہتی تھی کچھ دیر بعد اسٹور کے دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔

"معاف کیجیے گا۔" نوجوان نے اس سے کہا اور دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔

"کیا تم نے ہی فون کیا تھا؟" آنے والے نے پوچھا۔

"میرا نام جارج ہے اور میرا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔" آنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔

"جی ہاں جناب۔" نوجوان نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"لیفٹیننٹ جارج یہ مس انبیل سائمن ہیں جن کے پاس ان کوٹوں میں سے ایک کوٹ ہے جو پچھلے جون میں کارسن اسٹور سے چرائے گئے تھے۔"

"واقعی؟" جارج نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"یہ کوٹ رعایتی قیمت میں بھی بارہ ہزار ڈالر سے کم نہیں ہوگا میں معافی چاہتا ہوں مس سائمن۔" نوجوان اسٹور کیپر نے انبیل کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کی رپورٹ ہر حالت میں کرنا تھی کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ایک اچھا شہری ہونے کا حق ادا نہ کر سکتا تھا۔"

"بہت خوب۔" انبیل نے کہا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں چور ہوں۔ میں نے یہ کوٹ چرایا ہے؟" انبیل نے غصے سے کہا۔

"نہیں۔" نوجوان نے ناگواری سے کہا۔

"اگر تم نے یہ کوٹ چرایا نہیں ہے تو یہ تمہیں کہاں سے ملا؟" لیفٹیننٹ جارج نے اس کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

جارج کے سوال پر انبیل نے سارا واقعہ اسے سنا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم اس جگہ چلتے ہیں۔" جارج نے کہا۔

"کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں لیفٹیننٹ؟" اسٹور کیپر نے پوچھا۔

"ضرور۔" جارج نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" نوجوان نے کہا اور اندر سے کسی کو آواز دے کر پکارا۔

"البرٹ تم ذرا اسٹور کا خیال رکھنا میں ابھی آتا ہوں۔"

"مسٹر کمبلری یہ کوٹ کسی محفوظ جگہ رکھ دو۔" لیفٹیننٹ جارج نے اسٹور کیپر کو مخاطب کر کے کہا۔

"بہت بہتر۔" کمبلری نے کہا۔

پھر وہ سب لیفٹیننٹ جارج کی کار میں ولسن اسٹریٹ تک پہنچے۔

"مجھے یقین نہیں ہے کہ مجھے میری رقم کبھی واپس مل سکے گی۔" انبیل نے لیفٹیننٹ جارج کی کار میں بیٹھے بیٹھے کہا۔

"میں نے بھی کیا حماقت کی ہے۔" وہ خود سے ہمکلام تھی۔ اس کی بات کا کسی نے جواب نہیں دیا تھا۔

پھر وہ اس گھر کے سامنے اترے جہاں سے انبیل نے منک کوٹ خریدا تھا۔

"چلو اب ہمیں راستہ دکھاؤ۔" لیفٹیننٹ جارج نے اس سے کہا اور وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ہمیں زینوں سے اوپر جانا ہوگا دائیں جانب سے۔" اس نے بتایا وہ دونوں اس کے ساتھ ہی اوپر پہنچے تھے۔ اس کی دستک پر ایک عورت نے دروازہ کھولا جس کا قد لمبا اور سر کے بال سرخی مائل بھورے تھے لیکن انبیل نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"جی فرمائیے۔" دروازہ کھولنے والی عورت نے پوچھا۔

"ہم منک کوٹ کے بارے میں پوچھنے آئے ہیں۔" سارجنٹ نے کہا۔

"میں سمجھی نہیں؟" اس عورت نے حیرت سے کہا۔

"اس لڑکی نے تم سے ایک کوٹ خریدا تھا؟"

"میں اب بھی نہیں سمجھی۔" اس عورت نے کہا۔

"یہ وہ عورت نہیں ہے۔" انبیل نے لیفٹیننٹ سے کہا وہ خود کو بہت چھوٹا اور خوفزدہ سا محسوس کر رہی تھی۔

"یہ وہ نہیں؟" لیفٹیننٹ نے بھی حیرت سے انبیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر مس بیلڈون کہاں ہے؟"

"یہاں اس نام کا کوئی نہیں رہتا۔" عورت نے جواب دیا۔

"میرا نام مسز جان اسپینسر ہے۔" اس نے اپنا نام بتایا۔

"کیا وہ گھر یہی ہے؟" لیفٹیننٹ نے انبیل سے پوچھا۔

"ہاں یہ وہی گھر ہے؟" انبیل نے جواب دیا۔

"مسز اسپینسر میرا نام لیفٹیننٹ جارج ہے میرا

تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے کیا ہم لوگ اندر آ سکتے ہیں؟"

"جی ہاں آپ اندر آ جائیں لیکن میں ابھی تک اصل معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی ہوں۔" مسز اسپینسر نے انہیں اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"کیا یہی گھر ہے؟" اندر آنے کے بعد پولیس آفیسر نے ایک بار پھر انبیل نے پوچھا۔

"ہاں۔" انبیل نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ وہی گھر ہے۔"

"اس لڑکی نے آج صبح یہاں سے ایک منک کوٹ پانچ سو ڈالر میں خریدا ہے۔" پولیس آفیسر نے مسز اسپینسر سے کہا۔

"واقعی؟" مسز اسپینسر نے ہنستے ہوئے کہا انداز ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے کوئی لطیفہ سنا ہو لیکن میرے پاس تو کبھی کوئی منک کوٹ نہیں تھا۔" اس نے بدستور ہنستے ہوئے کہا پھر اس نے خود کو ذرا سنبھالا۔

"میں معافی چاہتی ہوں دراصل میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں، میں ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی سو کر اٹھی ہوں۔" مسز اسپینسر نے کہا۔

"یہاں کوئی اور تو نہیں رہتا؟" پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آپ یہاں کب سے رہتی ہیں؟"

"دو سال سے۔"

"اگر میں یہاں اطراف کا جائزہ لینا چاہوں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"نن...... نہیں۔" مسز اسپینسر نے سوچتے ہوئے کہا اور لیفٹیننٹ اندر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا مسز اسپینسر انبیل کی طرف مخاطب ہو گئی تھی۔

"آپ بیٹھیں مس...... مس؟"

"یہ مس انبیل سائمن ہیں اور مجھے کمبلری کہتے ہیں۔" نوجوان اسٹور کیپر نے تعارف کرایا۔

"یہ سب کیا ہے؟" مسز اسپینسر نے پوچھا۔

"میں بھی اچھی طرح نہیں جانتا۔" کمبلری نے کہا اور انبیل کو بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہاں تو اور کوئی نہیں ہے؟" لیفٹیننٹ نے واپس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہاری وہ مس یا مسز بیلڈون کیسی تھیں، ان کا حلیہ بتاؤ؟" اس نے انبیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دراز قد اور سرخی مائل بھورے بالوں والی۔" انبیل نے جواب دیا۔

"یہاں تو ایسا کوئی نہیں ہے ہو سکتا ہے تم سے کوئی غلطی ہوئی ہو؟" مسز اسپینسر نے مداخلت کی۔

"ہاں ممکن ہے۔" پولیس آفیسر نے کہا وہ چبھتی ہوئی نظروں سے انبیل کو دیکھ رہا تھا۔

"اخبار کے اشتہار کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس پر اس گھر کا پتا ہی دیا گیا ہے اور میں اسی پتے پر یہاں آئی تھی۔" انبیل نے جلدی سے کہا۔

"کیا آپ کے پاس آج کا اخبار ہے محترمہ؟" پولیس آفیسر نے مسز اسپینسر سے پوچھا۔

"نہیں میں معافی چاہتی ہوں میرے پاس کوئی اخبار نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ یہی کہہ رہی ہیں نا کہ آپ کے پاس کوئی منک کوٹ نہیں تھا اور آپ نے کوئی کوٹ نہیں بیچا۔" پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"جی ہاں میں نے یہی کہا ہے؟" مسز اسپینسر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے شکریہ۔" پولیس آفیسر نے کہا اور پھر کمبلری اور انیبل سے مخاطب ہوا۔

"آؤ چلیں۔" اس نے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ انیبل اور کمبلری بھی اس کے ساتھ ہی باہر آئے تھے اور خاموشی سے زینے اترتے ہوئے نیچے آ گئے۔

"مجھے یقین ہے کہ یہاں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔" انیبل نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" کمبلری نے اس کی تائید کی۔

"ہاں۔" پولیس آفیسر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ ہی انیبل نے بغیر سوچے سمجھے بائیں جانب والے دروازے کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا جس کا نمبر چار سو چودہ تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"ہمیں اخبار تو دیکھنا چاہیے میں آپ کو اخبار دکھاؤں گی آج صبح یہاں اخبار آیا ہے میں نے دیکھا تھا وہ دروازے کے سامنے پڑا تھا۔"

اسی وقت چار سو چودہ کا دروازہ کھلا اور ایک مرد نے جھانک کر باہر دیکھا۔

"جی؟"

"کیا ہم آپ کا اخبار دیکھ سکتے ہیں؟" کمبلری نے کہا۔

"میرا...... مم......!" اس شخص نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر چپ ہو گیا۔

"میرا تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے اور مجھے لیفٹیننٹ جارج کہتے ہیں پولیس آفیسر نے انیبل کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پولیس؟"

"تمہارے یہاں آج کا اخبار آیا ہے؟"

"وہ...... ہاں...... لیکن وہ تمہیں کیوں چاہیے؟"

"میں صرف ایک نظر اخبار دیکھنا چاہتا ہوں اور چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔" پولیس آفیسر نے کہا۔

"بہتر۔" اس شخص نے کہا اور پورا دروازہ کھول دیا اور وہ تینوں گھر میں داخل ہو گئے۔

"تم اس جگہ کے مالک ہو؟" پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"جی ہاں میرا نام فرگوسن ہے بتائیں کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بس، چند سوالات پوچھنا ہیں پہلے تم اپنا اخبار دکھا دو۔" پولیس آفیسر کے کہنے پر فرگوسن نے ایک میز سے اخبار اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے انیبل کو دے دیا اور انیبل اس کے اشتہارات والے صفحے پر جھک گئی۔

"یہ...... یہ ہے وہ اشتہار۔" اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی کمبلری اور لیفٹیننٹ دونوں ایک ساتھ اس اخبار پر جھک گئے پھر ان دونوں کے سر تائید میں ہلنے لگے تھے۔

"کیا بات ہے؟" فرگوسن نے پوچھا۔

"مجھے تمہاری بات پر یقین ہے؟" کمبلری نے انیبل سے کہا۔

"اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔" انیبل نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی پولیس آفیسر فرگوسن سے مخاطب ہو گیا۔

"اس لڑکی کا کہنا ہے کہ آج صبح اس نے ایک قیمتی منک کوٹ اوپر والے گھر سے خریدا ہے۔"

"اوپر سے؟ مسز اسپینسر سے، لیکن میں نے تو

اسے کبھی کوئی منک کوٹ پہنے نہیں دیکھا۔"

"کبھی نہیں دیکھا، کیا تم شادی شدہ ہو مسٹر فرگوسن؟" آفیسر نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا اس کی نظریں پولیس آفیسر کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھیں جو ایک کرسی پر رکھے ہوئے ادھورے سوئٹر پر جمی تھیں جسے کوئی خاتون ہی بن سکتی تھی۔

"میری بہن مجھ سے ملنے آتی رہتی ہے وہ چند روز کے لیے یہاں آئی ہے اور اس وقت بازار گئی ہوئی ہے۔" فرگوسن نے کہا۔

"اگر میں اطراف کا جائزہ لوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں...... بالکل نہیں......!" فرگوسن نے جواب دیا اور لیفٹیننٹ اس کے ساتھ اس کے گھر کا جائزہ لینے چلا گیا کمرے میں انیبل اور کمبلری رہ گئے تھے۔

"تم کیا کہنے والی تھیں مس انیبل؟" کمبلری نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ وہ آدمی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے آج صبح جس آدمی کو یہاں سے اخبار اٹھاتے دیکھا تھا وہ یہ نہیں تھا۔" انیبل نے کہا۔

"لیکن تم نے کہا تھا کہ تم نے ایک مردانہ ہاتھ دیکھا تھا پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ کس کا ہاتھ تو ہو سکتا ہے؟"

"اس نے اپنی کلائی پر گھڑی الٹی باندھی ہوئی تھی یعنی گھڑی کا فیتہ اوپر کی طرف تھا اور گھڑی کلائی کی اندرونی جانب۔" انیبل نے کہا۔

"اوہ۔" کمبلری نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"مسٹر کمبلری ہم جس عورت سے ملے وہ اصل عورت نہیں ہے ہم جس مرد سے ملے وہ اصل مرد نہیں ہے لیکن یہ وہی جگہ ہے۔" انیبل نے کہا۔

"شش۔" کمبلری نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اس وقت پولیس آفیسر اور فرگوسن کمرے میں داخل ہوئے۔

"ٹھیک ہے مسٹر فرگوسن ہم آپ کو پھر زحمت دیں گے۔" پولیس آفیسر نے فرگوسن سے کہا اور کمبلری اور انیبل کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا جہاں پورچ میں مسز اسپینسر کئی عورتوں اور مردوں کے درمیان برہم کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں اخبار تھا اور وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"لیفٹیننٹ جارج مہربانی کر کے میرا پیچھا ان لوگوں سے چھڑاؤ۔" اس نے پولیس آفیسر کو آواز دی۔

"انہیں بتاؤ کہ یہ اشتہار غلطی سے چھپا ہے میں نے کوئی اشتہار نہیں چھپوایا اور میرے پاس فروخت کے لیے کوئی منک کوٹ نہیں ہے۔"

"یہ صحیح ہے حضرات۔" پولیس آفیسر نے اونچی آواز میں کہا۔

"ایسا لگتا ہے کہ اخبار میں یہ اشتہار غلطی سے چھپ گیا ہے۔"

اس نے کہا اور لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

"اوہ وہ آدمی...... وہ وہی ہے۔" انیبل نے ایک سمت کھڑے شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے براؤن رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا کمبلری تیزی سے اس کی طرف جھپٹا وہ شخص وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن کمبلری نے اسے موقع نہیں دیا اور گیٹ سے نکلنے سے پہلے ہی اسے پکڑ لیا سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"یہ سب کیا ہے کمبلری؟" پولیس آفیسر نے اس

کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔
"یہ...... یہ وہی آدمی ہے جس نے صبح چار سو چودہ نمبر میں سے اخبار اٹھایا تھا۔" انیبل نے کہا۔
"آپ اس کی گھڑی دیکھیں۔" انیبل کے کہنے پر پولیس آفیسر نے اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر اٹھای اور گھڑی دیکھی۔
"کیوں کیا بات ہے؟" اس نے انیبل سے پوچھا۔
"اس نے گھڑی کا فیتہ باہر کی جانب رکھا ہے اور اسی انداز سے گھڑی اس ہاتھ پر بھی بندھی ہوئی تھی جس نے صبح اس کے گھر کے باہر سے اخبار اٹھایا تھا۔" انیبل نے بتایا پھر اس کی نظریں زمین پر پڑے اخبار کی طرف اٹھ گئیں۔
"اس کا اخبار اٹھالیں۔" اس نے کہا اور پولیس آفیسر نے وہ اخبار اٹھالیا۔
"تمہیں کیسے معلوم کہ یہ اس کا اخبار ہے؟" پولیس آفیسر نے پوچھا۔
"یہاں موجود تمام لوگوں کے ہاتھوں میں اخبار ہے اور اس کے ہاتھ میں نہیں اور ایک ہی اخبار نیچے پڑا ہے یہ اس کا ہی ہے۔" انیبل کی اس بات پر پولیس آفیسر نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا انیبل درست کہہ رہی تھی۔
"پھر؟"
"پھر یہ کہ یہ اس کا نہیں میرا اخبار ہے۔" انیبل نے ایک اور انکشاف کیا۔
"آج صبح یہاں سے واپس جاتے ہوئے میں اپنا اخبار مسز اسپینسر کے گھر میں بھول گئی تھی اس میں موجود اشتہار پر میں نے ہرے رنگ کی روشنائی سے لہریے دار لکیر کھینچی ہوئی ہے۔"
"یہ کوئی خاص پہچان نہیں ہے ہری روشنائی تو کوئی بھی استعمال کرسکتا ہے۔" پولیس آفیسر نے کہا اور اسی وقت کمبلری بول پڑا۔
"تم نے کہا تھا کہ بیلڈون نے تمہارے اخبار کا کونا پھاڑ کر تمہارے ہی روشنائی والے قلم سے رسید لکھ کردی تھی۔"
"ہاں...... ہاں......!" اس نے جلدی سے کہا۔
"لیفٹیننٹ تمہارے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کا کونا بھی پھٹا ہوا ہے تو کیوں نہ وہ رسید اس کونے سے ملا کر دیکھ لی جائے؟" کمبلری نے پھر کہا اور اس کے ساتھ ہی انیبل نے اپنے پرس سے اخبار کا پھٹا ہوا ٹکڑا نکال کر لیفٹیننٹ کے سامنے کردیا۔
لیفٹیننٹ نے وہ ٹکڑا اخبار کے کونے سے ملایا اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس پھٹے ہوئے ٹکڑے اور اخبار کو لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔
"کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو؟" لیفٹیننٹ جارج نے چار سو چودہ نمبر کے دروازہ پر کھڑے فرگوسن سے پوچھا۔
"نہیں۔"
"کیا یہ آج صبح تمہارے یہاں آیا تھا؟" پولیس آفیسر نے پھر سوال کیا۔
"نہیں۔" فرگوسن نے پھر جواب دیا۔
"کیا تم اس آدمی کو جانتی ہو اور کیا یہ آج صبح تمہارے گھر آیا تھا؟" پولیس آفیسر نے مسز اسپینسر سے پوچھا جو زینے کے قریب کھڑی تھی۔
"نہیں۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کوئی نہیں جانتا تم یہاں نہیں آئے تھے تب تو تم بے گناہ ہو۔" پولیس آفیسر نے براؤن سوٹ والے شخص سے کہا۔
"جی ہاں۔"

"تو کیا تم اپنے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کی رسید دکھا سکو گے؟" پولیس آفیسر نے کہا۔
"جی وہ...... وہ تو میرے گھر پر ہے۔" پھر اس نے اپنے گھر کا پتا بتایا۔
"ہیری۔" اس شخص پر نظر پڑتے ہی مسز اسپینسر چیخی۔ اس نے ابھی تک ہیری کو نہیں دیکھا تھا۔
"اوہ اسپینسر، میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا کہ ایک شادی شدہ شخص پر وقت ضائع مت کرو۔" قریب کھڑے فرگوسن نے کہا اور پولیس آفیسر حیرت سے اس سرخ بالوں والی عورت کو دیکھنے لگا جسے وہ ابھی تک شادی شدہ سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ اس نے مسز اسپینسر کہہ کر اپنا تعارف کرایا تھا۔
"بھلا ہیری اور مجھے کیسے پتا چلتا کہ اس کی بیوی ہم دونوں کے ملنے پر اتنی خفا ہوجائے گی کہ ہیری کا دیا ہوا یہ کوٹ بھی فروخت کردے گی؟" اسپینسر نے کہا جسے فرگوسن نے اپنی بہن بتایا تھا۔
"خاموش ہوجاؤ۔" براؤن سوٹ والے شخص نے کہا۔
پھر لیفٹیننٹ جارج ہیری فرگوسن اور مس اسپینسر کو اپنی کار کی طرف لے گیا۔ کمبلری بھی اس کے پیچھے تھا وہاں کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں جس کے بعد پولیس آفیسر مس اسپینسر اور ہیری کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر لے گیا اور کمبلری واپس انیبل کے پاس چلا آیا تھا۔
"ہمیں ایک گھنٹے بعد اپنا بیان لکھوانے پولیس اسٹیشن جانا ہے۔ میں منک کوٹ لے کر پولیس آفیسر کے پاس جاؤں گا تم میرے ساتھ چلوگی؟" کمبلری نے انیبل سے پوچھا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"جس عورت نے تمہیں منک کوٹ فروخت کیا تھا وہ ہیری کی بیوی تھی۔" کمبلری نے اسے بتایا۔
"اور ہیری اور اس کی بیوی دونوں چور ہیں مس اسپینسر جو خود کو مسز اسپینسر کہہ رہی تھی فرگوسن کی بہن ہے وہ ہیری سے محبت کا ڈھونگ رچا رہی تھی جس کا اس کی بیوی کو علم ہوگیا اور اس نے ہیری سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا یہ بات ہیری نے ہی پولیس آفیسر کو بتائی ہے۔"
"کوٹ بیچنے کی وجہ رقم کی ضرورت بھی تو ہوسکتی ہے۔" انیبل نے کہا۔
"ہاں لیکن چوری کا کوٹ فروخت کرنا بھی تو حماقت ہے۔" کمبلری نے جواب دیا۔
"ہاں لیکن وہ کوٹ اس کے سائز کا بھی تو نہیں تھا۔"
"ہوں۔" کمبلری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
اور آپ نے تو حد کردی میرے کہنے پر ہیری جیسے عادی مجرم کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے اگر وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا دیتا تو؟"
"نہیں میں نے کوئی حماقت نہیں کی میرا خیال ہے کہ میں نے زندگی میں ایک یہی اہم کام کیا ہے۔" کمبلری نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ قدم ملاتا آہستہ آہستہ ولسن اسٹریٹ سے دور ہوتا چلا گیا۔

قسط نمبر1

روپ بہروپ

سلیم اختر

اس دنیا میں لوگوں کے کئی روپ ہوتے ہیں' ہر روپ دوسرے سے جدا اور نرالا ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے دنیا کو جان لیا ہے' سمجھ لیا ہے' جو بھی دنیا کے روپ کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے سامنے ایک نیا بہروپ سامنے آجاتا ہے۔

اس رنگ بدلتی دنیا کا احوال' نئے افق کے کنہ مشق لکھاری محمد سلیم اختر کے قلم سے ایک طویل ناول کی پہلی قسط۔

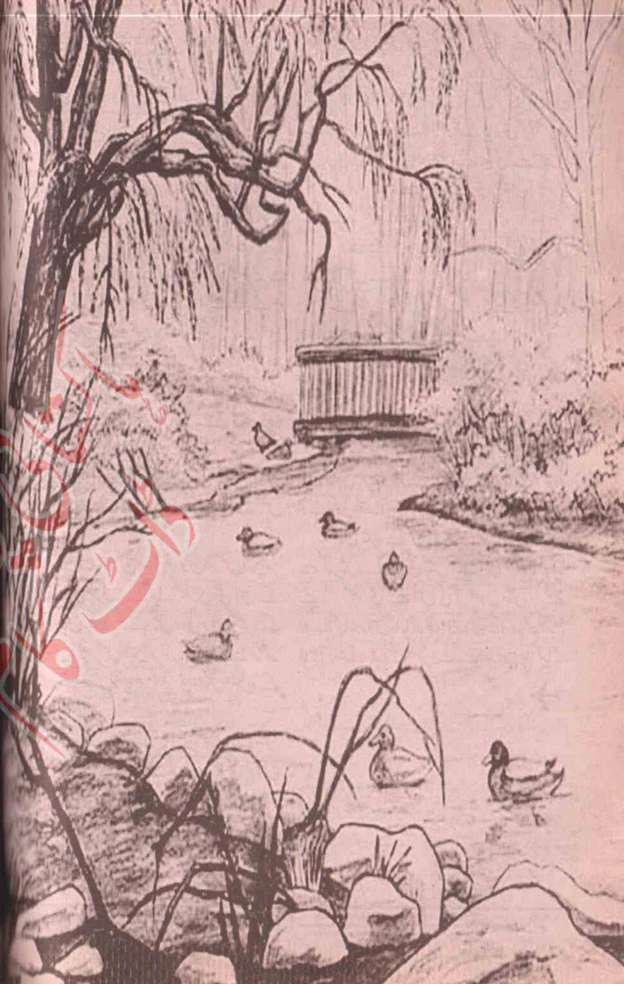

میں چھوٹے سے ذہن کا چھوٹا سا آدمی ہوں' آدمی کے اندر بڑائی یوں نہیں ہوتی کہ اس کے پاس کاریں' کوٹھیاں' جائدادیں' فرم' فیکٹریاں' تعلقات' پولیس کے افسران' ہر دورِ حکومت کے وزراء' غیر ملکی سفیر وکیل' جج' بیرسٹر یہ سب اس کے دوست ہوں اس کے آگے پیچھے پھرتے ہوں' اس کی عزت کرتے ہوں۔

میرے اردگرد ایسے تمام لوگ موجود ہیں۔ میری عظیم الشان کوٹھی میں ایک دن میں لوگ ہر چیز نہیں دیکھ سکتے' ملازمین اور ساری چیزیں جو کہ انسانی ضرورت سے تعلق رکھتی ہیں میری زندگی میں موجود ہیں لیکن بنیادی طور پر ایک تشنگی میری ذات میں چھپی ہوئی ہے' سب سے بڑی چیز انسان کے اندر یہ ہوتی ہے کہ وہ اندر سے مطمئن ہو' میں نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ ہیں جو مکمل ذات کے مالک ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی خامی' کوئی نہ کوئی کمی انسان میں رہ جاتی ہے' مَیں...... جسے پوجا جاتا ہے' جسے یہ تمام لوگ بڑے احترام اور اہتمام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جس کی طرف پیٹھ کر کے لوگ جانا پسند نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں اور سر جھکے ہوتے ہیں اور وہ اُلٹے قدموں سے چل کر میرے آستانے سے باہر نکلتے ہیں کیونکہ میں بہت بڑا پیر ہوں۔

لوگ مجھے درویش مانتے ہیں مگر جانتے ہیں آپ کہ اس درویش میں کیا کمی ہے' اس کے ماں باپ نہیں ہیں' وہ نہیں جانتا کہ ماں کیا ہوتی ہے وہ نہیں جانتا کہ باپ کیا ہوتا ہے اور یہ اسے کبھی نہیں پتہ چل سکا اور جو پتہ چلا ہے وہ بڑا تکلیف دہ ہے جسے بیان نہیں کیا جاسکتا' یہ تشنگی میری ذات میں آج تک چھپی ہوئی ہے' وہ سارے لوگ جو میرے اردگرد موجود ہیں میری بے حد عزت کرتے ہیں۔ میں نے ملکی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا' لیکن سیاست دانوں کی ہر طرح خدمت کی اور کسی ایسے لیڈر کو شکایت کا موقع نہیں دیا جس کے برسرِاقتدار آنے کے امکانات ہوں۔ آپ چاہیں تو اسے میری سیاسی بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعض اوقات تو سٹے اور ریس میں جیتنے والے گھوڑے کے نمبر کی طرح یہ اندازے بھی کیے گئے ہیں کہ میں کے سپورٹ کر رہا ہوں اور جسے میں سپورٹ کر رہا ہوتا ہوں اس کی کامیابی کے امکانات سو فیصد ہو جاتے ہیں خواہ اس کی سیاسی پوزیشن کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو اور وقت ثابت کرتا ہے کہ میرا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اس طرح میں ایک سیاسی درویش کی حیثیت بھی رکھتا ہوں۔

میں بات کر رہا تھا بڑے لوگوں کے چھوٹا پن چھپانے کی' میں بھی خود کو ایک حد تک چھپانا چاہتا ہوں۔ بس اس حد تک جہاں ضروری سمجھتا ہوں' لیکن میں نے آپ کو یہ بتا دیا کہ میرے ماں باپ اس کائنات میں ہوں گے تو ضرور لیکن میں ان سے لاعلم ہوں۔ میں اپنے آپ کو کچھ بھی کہہ سکتا ہوں کیونکہ کوئی میرا ماضی نہیں جانتا' لیکن میں بہت سی روایات سے منحرف ہوں۔ روایت سے انحراف کے بارے میں مختصراً کہوں گا کہ ہر بچہ معصوم ہوتا ہے' بے بس ہوتا ہے اچھا ہوتا ہے' نیک ہوتا ہے' نیک رہنا چاہتا ہے' یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اسے کیا بناتے ہیں۔

تخلیق کنندہ اسے گوشت پوست کے لوتھڑے کی شکل میں روح پھونک کر آپ کے حوالے کر دیتا ہے' اس کے بعد آپ کا کام شروع ہوتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں' بات تقدیر کے حوالے کر دی جاتی ہے' مذہبی طور پر نبیوں' ولیوں اور درویشوں نے نیکیوں اور بدی کی تشہیر کر دی ہے کھلے لفظوں میں سمجھا دیا ہے کہ اس امتحان گاہ میں آپ کو پیپر دیئے ہیں' ان پر کیا لکھنا ہے یہ آپ کا کام ہے۔ ببول کے درخت پر آم نہیں لگتے۔

خیر میرا خیال ہے میں کچھ زیادہ بول گیا اس لیے

اس موضوع کو ختم کرتا ہوں' بات روایات سے منحرف ہونے کی ہے اس لیے اپنی صفائی پیش کرنے لگا تھا' ہر شخص یہی کہہ رہا ہے کہ سماج میں معاشرے میں اور ماحول میں برائیاں بڑھتی جارہی ہیں اور کوئی بھی اپنی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے' پہلے اپنے اطراف پر الزامات لگائے جاتے ہیں اس کے بعد ماضی کا رخ کیا جاتا ہے' اب یہ بتایئے کہ ماضی میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا ہے وہ حال میں کیسے دُور کیا جائے' ماضی والے تو جاچکے آپ جارہے ہیں' چلتے رہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

میں نے جس کوٹھی میں آنکھ کھولی وہ بھی بے مثال تھی' لیکن میری اس کوٹھی سے کہیں کمتر جو اس وقت میری ذاتی کوٹھی ہے' یہ لوگ پتہ نہیں کیا نمبر رکھتے تھے صفِ اوّل کے لوگ کہلاتے تھے اس وقت سے جب وہ دس نمبری تھے' پھر وہ نو نمبر کہلائے' نو سے سات تک پہنچے اور پھر تین نمبری ہوئے یہاں تک کہ ایک نمبری ہو گئے اور ایک نمبری ہونے کے بعد انہوں نے سارے نمبر بھلا دیئے اور اپنے ہر دور کے رازداروں کے دشمن بن گئے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ' ساحل سمندر پر آباد یہ عظیم الشان کوٹھی بہت خوبصورت بنی ہوئی تھی کیونکہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے اسی کوٹھی کو دیکھا لیکن سونے کے چمچے کے ساتھ نہیں جناب بلکہ ہاتھ میں میلے جھاڑن کے ساتھ جس سے میں کمرے کی صفائی کرتا تھا۔ اس کوٹھی میں بے شمار کمرے تھے جنہیں بے شمار لوگ صاف کیا کرتے تھے' لیکن چونکہ میری عمر کم تھی اس لیے میرے حصے میں صرف تین کمرے تھے۔

کیسی دلچسپ بات ہے انسان اپنے بارے میں سب کچھ جانتا ہے وہ کچھ بھی جو دوسرے نہیں جانتے لیکن زندگی پانے کے بعد وہ ایک ایسے وقت کو نہیں جانتا جو اس کا اپنا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف دوسرے جانتے ہیں' ان کی مرضی ہے بتائیں یا نہ بتائیں اور وہ وقت ہوتا ہے عمر کے ابتدائی سال' کہاں پیدا ہوئے' کیوں پیدا ہوئے' کیسے پروان چڑھے' یہ جھاڑن ہاتھ میں کہاں سے آیا' جس کوٹھی میں صفائی ستھرائی کرتا تھا وہاں اتنے لوگ آباد تھے کہ یہاں کے سب کے نام گنوانے بیٹھ جاؤں تو شاید مشکل پیش آجائے' ہاں البتہ ایک ایک کر کے ان سب سے روشناس کراتا رہوں گا۔

ویسے زندگی میں کائنات کی سب سے پہلی شاخت ماں ہوتی ہے' چنانچہ میں اس کہانی کا دوسرا کردار اسے بنا رہا ہوں' کیونکہ پہلا کردار تو میں خود ہوں' میں...... جس کا نام آپ کچھ بھی تصور کر لیجئے' بچپن میں مجھے جہانو کہا جاتا تھا لیکن اس کے بعد نام تبدیل ہوا اور آج کل میں جہانزیب شاہ کہلاتا ہوں۔

جہانزیب شاہ اور اس کے بعد میں اپنی ماں کے بارے میں بتاؤں گا' میری ماں کا نام حسن بانو تھا' بعض والدین اپنی اولاد کے ساتھ ایسا ہی مذاق کرتے ہیں' کوئلے جیسی سیاہ موٹی ناک' لمبے دانت نام حسن بانو یا ہتھوڑے جیسے ہاتھ گھوڑے جیسی شکل بکرے جیسی آواز اور نام شکیل احمد جمیل احمد تو میری ماں حسن بانو تھی اور یہ حسن بانو اس کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر نمبر سولہ میں رہتی تھی۔ اس کا کام چھوٹے بچوں کے کپڑے واشنگ مشین میں دھونا تھا' کچن کے برتن دھونا تھا اور بس اس کے بعد عیش ہی عیش۔

عیش تو خیر میں بھی کرتا تھا' تین کمروں کا فرنیچر صاف کر لو' پھر چھٹی' اس کے بعد لان پر آوارہ گردی کرو چاہے باہر نکل جاؤ' شام کو بڑے آدمیوں کے بچوں کو کھیلتے دیکھو' مگر ان کے پاس نہ جاؤ' ہاں اگر خوبصورت گیند اچھل کر تم تک آجائے تو اسے اٹھا کر ان کی طرف پھینک دو مگر دور سے' قریب جانے کے لیے

خصوصی ممانعت تھی۔ ماں کے بارے میں جذباتی لوگ بہت سی کہانیاں سناتے ہیں کہ بچہ پیدائش کے فوراً بعد اس کی آغوش کا شناسا ہو جاتا ہے اس کے لیے ہمکتا ہے' اس کے لیے روتا ہے ماں اسے زمانے کے سرد و گرم سے بچاتی ہے' مامتا نامی کوئی جذبہ یا چیز ہوتی ہے مگر میری ماں کے صندوق میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی کیونکہ جب اس عظیم الشان کوٹھی میں جو سمندر کے ساحل پر واقع تھی اور سمندر کی طرف سے ٹھنڈی لہریں اٹھ کر اس کی جانب رخ کرتی تھیں اور سرد ہوائیں چلتی تھیں تو میں نے خود کو ماں کی آغوش میں نہیں پایا۔ سینے پر ہوا لگی تو الٹا ہو گیا' کمر پر ہوا لگی تو پھر سیدھا ہو گیا' ہاتھ پیروں کو ہوا لگتی تو گٹھڑی بن جاتا اور پھر اسی طرح صبح ہو جاتی' قصہ ختم' ماں کی آغوش تو کبھی نہ پائی بلکہ بعض اوقات تو ماں ہی نہ پائی اور کمرے کی دیواروں پر بھوت چلتے ہوئے پائے جو آنکھیں زور سے بند کر لینے سے بھاگ جاتے تھے۔

خیر بات حسن بانو کی تھی جسے میری ماں کہا جا سکتا تھا اور مجھے اس کا بیٹا' باپ کے بارے میں' میں نے نہ کبھی کسی سے پوچھا اور نہ مجھے کسی نے بتایا' مجھے خیال ہی نہیں تھا کہ باپ بھی ہوتے ہیں اور ضروری ہوتے ہیں' بہت دن تک خیال نہ آیا تھا' حسن بانو میرے لیے کچھ نہیں کرتی تھی' میں بھی اسے اپنے لیے کچھ کرنے کو نہیں کہتا تھا' عادت ہی نہیں تھی بچپن سے' البتہ ایک عادت ضرور تھی مجھ میں' وہ یہ کہ میں لوگوں کو دیکھتا تھا ان سے سیکھتا تھا' ان کے اچھے برے میں تمیز کرتا تھا اس طرح کاروبار زندگی چل رہا تھا۔

اس گھر میں بہت سے بچے تھے' بہت سے بڑے تھے' ہر عمر اور ہر فکر کے لوگ' کچھ آقا تھے کچھ غلام تھے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا' لیکن میں انہیں ضرور جانتا تھا' یعنی ان سر کو جو پڑھانے کے لیے آیا کرتے تھے اور جو کچھ سر ان بچوں کو پڑھاتے تھے وہ میں بھی سیکھ لیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمایوں بابر بادشاہ کا بیٹا تھا' قائداعظم نے پاکستان بنایا تھا اور لیاقت علی خان شہید ہوئے تھے' ایسی لاتعداد باتیں میں سیکھ گیا تھا اور میری معلومات احمد میاں سے کسی طور کم نہیں تھیں۔

بہت سے بڑے تھے بہت سے چھوٹے تھے لیکن سب سے بڑے جو تھے ان کا نام حیدر شاہ تھا' خیر اپنے آغاز کا تعارف کتنا اچھا لگتا ہے بتایا نہیں جا سکتا' میں نے آپ کو اپنی زندگی کے دو رُخ فوراً بتا دیئے' یعنی ایک وہ رُخ جب میرے ہاتھ میں جھاڑن ہوتی تھی اور میں سر سے پاؤں تک جھاڑن بنا رہتا تھا' دوسرا موجودہ رُخ جس میں میں آپ کو اپنی جائداد' کوٹھیوں اور لوگوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتا چکا ہوں۔

واقعات زندگی کی امانت ہوتے ہیں اور کبھی کبھی انہیں دہرانے میں لطف آتا ہے بہت سے واقعات ہیں میری زندگی میں' ایک واقعے کا تذکرہ ضرور کروں گا۔

ایک دن احمد میاں اپنے ٹیچر سے پڑھ رہے تھے اور میں قالین برش کر رہا تھا' ٹیچر نے اس سے سوال کیا۔

"ہاں میاں کیا بتایا تھا میں نے تمہیں' بجلی کا بلب کس نے ایجاد کیا؟"

"بجلی کا بلب...... بلب...... بلب......" احمد میاں اٹکنے لگے تو ٹیچر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"کتنی بار بتایا ہے تمہیں اگر کسی گدھے کو بھی یہ سب کچھ بتایا جاتا تو وہ یاد کر سکتا تھا' تم سے یہ نہیں بتایا جا رہا کہ بجلی کا بلب کس نے ایجاد کیا' اے لڑکے...... تم بتا سکتے ہو کہ میں انہیں کیا پڑھا رہا ہوں؟" نجانے کیوں سر نے مجھ سے سوال کر لیا۔

"جی سر' بجلی کا بلب ایڈیسن نے ایجاد کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جی احمد صاحب کچھ شرم آئی آپ کو۔" ٹیچر نے

کہا۔

"تُو یہاں کیا کر رہا ہے کتے؟" احمد میاں نے شدید غصے کے عالم میں ایک زوردار لات میرے رسید کر دی' میں زمین پر بیٹھا ہوا قالین کو برش کر رہا تھا اور وہ کرسی پر تھے اس لیے لات میرے سر پر پڑی اور میں بری طرح گر پڑا' ٹیچر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے انہوں نے غصیلی نگاہوں سے احمد میاں کو دیکھا اور شاید برداشت نہ کر سکے' چنانچہ انہوں نے ایک تھپڑ احمد میاں کے منہ پر رسید کر دیا اور قیامت آ گئی۔ اس کے بعد ٹیچر کی بھلا اس گھر میں کیا گنجائش تھی' انہیں کھڑے کھڑے نکال دیا گیا۔

خیر اب یہ بات بھی نہیں ہے کہ یہاں کوئی کسی کا ہمدرد تھا ہی نہیں' ایک خاتون تھیں جن کا نام زلیخا تھا۔ گھر کی بزرگ تھیں' اللہ کے پاس جانے کے لیے تیار بیٹھی ہوئی تھیں اس لیے شاید دنیا سے کچھ لے جانے کی خواہش مند تھیں' بس وہی تھیں جو کبھی کبھی میرے ساتھ ہمدردی کر لیا کرتی تھیں' ایک دن کسی کام سے دوپہر کے وقت ان کے کمرے میں چلا گیا' وہ سو رہی تھیں' میرے قدموں کی چاپ پر جاگ گئیں' مجھے دیکھا تو میں سہم گیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"یہ...... یہ یہ پیڈ رکھنے آیا تھا' باہر سوکھ رہا تھا۔" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں ہے جہانو۔" انہوں نے مجھے مخاطب کیا' میں نے پہلے آپ سے عرض کیا تھا کہ بچپن میں میرا نام جہانو تھا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میرا پورا نام جہانزیب شاہ ہے' جوانی میں جب حالات ذرا کچھ بہتر ہوئے تو جہانزیب کے نام سے پکارا جانے لگا اور جب وقت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں جہانزیب شاہ ہو گیا' ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ زلیخا بیگم نے مجھے جہانو کہہ کر پکارا تو میری جان میں جان آئی اور میں نے گردن جھکا کر کہا۔

"جی بڑی مالکن۔"

"ارے مجھ سے کیوں ڈر رہا ہے تو ادھر آ۔" انہوں نے کہا اور میں ان کے قریب پہنچ گیا' انہوں نے پیار سے مجھے پاس بٹھایا اور بولیں۔

"ڈرتے ہو مجھ سے۔"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں ہے تمہیں یہاں۔"

"نہیں بڑی مالکن۔"

"پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تمہاری ماں کبھی مارتی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"تمہارا خیال رکھتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کچھ پیسے تو نہیں چاہئیں؟"

"نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے' لو یہ رکھ لو۔"

خیر ایک ایسا ہمدرد تو تھا جو مجھے اس نرم لہجے میں پکار لیا کرتا تھا اور یہی میں جانتا تھا کہ خدا کے لیے جب کوئی انسان کچھ کرتا ہے تو اس کا دل خود بخود نرم ہو جاتا ہے اور یہاں بھی ایک نرم شخصیت یعنی بڑی مالکن زلیخا بیگم تھیں جو کبھی بھی مجھ سے سخت رویہ اختیار نہ کرتی تھیں' یہ دل کے چھالے ہیں جنہیں میں چھیڑ رہا ہوں لیکن بہت کہہ چکا اس بارے میں' آخری بات سنا کر یہ تذکرہ ختم کرتا ہوں۔

یہ ایک سنسان دوپہر کی بات ہے' تیز دھوپ پڑ رہی تھی' شدید لُو چل رہی تھی' ماں نے دہی منگوایا تھا اور دکان بہت دُور تھی' دہی لے کر اندر داخل ہوا تو پسینہ پسینہ ہو رہا تھا' اندر آ گیا' دھوپ سے سر چکرا رہا تھا'

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بڑی ماں اچانک داخل ہو گئیں، حسن بانو یعنی میری والدہ محترمہ دہی کی لسی بنا رہی تھیں بڑی مالکن کو دیکھ کر ششدر رہ گئیں کیونکہ ان کا اس کوارٹر میں آنا ناقابلِ یقین سی بات تھی۔ لیکن بڑی مالکن نے کرخت لہجے میں کہا۔

''کہاں گیا تھا یہ؟''

حسن بانو کی حالت خراب ہوگئی' اس کا چہرہ اتر گیا' وہ چور سی بن گئی' جواب دینا ضروری تھا اس لیے اس نے کہا۔

''دہی' دہی منگوایا تھا بڑی بیگم صاب۔''

بڑی مالکن کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں انہوں نے سرد لہجے میں کہا ''دھوپ اور گرمی کا کچھ اندازہ ہے' پتہ ہے باہر کیسی لُو چل رہی ہے۔''

''جی بڑی مالکن۔''

''دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں گھر میں' تم جانتی ہو حسن بانو کہ میرے ایک اشارے پر تمہارا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا تمہیں کچھ اندازہ ہے تم اپنی کٹی ہوئی زبان اور تیزاب سے جھلسے ہوئے چہرے کے بارے میں سوچ سکتی ہو' کرائے پر جرم کرنے والے بہت معمولی سے آدمی کے لیے یہ مشکل نہ ہوگا اور معاوضہ کیا دینا پڑے گا' بس صرف چند ہزار روپے' کاغذ کے چند نوٹ۔

''مم...... معافی چاہتی ہوں بڑی بیگم صاب۔'' حسن بانو نے لرزتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے خود کو سنبھالو' اس بیچارے کی کالی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے اسے بھگتنے دو اس میں اور اضافہ نہ کرو' سمجھیں۔''

''آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا بڑی بیگم صاب۔'' حسن بانو نے کہا اور بڑی مالکن مزید کچھ کہے بغیر خاموشی سے باہر چلی گئیں' میں اتنا تو سمجھدار تھا کہ ان کی اس محبت کو سمجھ سکتا' لیکن وہ اس قدر اچھی ہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا اور میں سچ کہہ رہا ہوں کہ اچھے اور برے کی تمیز مجھے صرف بڑی مالکن کی وجہ سے ہوئی تھی' بروں کے درمیان تو میں تھا ہی' لیکن یہاں ایک اچھا بھی تھا جو ہر موقع پر میرا ساتھ دیتا تھا' جب بڑی مالکن چلی گئیں تو حسن بانو نے میری طرف دیکھا اور پھر ایک دم سنبھل گئی۔

''لسی پیو گے۔''

''پلا دو۔'' میں نے جواب دیا اور اس نے لسی کا گلاس بھر کر مجھے دے دیا۔

خیر یہ اس طرح کے واقعات تھے جن سے میں روشناس ہوتا جارہا تھا' گھر کے تمام افراد تھے' لڑکیاں تھیں' لڑکے تھے اور بہت سے مصیبت زدہ ملازم تھے کچھ شادی شدہ تھے' غیر شادی شدہ تھے' خواتین میں میرا مطلب ہے ان لڑکیوں میں جو یہاں آباد تھیں' کچھ شادی شدہ تھیں ایک آدھ ہی ایسی تھی جو شادی شدہ نہیں تھی اور اس کے لیے رشتوں کا انتظار کیا جارہا تھا' خیر ہم اپنی بات کرتے ہیں' ہم اس گھر کے ملازم تھے' میری ماں نوکرانی تھی۔

چھوٹے چھوٹے بچے بوڑھے ملازموں کو جھاڑ دیا کرتے تھے اور ان سے بدتمیزی کر لیتے تھے' کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا تھا' خیر یہ سب کچھ چل رہا تھا واقعات بڑے دلچسپ تھے' اس دن حیدر شاہ صاحب کہیں باہر سے آئے تھے اور پورچ میں کار سے اترے تھے' بچے زیادہ دور نہیں تھے وہ رک گئے میں اس وقت اتفاق سے بچوں سے قریب ہی تھا' وہ میرے پاس آ گئے۔

''تو یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ سرد لہجے میں بولے۔

''کک...... کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔'' میں ہکلا گیا۔

''سن آج کے بعد کبھی تجھے ان بچوں کے ساتھ کھیلتے نہ دیکھا جائے سمجھ گیا۔''

''جی۔'' میں نے لرزتے ہوئے کہا۔

''دفعان ہو جا۔'' وہ بھیانک آواز میں غرائے اور میں وہاں سے بھاگ آیا' پھر کبھی ہمت نہیں پڑی بچوں کے کھیل میں شریک ہونے کی۔

دوسری بار غالباً عید کا یا بقر عید کا دن تھا' میں نے بھی نئے کپڑے پہنے تھے۔ بچے لائن لگا کر حیدر شاہ صاحب سے عیدی وصول کر رہے تھے جس جگہ یہ تماشہ ہو رہا تھا وہ کوٹھی کے صدر دروازے کے پاس ہی تھی' میں صفائی کر کے باہر آیا تھا تو یہ دلچسپ تماشہ دیکھا' یونہی قدم رک گئے تھے۔ آخری بچے کو نمٹانے کے بعد ہی حیدر شاہ صاحب نے مجھے دیکھا تھا اور ایک دم سے ہی ان کا مسکراتا ہوا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

''کیا ہے؟'' انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

''کک...... کچھ نہیں۔''

''عیدی چاہیے۔''

''نہیں۔'' میں نے متانت سے کہا۔ مانگنا میری عادت نہیں تھی' حیدر شاہ صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے۔

''عیدی چاہیے۔''

''نہیں۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''تو یہاں کیوں مر رہا ہے؟''

''ادھر سے جارہا تھا غلطی سے رُک گیا۔'' میں نے ان سے کہا۔

''تو اب کیوں رُکا ہوا ہے؟''

''جارہا ہوں۔'' میں نے غضبناک لہجے میں کہا' جانے کیوں دماغ گھوم گیا تھا' میں مڑا ہی تھا کہ حیدر شاہ صاحب نے مجھے پھر پکارا۔

رشتہ احساس کا

محبت' عشق' جنوں' پیار' چاہت تو اپنی کوئی حقیقت نہیں رکھتے شاید اصل رشتے کا نام ہے احساس اور ان سب ناموں کی حقیقت بھی احساس کا دوسرا نام ہے جیسے جیسے احساس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے ویسے ہی اس کے نام بھی تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ اصل خوشی بھی اسی جذبے میں پوشیدہ ہے احساس ہی تو ہے جس کے تحت ہم بھی رشتوں میں بندھتے چلے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں' احساس کے بغیر تو صرف نام کے رشتے باقی بچتے ہیں اور جب اپنوں کو یادگار لمحوں میں سرپرائز دیتے ہیں تو ان لمحوں میں جو خوشی ہمیں ملتی ہے وہ ہم لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے۔ احساس سے ہی رشتوں کی اپنائیت بڑھتی چلی جاتی ہے یہی تو زندگی کے اصل رنگ ہیں۔ سو پلیز صرف اپنی ہی دھن میں مگن نہ رہیے۔ اپنے اردگرد بھی نگاہ دوڑائیے' شاید کسی کو آپ کی ضرورت ہو اور اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم کسی کے خوش رہنے کا سبب بن سکیں۔

عاصم بٹ...... گوجرانوالہ

''سن بات سن اِدھر آ' یہ کپڑے کہاں سے آئے تیرے پاس؟''

''میری ماں نے بازار سے خریدے ہیں۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور پلٹ کر واپس چل پڑا' آج میں ان سے بالکل نہیں ڈر رہا تھا جبکہ گھر کے تمام لوگ ہی حیدر شاہ صاحب سے دہشت زدہ رہتے تھے' میرے دل میں ایک نفرت سی بیدار ہوگئی تھی۔ نجانے کون ہیں یہ لوگ' کیوں دوسروں پر حکم چلاتے ہیں' کیا

فرق ہے دوسروں میں اور مجھ میں۔

میں نے آدھی رات تک چہرہ بار بار آئینے میں دیکھا تھا اور یہ سوچتا رہا کہ آخر مجھ میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے، کوئی خاص بات نہیں ہوئی بس میں کچھ تلخ ہو گیا۔ اس دن کے بعد یہ سب میرے لیے قابل نفرت تھے، ٹونی حوض کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر چھلانگ لگا رہا تھا ایک بار اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے گر پڑا، حوض کا کنارہ اس کے سر پر لگا اور اس کے سر سے بھل بھل خون بہنے لگا میں نے اسے دیکھا اور اطمینان سے آگے بڑھ گیا، کسی کو میں نے اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا، یہ بھی گھر کا ایک بیٹا تھا، بعد میں زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی اور سارا گھر پریشان رہا تھا۔

میری فطرت میں یہ تلخی بڑھتی گئی، مگر اس کا اظہار کسی چڑچڑے پن سے نہیں کرتا تھا، بلکہ ایک نیا ہی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ نازیہ جو احسان شاہ کی بیٹی تھی، اس کے کمرے کی صفائی میرے ہی ذمے تھی، ایک دن میں اس کے کمرے کی صفائی کر رہا تھا کہ اس کے خوبصورت شیلف سے ایک کتاب نیچے گر گئی اس میں جنگلی جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، بڑی خوبصورت تصویریں تھیں میں ورق الٹ الٹ کر دوسری تصویریں دیکھنے لگا کہ نازیہ آ گئی۔

"ارے یہ کیا کر رہا ہے؟"

"بڑی خوبصورت تصویریں ہیں۔"

"تو نے میری کتاب شیلف سے کیوں نکالی؟"

"نکالی نہیں گر پڑی تھی۔"

"بکواس کرتا ہے، جانتا ہے کتنی قیمتی کتابیں ہیں میرے ماموں امریکہ سے لائے تھے، یہ ساری کتابیں اتنے پیسوں کی ہیں کہ تجھے بیچ دیا جائے تب بھی پیسے پورے نہیں ہوں گے۔"

"کون بیچے گا تم مجھے بیچو گی؟" میں نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا اور کتاب اٹھا کر پھینک دی پھر وہاں سے باہر نکل آیا، پوری صفائی بھی نہیں کی تھی میں نے، نازیہ چیخ چیخ کر رونے لگی، میں باہر نکل آیا تھا، پھر میں انتظار ہی کرتا رہا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ نازیہ کی دادرسی کرنے والا اس وقت کوئی موجود نہیں تھا، البتہ اس کے الفاظ مجھے کھولا رہے تھے، یہ ساری کتابیں اتنے پیسوں کی ہیں کہ تجھے بیچ دیا جائے تب بھی پیسے پورے نہ ہوں، کیا میں اتنا ہی سستا ہوں، اتنا سستا ہوں کیا میں، میرے دل میں پہلی بار یہ خیال ابھرا تھا اور اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں انتقام کا جذبہ پروان چڑھنے لگا۔

صفائی تو خیر مجھے اس کمرے کی کرنی ہی پڑتی تھی، لیکن جب بھی میں کتابوں کی الماری پر نگاہ ڈالتا میرے کانوں میں نازیہ کے الفاظ چبھنے لگتے، میرا دل چاہتا کہ اس الماری کو آگ لگا دوں، اس میں موجود کتابیں اس قدر قیمتی ہیں کہ مجھے بیچ کر بھی ان کی قیمت پوری نہیں ہو سکتی، مجھے بیچ کر، مجھے بیچ کر، میں ہمیشہ نفرت بھری نگاہوں سے اس الماری کو دیکھتا تھا جسے خاکستر کر دینا میرے لیے مشکل نہیں تھا، کتابوں کے اس ڈھیر کو میں تھوڑی سی کوشش کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن شاید عقل کا آغاز ہو گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس طرح کتابوں کی الماری کو آگ لگانے کی ذمے داری مجھ پر ہی آ کر پڑے گی۔

ہرچند کہ مجھ سے ایسے کسی معاملے میں پوچھ گچھ نہیں ہو گی، لیکن اب چونکہ یہ ساری باتیں میری سمجھ میں آنے لگی تھیں اس لیے میں جانتا تھا کہ کافی لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا، ویسے ہی مجھ سے بہت سے لوگ نفرت کرتے تھے، نفرت تو میں نے ہر شخص کی نگاہوں میں دیکھی تھی، لیکن چونکہ ایک واقعہ ہو چکا تھا اس کے بعد سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ زلیخا بیگم میری طرف دار ہیں اور زلیخا بیگم یہاں بڑی بیگم صاب کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کے کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دے سکتا تھا۔

پھر ایک دن کوارٹر نمبر دو میں آگ لگ گئی، اس کوارٹر میں چوکیدار اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ آگ خوب زوردار لگی تھی، کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا لیکن ایک کمرے کا کافی سامان جل گیا تھا، لوگ ایک دوسرے کو بتانے لگے کہ آگ شارٹ سرکٹ سے لگی ہے یہ شارٹ سرکٹ کیا ہوتا ہے، میرے ذہن میں تجسس اُبھر آیا اور پھر میں نے کچھ لوگوں سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ شارٹ سرکٹ کی پوری تفصیل میری سمجھ میں آ چکی تھی لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں شارٹ سرکٹ سے اتنی واقفیت کیوں حاصل کر رہا ہوں۔

اس کے بعد دوسرے دن میں نے نازیہ کے کمرے کو خاص نگاہوں سے دیکھا تھا اور یہاں شارٹ سرکٹ کا جائزہ لیا تھا، میری خوش قسمتی تھی کہ یہ الماری دیوار کے ساتھ اسی جگہ لگی ہوئی تھی جہاں سے الیکٹرک کے تار گزرتے تھے، الماری کے بالکل قریب ہی نائلون کا ایک باریک پردہ پڑا ہوا تھا جو تاروں کو چھوتا ہوا گزرتا تھا اور سارا منصوبہ میرے ذہن میں آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ بجلی کے ننگے تاروں کو اگر چھری سے ٹچ کیا جائے تو کرنٹ لگ سکتا ہے، لیکن ان تاروں کو چھیلنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اس کے لیے میں نے ایک ایسی چیز حاصل کر لی جس میں لکڑی کا دستہ لگا ہوا تھا اور اس کا اگلا سرا دھار دار تھا۔ اس کی مدد سے کچھ تار ننگے ہو گئے اور اب ایک لکڑی ہی سے مجھے وائرنگ کے ان تاروں کو اوپر کر کے ایک دوسرے سے ملانا تھا، جلد بازی کسی طور مناسب نہیں تھی، چنانچہ میں اطمینان سے اپنے اس منصوبے پر عمل کرتا رہا یہاں تک کہ ایک دن مجھے موقع مل گیا۔

نازیہ اسکول گئی ہوئی تھی اور میں حسب معمول اس کے کمرے کی صفائی کر رہا تھا، سارا منصوبہ ذہن میں تھا چنانچہ ایک لمبی لکڑی سے جو جالے صاف کرنے کے کام آتی تھی میں نے ان دونوں تاروں کو ملا دیا، ایک زوردار چنگاری پیدا ہوئی اور شاید کہیں فیوز بھی اڑ گیا، لیکن اس چنگاری سے اس نائلون کے اس پردے میں آگ لگ گئی، میں پر مسرت نگاہوں سے اس آگ کو پھیلتے دیکھتا رہا، مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ آگ اتنی تیزی سے دوسری چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، لیکن جب میں نے یہ دیکھ لیا کہ الماری پوری طرح آگ کی زد میں آ گئی ہے تو میں کمرے سے نکل بھاگا اور عمارت کے بیرونی حصے میں آ کر میں نے زور زور سے آگ آگ کا شور مچایا۔

عظیم الشان کوٹھی میں لوگ اپنے اپنے معمولات میں مصروف رہتے تھے، کوئی کسی کی جانب توجہ نہیں دیتا تھا اور یہ چیز بھی میرے لیے کارآمد ثابت ہوئی کیونکہ میری آواز سن کر باہر نکلنے والے بھی بہت دیر کے بعد باہر نکلے تھے اور اس دوران کتابوں کی خوبصورت الماری نذرِ آتش ہو چکی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ اچانک ہی بجلی کے تاروں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور نائلون کے پردے نے آگ پکڑ لی، خیر جب آس پاس دھواں پھیلنے لگا تو لوگ بدحواس ہو کر آگ بجھانے کی فکر کرنے لگے۔

آگ بجھ گئی لیکن اس شکل میں کہ کمرے کا بہت سارا سامان راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا اور پھر نازیہ اسکول سے واپس آ گئی، اس کی حالت دیکھنے کے قابل

تھی۔ آٹھ آٹھ کے بجائے سولہ سولہ آنسو روئی تھی، اسے سب سے زیادہ دکھ اپنی الماری کے جل جانے کا تھا، لیکن میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، ایک ایسی چیز خاکستر ہوئی تھی جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اگر مجھے بھی بیچ دیا جائے تو اس کی قیمت پوری نہ ہو، میں تو اپنی جگہ موجود تھا لیکن وہ چیز اب موجود نہیں تھی۔

مجھے اپنی اس کامیابی پر اتنا سرور آیا تھا کہ میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ البتہ مجھے ایک اور سبق ملا تھا، میری سوچ میں یہ تصور بھی شامل ہوگیا تھا کہ جو کام بھی کیا جائے اسے ذہانت سے کیا جائے اور کام بھی ہو جائے اور کسی کو شبہے کا موقع بھی نہ ملے۔ دوسروں کو بس اس طرح ہراساں کیا جائے کہ وہ اپنے نقصان پر ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ لیکن یہ نقصان پہنچا کر اپنے دل کو جو ٹھنڈک ملے وہ ساری محنت کا حاصل ہو اور یہ بات میری فطرت میں رچتی چلی گئی۔

میری سوچوں میں ایک انوکھی تبدیلی رونما ہوئی، میں ہر چیز کو گہری نگاہوں سے دیکھنے کا عادی تھا اور میری سوچوں میں اب گہرائی بھی پیدا ہوگئی تھی، میرا ذہن ایک خاص انداز میں ترتیب پاتا جا رہا تھا۔ گھر کے دوسرے ملازمین اور ان کے بال بچے بھی تھے وہ غلطی کرتے تھے تو اس غلطی پر ان کے ساتھ کافی برا سلوک کیا جاتا تھا بعض کو تھپڑ بھی پڑ جاتے تھے، میرے ساتھ ایسا بہت کم ہوا تھا اور میری شخصیت میں ایک ناہمواری پیدا ہوگئی تھی۔

بے شک کبھی کسی کی نگاہوں میں میرے لیے محبت نہیں تھی، لیکن خیر دوسرے ملازموں کو عید یا بقرعید پر خوش بھی کیا جاتا تھا، میری ماں حسن بانو اس عنایت میں شامل ہوتی تھی لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرے لیے کبھی کوئی اہتمام نہ کیا گیا ہو، البتہ جب بھی کبھی موقع ملتا بڑی بیگم صاحبہ میرے ساتھ اچھا سلوک کر دیا کرتی تھیں، مثلاً غیر ملکی چاکلیٹ کے وہ پیکٹ جو انہوں نے ایک دن مجھے کیاری میں کام کرتے ہوئے دیئے تھے اور کہا تھا کہ ان کے بارے میں اپنی ماں تک کو نہ بتانا اور کہیں خاموشی سے بیٹھ کر کھا لینا۔ جو قیمتی چیزیں وہ مجھے دیتی تھیں اس کے بارے میں ہدایت کر دیتی تھیں کہ میری ماں کو بھی ان کا پتہ نہ چلے۔

خیر وقت گزر گیا، ایک دن میں گھر میں کام کرتے کرتے اپنی ماں سے کوئی ضرورت محسوس کر کے کچن کی جانب چل پڑا، مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت وہ کچن میں کام کر رہی ہوگی، کچن کے دروازے کو کھول کر میں نے تھوڑا سا اندر جھانکا تو ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ باورچی غلام خان، حسن بانو سے مذاق کر رہا تھا، اس نے حسن بانو کے دونوں بازو پکڑے ہوئے تھے اور حسن بانو ہنس رہی تھی بے اختیار ہنس رہی تھی، وہ، میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا وہ عام طور سے اتنا نہیں ہنستی تھی، میں نے اُسے ایسے ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، تبھی ان دونوں کی نگاہیں مجھ پر پڑ گئیں اور باورچی نے جلدی سے حسن بانو کو چھوڑ دیا۔ حسن بانو بھی عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگئی تھی اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”کیا ہے؟“

”کچھ کام تھا تم سے اماں“ میں نے کہا نجانے کیوں میرے دل میں دھواں سا بھر گیا تھا، یہ سب کچھ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

”کیا مصیبت پڑ گئی تجھ پر؟“ حسن بانو نے تنگ کر پوچھا اور میں نے اسے وہ کام بتا دیا جس کے لیے میں اس تک آیا تھا۔

”دفعان ہو جا، دیکھتا نہیں کام کر رہی ہوں۔“ اس نے کہا اور میں وہاں سے چلا آیا لیکن پتہ نہیں کیوں بات ذہن کو سخت ناگوار گزری تھی، ملازم تو ہمارا کوئی بھی

نہیں ہے، باورچی ہے وہ صرف، اسے میری ماں سے اس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے کی ہمت کیسے پیدا ہوئی، لیکن قصور تو میری ماں کا بھی تھا، ظاہر ہے تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔

خیر نجانے کیوں مجھے اس کی ٹوہ لگ گئی۔ باورچی خانے میں جو کاؤنٹر تھا اور جس پر چولہے وغیرہ لگے ہوئے تھے اور جس میں ایک طرف بہت بڑا سا الیکٹرک اوون تھا، اس کے سامنے ایک کھڑکی تھی جو پچھلی گلی میں کھلتی تھی اور یہ پچھلی گلی کوڑے کرکٹ کے لیے استعمال کی جاتی تھی، میں نے اس کھڑکی کو اپنا ٹھکانا بنا لیا اور اکثر کام کرتے کرتے اچانک میں چھپ کر کھڑکی کے سامنے پہنچ جاتا اور وہاں سے اندر جھانکتا۔ اس کا مقصد ہے کہ میری ماں اس باورچی سے بہت بے تکلف ہے کیونکہ اکثر وہ اسی قسم کے ہنسی مذاق میں نظر آتے جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور میرے ذہن میں ایک انتقامی جذبہ پھر ابھر آیا، ماں کے لیے نہیں بلکہ باورچی کے لیے۔

اسے میری ماں کی یہ ہمدردی اور دلچسپی کیوں حاصل ہے اور جس چیز کے لیے میرے دل میں انتقام جاگنے لگتا، اسے میں شارٹ سرکٹ کے ذریعے بھسم کر دیتا لیکن یہ باورچی کتابوں کی الماری نہیں تھا کہ میں اس میں آگ لگا دیتا، اس کے لیے الگ ہی ترکیبیں سوچنا پڑتی تھیں اور ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ باورچی بڑی بڑی ہانڈیاں چولہے پر چڑھانے کے بعد کاؤنٹر کے سامنے بیٹھ جاتا تھا اور ایک چولہا کھڑکی کے عین سامنے تھا، میں نے ایک دو بار اسے اٹھتے ہوئے دیکھا تھا، حسن بانو بھی اس کے آس پاس ہی کہیں ہوتی اور اس دن میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کھولتی ہوئی ہانڈی چولہے پر رکھی ہوئی تھی، جالے صاف کرنے کا وہ لکڑی کا برش جس کے ذریعے میں نے شارٹ سرکٹ یعنی دو تاروں کو ملایا تھا میرا بہترین ہتھیار تھا، چنانچہ بلی کی طرح دبے قدموں میں اس کھڑکی تک پہنچا اور اس کے بعد یہ دیکھا کہ باورچی معمول کے مطابق کاؤنٹر سے لگا بیٹھا ہے، میری ماں سنک پر برتن دھو رہی تھی، گویا اس وقت باورچی میری

گولڈن الفاظ

گناہ سے ہر وقت بچو مگر تنہائی میں بالخصوص بچو کیونکہ اس گناہ کا گواہ خود خدا ہوگا!

رزق کے پیچھے اپنا ایمان خراب مت کرو کیونکہ رزق انسان کو اس طرح تلاش کرتا ھے جیسے مرنے والے کو اس کی موت۔

اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت جھاڑو جس نے تمہیں بولنا سکھایا۔

لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر بولنے سے پہلے بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ھے۔

کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو، دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ھے خوب تیرتی ھے لیکن جب پانی کشتی میں آجائے تو وہ ڈوب جاتی ھے۔

دنیا کا سب سے مخلص رشتہ ماں کا ھے، ماں تیری عظمت کو سلام۔

محمد حنیف...... جھانیاں منڈی

رینج میں تھا چنانچہ برش آہستہ آہستہ آگے بڑھا کھولتی اور پکتی ہوئی ہانڈی پر لگا اور ہانڈی پوری قوت سے باورچی پر الٹ گئی، باورچی کی دلخراش چیخ میں وہ آواز بھی دب گئی تھی جو برش کو باہر کھینچتے ہوئے کھڑکی کی گرل سے لگ کر پیدا ہوئی تھی۔ میں تو وہاں سے فوراً ہی بھاگ آیا، لیکن باورچی کے سلسلے میں بڑی بھاگ دوڑ ہوگئی۔ اس وقت کوئی گاڑی گھر میں موجود نہیں تھی سب لوگ کسی نہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے چنانچہ کسی اسپتال کو فون کر کے ایمبولینس منگوائی گئی اور باورچی کو اس ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا۔

وہی سرور وہی لطف مجھے محسوس ہوا تھا جو کتابوں کی الماری کو جلانے کے بعد میرے دل میں اتر آیا تھا اور اس دوسرے منصوبے کی کامیابی نے مجھے واقعی باہمت کر دیا تھا اور میں اب ان تمام لوگوں سے کوئی نہ کوئی انتقام لینا چاہتا تھا جو میری توہین کا باعث تھے، یہ سارے احساسات میرے دل میں پروان چڑھتے رہتے تھے۔ میری عمر بھی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی اور اب میرے سپرد کچھ ذمے داریاں مزید کر دی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ کبھی کبھی مجھے باہر کسی کام سے بھی بھیج دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے میں اس کوٹھی کا ایک ملازم تھا چنانچہ کوئی کام کرنا مجھے برا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اپنے ذہن کی ان سوچوں کو کیا کرتا جو میری زندگی کو بدلنے میں مصروف تھیں۔

مجھے باہر جانے کا موقع ملا تھا اور یہ میرے لیے انتہائی دلچسپ مشغلہ تھا، میں باہر کی دنیا دیکھ رہا تھا، بڑی بڑی عمارتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو زمین پر اگائی گئی تھیں خود نہ اُگی تھیں، یہ عمارتیں اُگانے والے کون لوگ ہیں، اتنا سرمایہ ان کے پاس کہاں سے آیا۔ یہ سب کچھ کہاں سے آ جاتا ہے بڑے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں اور کس طرح ان کی پرورش ہوتی ہے۔ میں ان علاقوں سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹکتی رہتی تھیں کہ ایک لمحے کے لیے ٹریفک سگنل رُکتا ہے کہ کاروں کا اتنا ہجوم نظر آتا ہے کہ جہاں تک نظر جائے گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوتی ہیں، کمال ہے، واقعی کمال ہے۔

پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک مخصوص حصے میں بہت سے لوگ پائنچے چڑھائے گاڑیاں دھونے میں مصروف تھے، ان کے حُلیے اور چہرے غریبوں کے سے تھے، گویا یہ لوگ میری طرح غریب ہی ہیں، بڑی عجیب سی کیفیت ہوئی تھی انہیں دیکھ کر، میری زندگی کے شب و روز آگے بڑھتے رہے اور میں پندرہ سال کا ہوگیا، اتنی عمر بہت کچھ سمجھا دیتی ہے، میں نے بھی بہت سی چیزیں خود بخود سمجھ لی تھیں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئی تھیں گھر میں اور معاملات خاصے دلچسپ ہو گئے تھے۔

پھر اس رات میں حسبِ معمول سویا ہوا تھا لیکن رات کے ڈیڑھ یا پونے دو بجے کا وقت ہوگا جب میں نے کوارٹر میں کچھ آہٹیں محسوس کیں اور اس کے بعد میں نے چند لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی سنیں جن میں بڑی بیگم صاحبہ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں کمرے میں سو رہا تھا اور باتیں دالان میں ہو رہی تھیں۔ بڑی بیگم صاحبہ کے الفاظ سنائی دیئے۔

”یہ شریفوں کا گھر ہے حسن بانو، بہت دنوں سے اس سلسلے میں افواہیں سن رہی تھی لیکن آج میں کہتی ہوں تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی، ایسی ہی دیوانگی تھی تو ہم سے نہیں کہہ سکتی تھی تو کہیں نکاح وغیرہ کرا دیتے ڈوب مر کمبخت جس حالت میں پکڑی گئی ہے کوئی اور دیکھ لیتا تو کیا ہوتا تیرا۔“

میں حیران رہ گیا اپنی جگہ سے اٹھ کر خاموشی سے

دروازے سے جا لگا، باہر مدھم روشنی ہو رہی تھی حسن بانو تخت پر بیٹھی ہوئی تھی، بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم بس یہ دو خواتین وہاں موجود تھیں، حسن بانو کا سر جھکا ہوا تھا، بڑی بیگم کہنے لگیں۔

”میں تو خیر اس بات کو خاموشی سے پی جاؤں گی، لیکن اگر شاہ جی کو پتہ چل گیا تو گولی مار دیں گے تجھے کمبخت، بہو بیٹیوں کا گھر ہے اور یہاں تو نے یہ گل کھلائے ہیں حسن بانو کی سسکیاں اُبھر رہی تھیں، سسکتے سسکتے وہ ایک دم اُبل پڑی۔

”آپ نے بھی تو مجھے جانور سمجھ رکھا ہے، ساری زندگی آپ کے در پر گزر گئی، سوچا کبھی آپ نے میرے بارے میں، اس گھر کے علاوہ کوئی اور گھر دیکھا ہے میں نے، یہیں پلی بڑھی ہوں، میرے بھی جذبات ہیں، آپ نے ایک کنواری لڑکی کو زبردستی ماں بنا دیا، وہ لڑکا میرا بیٹا کہاں سے آیا جسے آپ میرا بیٹا، میرا بیٹا کہہ کر میرے اوپر مسلط کر چکی ہیں اور اب اس کی عمر پندرہ سال ہے، مجھ پر بھی تو آخر غور کر لیا ہوتا۔

”لو سنا تم نے بہو، کیا کہہ رہی ہیں حسن بانو، اے بی بی، ہم نے کوئی ٹھیکہ تھوڑی لے رکھا ہے، تمام گھروں میں ملازم ہوتے ہیں، پیدا بھی ہوتے ہیں، پلتے بڑھتے بھی ہیں، تنخواہ لیتے ہیں تمہیں بھی سب کچھ ملا۔ کیا نہ ملا تمہیں اس گھر سے، جو چاہتی کرتیں لیکن شرافت تو اختیار کرتیں، تم نے تو رنگ ہی دوسرے اختیار کر لئے، نہیں حسن بانو اب اپنا ٹھکانا کر لو، اس گھر میں اب تمہارے لیے جگہ مشکل ہے۔“

”تو میں بھی مری نہیں جا رہی اس گھر کے لیے سمجھیں آپ، آج تک دل پر پتھر رکھ کر جو کچھ کرتی رہی ہوں اب نہیں ہوگا مجھ سے۔“

”تو بی بی دفعان ہو جاؤ یہاں سے کس نے کہا ہے کہ یہاں مری رہو، ہمیں بھی ضرورت نہیں ہے تم جیسی آوارہ عورتوں کی۔“

”دیکھیے آپ آپ......“

”زبان چلا رہی ہے حرامزادی، زبان نکلوا لوں گی تیری، بے شرمی کی حد ہوگئی، چوری اور سینہ زوری اسے کہتے ہیں، چلو بہو یہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کر لے گی۔“

وہ لوگ چلے گئے، حسن بانو دالان ہی کے تخت پر بیٹھی رہی اور میں دروازے کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ جو کچھ میرے کانوں نے سنا ہے اب میری سمجھ میں آ رہا تھا دماغ پر ایک دُھواں سا چھایا ہوا تھا، بڑی بیگم کے الفاظ کی تشریح تو نہیں ہو پا رہی تھی لیکن کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا، بہت دیر گزر گئی، باہر خاموشی طاری ہوگئی تھی، پھر دوسری صبح مجھے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا۔

”جہانو...... اٹھ جا، اٹھ جا جہانو۔“

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، نبیلہ خالہ تھیں اس کوٹھی کی ایک بوڑھی ملازمہ، میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے خالہ؟“

”حسن بانو کہاں ہے؟“

”تخت پر ہوگی باہر۔“

”نہیں ہے، ساڑھے نو بج رہے ہیں، باورچی خانے میں بھی نہیں ہے، شاہ صاحب نے شور مچایا ہوا ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟“ میں نے جواب دیا رات کے واقعات یاد آ رہے تھے۔

”ارے دیکھ بابا اسے، میں تو اسے ہر جگہ تلاش کر آئی، ساڑھے نو بجے ہیں، غضب خدا کا دیکھو کہاں چلی گئی، باورچی بھی کہیں ڈوب مرا ہے، ادھر شاہ صاحب نے ہم پر زندگی دوبھر کر رکھی ہے، جا جلدی سے دیکھ

بیٹا۔" یہ کہہ کر خالہ باہر چلی گئی۔

میں کئی منٹ تک اسی طرح بیٹھا رہا' پھر باہر آ کر تخت کو دیکھا اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا اور باہر نکل گیا' کوٹھی ہی میں کہیں ہوگی اور کہاں جا سکتی ہے' میں نے سوچا۔ اندر کوئی خاص بات نہیں تھی کچن کا رخ کیا تو خالہ کو دیکھا جو ایک اور نوکرانی کے ساتھ مل کر ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔

"کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں مجھے چائے دو۔" میں نے کہا۔

"ایک منٹ رک جا میرے لعل' شاہ صاحب کے لیے ناشتہ لگا دوں۔ اے مہرالنساء ذرا دیکھ یہ انڈے ٹھیک سے اُبل گئے ہیں نا۔" خالہ نے کہا۔

ناشتہ تیار کر کے ٹرالی پر سجایا گیا اور پھر مجھے بھی ناشتہ مل گیا' خالہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے اس نے کئی بار چور نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا' ناشتے کے بعد میں اپنے کام سے چل پڑا' مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا البتہ شام تک مجھے پتہ چل گیا کہ حسن بانو وہاں سے چلی گئی ہے۔ وہ اپنا سامان بھی ساتھ لے گئی تھی' میں نے اندر جا کر دیکھا تو وہ پرانی اٹیچی غائب تھی جس میں حسن بانو کے کپڑے رہتے تھے' البتہ میری تمام چیزیں وہیں موجود تھیں' میرا دماغ گم صم سا ہو گیا' اب کیا ہوگا میرے ساتھ کون رہے گا۔

رات کے واقعات بھی یاد آ رہے تھے' میں وہیں تخت پر بیٹھ گیا' پھر نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا' البتہ شام کو بڑی بیگم صاحبہ کوارٹر میں آ گئیں۔

"کیا کر رہا ہے تو جہانو' اکیلا پریشان ہو رہا ہوگا؟"

"نہیں۔"

"رات کو ڈر تو نہیں لگے گا؟"

"نہیں بڑی بیگم صاب' اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ماں یاد آ رہی ہے؟"

"پتہ نہیں۔ مگر ایک بات بتائیں بیگم صاب' کیا واقعی وہ میری ماں تھی؟" میں نے کہا اور بیگم صاحبہ چونک پڑیں' پھر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر وہاں سے اٹھنے کے بعد بولیں۔

"اگر چاہو تو چوکیدار کے کوارٹر میں سو جاؤ میں کہے دیتی ہوں۔"

"نہیں میں وہاں نہیں سوؤں گا۔"

وقت گزرتا چلا گیا اور میں اکیلے رہنے کا عادی ہو گیا' کچھ بھی تبدیلی نہیں ہوئی تھی' لوگ آتے جاتے رہتے ہیں' غرضیکہ میں اب ذرا دوسری سوچوں میں گھر گیا تھا' سب ایک دوسرے کے چاہنے والے ہیں' چاہتوں کا نام ہی گھر ہوتا ہے' جہاں کوئی نہ ہو سوائے کوارٹر نمبر چار کے وہ گھر کہاں ہوتا ہے' کیا میں کوارٹر نمبر چار کا قیدی ہوں' میں یہاں کیوں قید ہوں' اب تو وہ نام بھی نہیں ہے جو ماں کہلاتا ہے۔

یہ بات تو مجھے پتہ چل گئی تھی کہ حسن بانو میری ماں نہیں ہے' یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ باورچی کے ساتھ بھاگ گئی ہے' میں یہاں کیوں ہوں آخر' میں کسی کے ساتھ کیوں نہیں بھاگ جاتا' آخرکار فیصلہ یہی کیا کہ یہ کوٹھی چھوڑ دوں اور دوسرے دن میں نے اپنے اس فیصلے پر بھی عمل کر ڈالا' میں باہر آ گیا' باہر آنے کے بعد میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ہر کوٹھی میں نوکروں کی ضرورت ہوتی ہے' دولت مندوں کو حکم چلانے کے لیے' ہم جیسوں کی ضرورت ہوتی ہے' ٹھکانہ ملنا مشکل نہیں ہوگا' جس دروازے کے سامنے رکوں گا وہاں نوکری مل جائے گی مگر لوگ ویسے ہی ہونگے جیسے حیدر شاہ صاحب تھے' حقارت سے دیکھنے والے' حقارت سے مسکرانے والے' دل

چاہتا تھا کہ ان کی مسکراہٹیں ہمیشہ کے لیے چھین لوں ایسا کر دوں انہیں کہ وہ پھر نہ مسکرا سکیں۔ کیسے ہوتے ہیں یہ لوگ۔

فضا میں پرندے پرواز کر رہے تھے' آزاد...... کسی بھی پابندی سے آزاد' رزق تلاش کرتے ہوئے' کھاتے پیتے ہوئے اور جیتے ہوئے جتنی جس کی زندگی ہے وہ اتنا ہی جیتا ہے چاہے پرندے ہوں جانور ہوں یا انسان' ایک بس میں بیٹھ کر چل پڑا تھوڑے سے پیسے موجود تھے جو محفوظ رکھے ہوئے تھے' وہ میرے کام آ رہے تھے۔ اچانک ہی مجھے وہ جگہ بھی نظر آ گئی جہاں ایک بار میں نے کچھ لوگوں کو گاڑیاں دھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں گاڑیاں دھو سکتا ہوں' میں نے دل میں سوچا اور تھوڑی دیر کے بعد وہاں جا پہنچا۔ میری آنکھوں میں چمک تھی' انداز میں خوداعتمادی تھی' ایک گاڑی دھونے والے سے میں نے کہا۔

"سنو میں گاڑی دھونا چاہتا ہوں۔"

"دھو' ہم کب منع کر رہے ہیں بھائی۔" وہ بولا۔

"اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

"گاڑی دھونا ہوگی۔" اس نے کہا اور ہنس پڑا۔

دوسرے دو لڑکے بھی وہاں آ گئے۔

"کیا بات ہے چاچا؟"

"بچہ کام کرنے آیا ہے کہتا ہے گاڑیاں دھونے آیا ہے۔"

"نہیں بابا' ادھر پہلے ہی زیادہ اسٹاف ہے' کوئی اور ٹھکانہ پکڑو۔"

"تمہارے پاس کام کروں گا مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"لائسنس لینا پڑتا ہے' چار سو روپے دینے پڑتے ہیں' چار سو روپے ہیں تمہارے پاس۔"

"نہیں۔"

"تو پھر چلو ادھر سے آگے بڑھ جاؤ' استاد رمضان کی کھوپڑی بہت خراب ہے' بہت مارتا ہے وہ۔" اس نے کہا۔

"لائسنس کہاں ملتا ہے؟"

"رمضان خان دیتا ہے' پر ابھی ادھر اسٹاف پورا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں ادھر سے ہٹ کر کام کروں گا۔"

"ارے جا بابا' کیوں صبح ہی صبح دھندہ خراب کر رہا ہے' ادھر تیرے کو کوئی کام نہیں کرنے دے گا۔"

"جاتا ہے یا نہیں صبح صبح کا وقت ہے اپے کام کا ٹائم ہے اور تم ادھر گول میز کانفرنس کرتا پڑا ہے۔" ایک لمبے چوڑے بدن کے آدمی نے ایک گاڑی کے عقب سے سر ابھار کر کہا۔

"ذرا ادھر آؤ رمضان خان' دیکھو یہ کتنا بڑا بدمعاش آیا ہے ادھر۔" کسی نے کہا اور رمضان خان آگے بڑھ آیا۔ لمبا چوڑا آدمی تھا' کھلا ہوا گریبان' نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس چوڑے سینے والا۔ اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے بھئی' کیا ہو گیا تیرے کو۔"

"میں یہاں کام کرنا چاہتا ہوں رمضان بھائی۔" میں نے کہا۔

"کیا کام کرے گا' ہیں...... ادھر سب ٹھیک ہے' تو کدھر اور کام دیکھ۔"

"میں یہیں کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسے کام کرے گا ہم نہیں بولے گا تو تم کیسے کام کرے گا بابا؟"

"کرے گا اور ضرور کرے گا' کیا سمجھے' کوئی نہیں روک سکتا مجھے۔" میں نے کہا اور لمبے چوڑے بدن والا رمضان خونی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا' وہ بھی زیادہ

عمر کا نہیں تھا زیادہ سے زیادہ چوبیس پچیس سال کا ہوگا‘ لیکن لمبے چوڑے بدن کی وجہ سے وہ نمایاں حیثیت کا حامل نظر آتا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ سیدھا کر دیا اور بولا۔

”دیکھو پولیس والے لوگ ادھر گھومتے پھرتے ہیں‘ اگر وہ لوگ نہیں ہوتا تو میں ایک دم تیرے کو ایسا سبق سکھاتا کہ تو زندگی بھر یاد رکھتا‘ ٹھیک ہے ادھر ہاتھ لا‘ دیکھوں تیرے میں کتنا جان ہے۔“

میں اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا‘ پھر میں نے اپنا ہاتھ بھی اٹھا دیا‘ کبھی اپنے آپ پر غور نہیں کیا تھا‘ طاقت کا مظاہرہ اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا لیکن اس وقت زندگی اور موت کا معاملہ تھا‘ میں اپنی زندگی اپنے مستقبل کا آغاز کرنا چاہتا تھا‘ اگر پہلے ہی مرحلے پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو زندگی آگے نہ بڑھ سکے گی‘ رمضان خان کے ہاتھ میں پنجہ ڈال دیا‘ کچھ اور دوسرے لوگ بھی جمع ہوگئے۔ رمضان میرے ہاتھ پر قوت صرف کرنے لگا‘ لیکن بات اس وقت قوت آزمائی کی نہیں تھی بلکہ اپنی بقاء کی تھی‘ چنانچہ میں بھی اپنی بقاء کی جنگ لڑنے لگا اور رمضان کسی ایسے شخص کا مقابلہ نہیں کر سکا جس نے ابھی زندگی کا آغاز کیا تھا‘ میں نے اس کا ہاتھ موڑ کر اس کی پشت پر رکھ دیا‘ رمضان مجھے غور سے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”دیکھو‘ ادھر مار پیٹ منع ہے‘ خیر ایک بات سن لے میری اور تیری فائٹ ایک بار کھلے میدان میں ضرور ہو گی۔“

”میں لڑنا نہیں چاہتا بس مجھے اپنے ساتھ کام پر لگا لو۔“ میں نے کہا اور رمضان پر خیال نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا‘ پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے‘ چلو اس کو کپڑا اور بالٹی دو اور سن ایک گاڑی ایک سو پچیس روپے میں ملتا ہے‘ ایک سو پچیس میں سے پچھتر روپے تیرے‘ پچاس روپے میرے۔“

”ٹھیک ہے رمضان بھائی۔“ میں نے جواب دیا اور وہ لوگ میرے دوست بن گئے۔

یہاں میں نے پہلا سبق سیکھا‘ وہ سبق یہ تھا کہ کائنات پر طاقت حکمراں ہے‘ بازو کی قوت صرف کرو‘ پوری قوت لگا دو‘ ماحول تمہارے قبضے میں آجائے گا اور اس پہلے سبق کو میں نے گرہ میں باندھ لیا۔ خوش بختی تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد ایک نئی گاڑی آگئی اور ان میں سے ایک لڑکے نے مجھے گاڑی دھونا سکھایا۔ یہ لوگ بے شک ذرا مختلف قسم کے تھے‘ لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہمدردی کے جذبوں سے ناآشنا نہیں ہیں۔ وہ شخص بھی میری مدد کر رہا تھا جس نے میری مخالفت کی تھی اور میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے استاد مانتے ہوئے ایک ایک عمل کیا اور گاڑی چمکا کر رکھ دی‘ گاڑی کے مالک نے ایک سو پچیس روپے میرے ہاتھ پر رکھے‘ مگر میں نے انہیں استاد کے حوالے کر دیا۔

”بس تم سمجھو‘ غیر لائسنس کے پکے ہو گئے‘ یہ پیسے رمضان کو دے دو۔“

”ٹھیک ہے۔“

رمضان نے پوری ایمانداری سے پچھتر روپے میرے حوالے کر دیئے تھے پھر اس نے کہا۔

”کیا نام ہے تیرا؟“

”جہانو۔“

”جہانو یا جانو؟“

”نہیں جہانو۔“

”پہلی بار کام کرنے نکلا ہے۔“

”ہاں۔“

”تیرا ہاتھ بہت تگڑا ہے‘ اس سے پہلے کیا کرتا تھا؟“

”کچھ نہیں۔“

”کدھر رہتا ہے؟“

”کوئی ٹھکانہ نہیں۔“

”کیا؟“

”ہاں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔“

”ارے بابا‘ کدھر سے آئے ہو؟“

”بس ایک کوٹھی میں رہتا تھا وہاں سے نکال دیا گیا۔“

”تو پھر تم کدھر ٹائم گزارو گے؟“

”دیکھ لوں گا‘ پہلے پیٹ بھرنے کے لیے پیسے چاہیے تھے وہ تمہاری مدد سے مل گئے ہیں‘ اب رہنے کا ٹھکانہ بھی تلاش کر لوں گا۔“

”ہوں...... اچھا...... دیکھو میری بات سنو‘ رات کو ادھر چار پانچ گاڑیاں آکر کھڑی ہوتی ہیں‘ ان کا کام کرنا پڑتا ہے‘ میرے پاس ان کا ٹھیکہ ہے‘ تو اگر چاہے تو میرے ساتھ کام کرنا‘ دن میں زیادہ محنت مت کرنا‘ رات میں گاڑی دھو لینا‘ میں استاد لوگ سے بول دوں گا کہ اسے گاڑی میں سونے دو‘ صبح کو سامنے پٹرول پمپ کے پاس حلوہ پوری کا ناشتہ ملتا ہے اور اس کے برابر ہوٹل میں کھانا مل جاتا ہے‘ عیش کرے گا زندگی بھر۔“

”بہت بہت شکریہ رمضان بھائی تم نے میری بڑی مشکل حل کر دی ہے‘ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”ارے چھوڑ یار‘ میں نے تیرے کو کہا نا کہ میں دل کا برا نہیں ہوں‘ بس ٹھیک ہے اب اپنا کام کر۔ کیا سمجھا۔“

اور میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا‘ دن میں دو گاڑیاں اور دھوئیں اور میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ اس کے بعد رات کا کھانا وغیرہ کھایا‘ ساڑھے بارہ بجے گاڑیاں آگئیں اس کے بعد دو گاڑیاں دھونے میں ڈیڑھ بج گیا‘ رمضان نے میرے لیے ایک گاڑی والے سے بات کر لی تھی اور اس نے مجھے گاڑی کے اندر سونے کی اجازت دے دی تھی‘ اس سے زیادہ ابھی اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گاڑی کے اندر یہ پہلی آرام گاہ مجھے بڑی عجیب لگی‘ لیکن یہ زندگی کا آغاز تھا اپنی پسند کی زندگی کا۔ ایک آزاد زندگی کا اور میں اس آغاز سے غیر مطمئن نہیں تھا۔

دوسری صبح حلوہ پوری کا ناشتہ کیا گیا‘ ساڑھے دس بجے رمضان آگیا اور اس کے بعد پھر وہی ساری ذمے داریاں‘ بڑی صحیح جگہ تھی اور وہاں میں نے اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا‘ ہم لوگ مل کر گاڑی دھوتے تھے اور میرے پاس اچھے خاصے پیسے آجاتے تھے‘ بس والوں سے مہینہ الگ بندھا ہوا تھا جس میں رمضان خان نے مجھے میرا حصہ بتا دیا تھا‘ ہم اب بہت زیادہ گھل مل گئے تھے لیکن اس سے زیادہ مجھے رمضان خان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ کبھی کبھی وہ خود ہی مجھے اپنی کہانیاں سنا دیا کرتا تھا‘ وہ کہتا۔

”دولت اپنے مقدر میں نہیں ہے‘ بہت کوشش کیا کہ کہیں ایک بار داؤ لگ جائے اور اب بھی چانس میں ہے‘ ایک بس خریدوں گا اور تجھے اس کا منیجر بنا دوں گا۔“

وہ بڑے انوکھے انوکھے خواب دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن دوپہر کے تقریباً ڈھائی بجے تھے‘ ایک ہنڈا سٹی آکر رکی رمضان نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ ہنڈا سے ایک شخص نیچے اترا تھا‘ ادھیڑ عمر کا تھا سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ کالا کوٹ تھا‘ اس نے چابی رمضان کو دیتے ہوئے کہا۔

”ذرا جلدی کر دینا‘ میں مارکیٹ جا رہا ہوں ابھی آتا ہوں۔“

وہ چلا گیا اور رمضان گاڑی کے پیڈ نکالنے لگا‘ میں

بالٹی اور پانی تیار کرنے لگا' رمضان نے ڈکی کھولی اور اس کے اندر سے پیڈ نکالنے لگا' مگر میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا' میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

''جہانو۔'' رمضان کی آواز میں کوئی عجیب سی بات تھی۔

''کیا ہو گیا رمضان بھائی؟''

''ادھر دیکھ۔'' اس نے کہا اور میری نگاہ بھی اندر پڑ گئی' سیاہ رنگ کا ایک بریف کیس اندر رکھا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''یار اس میں ہماری تقدیر بھی ہو سکتی ہے' غائب کر دے اسے۔''

''مگر رمضان بھائی چابی آپ کے پاس ہے؟''

''او یار تو اسے لے کر پھوٹ لے' ادھر سامنے ایک جلا ہوا ڈرم پڑا ہوا ہے' اس میں چھپا کر تیزی سے واپس آ جا۔''

''گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''جا یار جیسا میں بولتا ہوں ویسا کر۔ دیر نہیں ہونی چاہیے تو فکر مت کر میں سب سنبھال لوں گا۔'' اس نے بریف کیس نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں جانتا تھا کہ یہ چوری ہے ڈاکا ہے' اس سے پہلے میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا' لیکن رمضان خان کا حکم تھا' میں نے بریف کیس اس جگہ چھپا دیا' رمضان صابن سے پیڈ دھو رہا تھا۔

''ہو گیا کام؟''

''ہاں''

''کام سے لگ جاؤ' ابھی تھوڑے دن پہلے کی بات ہے' ایک صاحب کرولا دھلوانے لائے تھے گاڑی چھوڑ کر چلے گئے' میں نے کام کیا صاحب واپس آیا تو چابی اس کو دے دیا' ان صاحب نے ڈکی کھولی اس میں موجود بکس نکال کر اس میں سے عینک نکالا' جانتا ہے اس بکس میں کیا تھا؟''

''کیا تھا؟''

''اوپر تک نوٹ بھرے ہوئے تھے' مجھے دو دن تک افسوس کا بخار چڑھا رہا' میری تقدیر ایک دفعہ پھر کالی ہو گئی تھی' خیر چانس میں رہنا چاہیے۔''

ہم دونوں نے بجلی کی تیزی سے گاڑی صاف کر دی' کچھ دیر کے بعد کالے کوٹ والا واپس آ گیا رمضان سگریٹ سلگا کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا' اسی وقت ہمارے ایک ساتھی نے مجھے آواز دی اور میں اس کے پاس چلا گیا۔

''یار ذرا اس گاڑی میں ہاتھ لگوا دے' جلدی کی گاڑی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا مگر میرے ذہن میں وہی بریف کیس گھوم رہا تھا اور اس میں اوپر تک نوٹ بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے' یہ نوٹ آدھے میرے ہوں گے اور آدھے رمضان خان کے اتنی رقم کیسے خرچ کروں گا ہنڈا اسٹی چلی گئی تھی لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آ کر میرے پاس رک گئی' کالے کوٹ والا بیٹھا ہوا تھا' مگر اس وقت وہ شلوار قمیص میں تھا' وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا' پھر اس نے رمضان خان کے بارے میں پوچھا۔

''میں نے ابھی گاڑی دھلوائی تھی وہ بندہ کدھر ہے؟''

''رمضان خان۔''

''ہاں ہاں کہاں ہے وہ؟''

''اے تم ادھر آؤ۔'' ہنڈا اسٹی والے نے مجھے اشارہ کیا اور گاڑی سے اتر آیا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بھی تو اسی کے ساتھ تھے۔''

''ہاں۔''

''ڈکی میں ایک بریف کیس رکھا ہوا تھا' دیکھو کہیں رکھ تو نہیں دیا تمہارے ساتھی نے۔''

''بریف کیس کیا ہوتا ہے صاب؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''کالے رنگ کا ایک بریف کیس تھا' تم اسے بلاؤ کدھر گیا ہے وہ؟''

میں نے رمضان خان کو تلاش کیا مگر وہ نظر نہیں آیا تھا۔

''بات کیا ہے صاب؟'' ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں' ایک بریف کیس رکھا تھا گاڑی میں میں نے گھر جا کر دیکھا تو وہ مجھے نہیں ملا۔''

''نہیں صاب' ادھر ایسا نہیں ہوتا' ایمان دھرم کی کھاتے ہیں' ایک کیل حرام سمجھتے ہیں' سالوں سے یہاں کام کرتے ہیں۔''

''ہوں...... کہیں اور بھول گیا ہوں گا تمہارا شکریہ۔'' وہ دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی' یہ خطرہ اس طرح ٹل جائے گا' مجھے امید نہیں تھی۔

''بس گیا کہیں' رمضان خان کا ہاتھ خراب ہے' دوسرے ایسا نہیں کرتے' مگر وہ گیا کہاں؟''

میں جانتا تھا کہ رمضان خان کہاں گیا ہے' کچھ نہ کچھ ضرور تھا' مگر مجھے میرا حصہ ضرور ملے گا۔ ایک اور گاڑی آ گئی اور میں دوسرے بندے کے ساتھ اس کام میں مصروف ہو گیا' زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اچانک ہی پولیس کی ایک گاڑی قریب آ کر رُکی اور اس میں سے چھ سات پولیس والے نیچے کود کر ہماری طرف لپکے' وہ دُور دُور تک پھیل گئے تھے اس کے ساتھ ہی وہ ہنڈا اسٹی بھی موجود تھی' اس سے وہی شخص نیچے اُترا اور اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک یہ ہے اور ایک اور اس کے ساتھ تھا۔''

ایس آئی نے آگے بڑھ کر مجھے گریبان سے پکڑ لیا اور گالی دیتا ہوا بولا ''کہاں ہے تیرا ساتھی؟''

''گالی نہیں صاب گالی نہیں۔'' میں نے غرا کر کہا اور ایس آئی کا پارہ نجانے کیوں پھیکا پڑ گیا۔

''شریف زادے' تیرا ساتھی کہاں ہے؟'' اس نے کہا۔ اس دوران پولیس تمام گاڑی دھونے والوں کو پکڑ لائی تھی اور آس پاس لوگ جمع ہونے لگے تھے۔

''وہ ابھی تک نہیں آیا۔''

''پتہ نہیں۔''

''چلو اسے بٹھاؤ' اسے بھی تلاش کر لیں گے اور کون کون تھا اس کے ساتھ۔''

''ویسے تو یہ سب یہاں تھے مگر میری گاڑی ان دونوں نے دھوئی تھی۔'' ہنڈا اسٹی والے نے جواب دیا

''سب کو اٹھا لیں۔'' اے ایس آئی نے پوچھا۔

''نہیں یہی کافی ہے یہی بتائے گا۔'' ہنڈا اسٹی والا بولا اور مجھے گھسیٹ کر پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

ایس آئی نے دو پولیس والوں کو یہاں چھوڑ دیا تھا اور پھر خود جیپ میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور جیپ اسٹارٹ ہو کر چل پڑی' زندگی نے ایک نئے کھیل کا آغاز کر دیا تھا اور اس نئے کھیل کے بارے میں مجھے فیصلہ کرنا تھا میں نے راستے میں ہی فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئی' مجھے نیچے اتار کر ایک بڑے سے کمرے میں لے جایا گیا۔ راستے میں پولیس کا ایک افسر ملا جسے سیلوٹ کیا گیا تھا۔ اس نے فوراً پوچھا۔

''کیا ہوا وکیل صاحب کام بن گیا؟''

''ابھی کہاں' آدمی مل گیا ہے اب دیکھیں یہ آپ

کے ایس آئی صاحب کیا کام دکھاتے ہیں؟'' ہنڈا سٹی والے نے کہا۔

''یہ ہے؟'' بڑے افسر صاحب نے بھی چوڑے اور کھردرے ہاتھ سے میرا رخسار دباتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''سوہنا منڈا ہے۔ ہمارے یار کا بریف کیس واپس کردے بیٹا ورنہ یہ رنگ کالا پڑ جائے گا' چلو ذرا چیک کرو اس کو ننھا بچہ ہے' اچھا وکیل صاحب میں تو ذرا کام سے جا رہا ہوں' آپ کا کام تو ابھی ہوا جاتا ہے۔''

افسر چلا گیا اور مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔

''ہاں شہزادے اب بتا بریف کیس کہاں ہے؟'' ایس آئی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وکیل صاحب بھی پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''یہاں آنے کے بعد بھی نہیں معلوم' پکا حرامی لگتا ہے کتے کا بچہ۔''

''دیکھو گالی مت بکو میں نے پہلے ہی منع کیا تھا' اگر تیسری بار تم نے گالی دی تو تو......'' میرا سانس پھولنے لگا۔

''اوئے ہوئے' اوئے ہوئے' سنا وکیل صاحب آپ نے' کیا ہوگا بیٹا اس کے بعد......؟''

''اتنے ٹکڑے کروں گا تمہارے کہ گنے نہ جاسکیں اسے لکھ لو پولیس افسر صاحب جو کہا ہے وہ کر دکھاؤں گا۔'' میں نے شدید سفاک لہجے میں کہا اور ایس آئی چونک کر مجھے دیکھنے لگا' اسی وقت ایک زوردار ہاتھ میری گدی پر پڑا' اتنی طاقتور ضرب تھی کہ میں میز پر اوندھ گیا۔ یہ ہاتھ ایک لمبے چوڑے آدمی نے میری گدی پر جمایا تھا' پھر اس نے عقب سے میرے بال پکڑ کر مجھے سیدھا کرلیا۔

''زبان نکال لوں اس کی انسپکٹر صاحب۔''

''چھوڑ دے اسے چھوڑ دے۔'' ایس آئی بولا اور اس نے جھٹکے سے میرے بال چھوڑ دیئے۔

''بریف کیس کہاں ہے حرامی کے بچے۔ میں نے تجھے تیسری گالی دے دی ہے۔'' وہ بولا اور میں سپاٹ نظروں سے اسے دیکھنے لگا' اس کا رنگ سانولا تھا' عمر بتیس تینتیس سال کے قریب تھی' نقش موٹے اور بھدے تھے' میں نے یہ نقوش دل میں اتار لئے۔

''دیکھو لڑکے' اس میں کوئی رقم وغیرہ نہیں ہے' میرے بہت ضروری کاغذات ہیں اگر وہ تم مجھے دے دو تو میں تمہیں ایک ہزار روپے دوں گا۔''

''صاحب مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم' آپ جس طرح بھی چاہیں تفتیش کرلیں۔''

''مگر تمہارا ساتھی کہاں بھاگ گیا؟''

''اگر آپ کا بریف کیس اس نے نکالا ہے تو وہ ضرور اسے لے کر بھاگ گیا ہوگا۔''

''کہاں رہتا ہے وہ؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''کیا نام ہے اس کا؟'' اس بار ایس آئی نے پوچھا۔

''رمضان خان۔''

''تو اس کے ساتھ کام کرتا تھا؟''

''ہاں''

''کہاں رہتا ہے تو؟''

''وہیں گاڑیوں میں۔''

''پتہ بتا اپنا۔''

''بس میں نے کہا نا' دن بھر وہاں رہتا ہوں جہاں سے پکڑا گیا ہوں' رات کو وہاں کھڑی ہونے والی بسوں میں سوتا ہوں۔''

''دیکھا آپ نے وکیل صاحب' صورت دیکھو عمر دیکھو اور پکا پن دیکھو یہ تو مجھے عادی چور لگتا ہے' ابے اس

سے پہلے کہاں رہتا تھا یا اسی بس میں پیدا ہوا تھا' کوئی اور ہے تیرا؟''

''کوئی نہیں ہے۔''

''ہوں وکیل صاحب معاملہ کچھ لمبا ہو جائے گا' کچھ اور چھوکرے بھی اُٹھانے پڑیں گے' آپ آرام کریں' ہم ذرا اس کو ڈرائنگ روم دکھائیں گے تو کام بن جائے گا آپ فکر نہ کریں۔''

''بڑے ضروری کاغذات ہیں میرے' بڑی اہم دستاویزات ہیں' کئی کیس خراب ہو جائیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے جی مگر کیا کیا جاسکتا ہے۔'' ایس آئی نے خشک لہجے میں کہا اور وکیل صاحب کچھ لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔

''دیکھو لڑکے تم چاہو تو مجھ سے تعاون کر سکتے ہو' میں تم سے سختی نہیں ہونے دوں گا وعدہ کرتا ہوں۔''

میں نے رُخ بدل لیا تھا۔ پھر ایس آئی وکیل صاحب کے ساتھ باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اندر آیا اور اس سادہ لباس شخص سے بولا۔

''چلو اسے اندر کردو اور تم میرے ساتھ چلو میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔''

''جی صاب۔'' سادہ لباس شخص نے کہا اور آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا۔ کمبخت کا ہاتھ فولادی معلوم ہوتا تھا' پھر مجھے ساتھ لے کر سلاخوں والے دروازے کے پاس پہنچا' ایک سپاہی چابی لے کر پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے دروازے کا تالا کھولا اور مجھے اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کردیا۔ اندر کچھ اور لوگ بھی تھے' مدہم مدہم آواز میں ایک کورس سنائی دیا۔

''آ گئے آ گئے گھر آ گئے' بلم پردیسی' سجن پردیسی آ گئے گھر آ گئے۔''

میں نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا' پانچ افراد تھے عجیب سی شکلوں کے مالک۔

''آؤ آؤ پری زاد! ابے کوہ قاف سے آ رہے ہو کیا' دیکھو بھائی دیکھنا مکھن چاچا کیا چیز بھیجی ہے اللہ نے۔''

''پکا شہزادہ ہے کیا سمجھے؟''

''کیا کرتے ہو شہزادے' قینچی کا کام کرتے ہو کیا' کس کے سکھائے ہوئے ہو؟''

''یار تم نرے اُلو ہو' چھری تلے دم تو لینے دو بچے کو۔ ہاں شہزادے کہاں سے پکڑے گئے؟''

''کیا بدتمیزی ہے' سنتری کو آواز دوں۔'' انہی میں سے ایک کسی قدر معقول سا آدمی تھا' اسی نے یہ الفاظ کہے تھے۔

''ابے او سیاسی لیڈر' تم ہمیشہ قوم کی گردن پر چھری ہی چلاؤ گے' ابے لاڈلے یہ اپنی فیلڈ ہے اپنا کام کرنے دو یار۔''

''بس خاموشی اختیار کرو۔''

اس چڑیا گھر میں سارے پرندے چوں چوں کر رہے تھے' میں ایک گوشے میں جا بیٹھا وہ لوگ نجانے کیا کیا بکواس کرتے رہے' رات کو نو بجے میری اس جگہ کے دو بندے اور لاک اپ میں پہنچا دیئے گئے' یہ دونوں بھی وہیں کام کرتے تھے جہاں سے مجھے لایا گیا تھا' انعام نے روتے ہوئے کہا ''اللہ کی قسم میں نے تو ایک رومال بھی نہیں چرایا کسی کا' یہ لوگ میرے کو زبردستی اٹھا لائے ہیں۔''

''اور میں تو جیسے گاڑیاں صاف کرنے کے بجائے چوریاں ہی کرتا رہا ہوں۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔

''تمہیں بھی اس چکر میں لائے ہیں یہ لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''تو اور کیا یار' گھر میں اماں انتظار کر رہی ہوگی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''رمضان استاد نہیں آیا۔''

''اب کیا واپس آئے گا' کام دکھا گیا حرامی' ہمیں

پھنسا گیا۔

’’ایک بات بتاؤ؟‘‘

’’کیا؟‘‘

’’یہ رمضان استاد رہتا کہاں ہے؟‘‘

’’بس...... اللہ بخش جانتا ہے‘ صاف قسمیں کھا گیا‘ اللہ بخش دمے کا مریض ہے اس لیے پولیس والوں نے اسے چھوڑ دیا‘ بس ایک بات تو بتا دیجئے جہانو بکسہ رمضان خان نے نکالا یا نہیں؟‘‘

’’یہ بات جانتا تو پولیس والوں کو نہ بتا دیتا۔‘‘

’’تیرے سامنے نہیں نکالا۔‘‘

’’نہیں‘‘

’’پتہ نہیں اب کیا ہوگا؟‘‘

’’تیری تو بڑی دوستی تھی رمضان خان سے‘ اس کے گھر کا پتہ تجھے بھی نہیں معلوم۔‘‘

’’میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں؟‘‘

’’یار ایک بات بتاؤں تجھے جہانو‘ وہ پولیس والا ہمیں یہ کہہ کر لایا ہے کہ ہم تجھ سے بکسے کے بارے میں پوچھیں‘ اگر پتہ چل گیا تو ہمیں چھوڑ دیا جائے گا‘ تجھے پتہ ہے تو بتا دے بھائی‘ تیرا بھلا ہوگا۔‘‘

’’دماغ خراب ہے تیرا‘ اگر مجھے معلوم ہوتا تو پولیس کو نہ بتا دیتا‘ یہاں تک کیوں آتا۔‘‘

’’یار بلاوجہ پھنس گئے۔‘‘

گیارہ بج گئے‘ پھر دو سپاہیوں نے ان دونوں کو باہر نکالا اور پھر ساتھ لے گئے‘ حوالات کے قیدی زمین پر اوندھے سیدھے لیٹ گئے تھے‘ میں بھی تھک گیا تھا‘ کوئی پونے بارہ بجے کے قریب حوالات کا دروازہ پھر کھلا اور مجھے سپاہیوں نے آواز دی۔ میں چونک کر اٹھ گیا‘ سپاہیوں نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور میں خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آیا‘ اس کے بعد مجھے ایک اور دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں دو تین میز کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر میز کے پیچھے ایس آئی بیٹھا ہوا تھا‘ اس کے پاس دو آدمی اور بھی تھے۔ جو مجھے یہاں لائے تھے وہ اس کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے‘ ایس آئی نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

’’تجھے یاد آیا کہ بریف کیس کہاں لے جایا گیا ہے؟‘‘

’’نہیں جناب‘ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا‘ آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔‘‘

’’اور وہ رمضان خان کہاں رہتا ہے یہ بھی نہیں معلوم تجھے؟‘‘

’’مجھے تو یہاں کام کرتے ہوئے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے‘ میں نہیں جانتا وہ کہاں رہتا ہے؟‘‘

’’چلو اس کی ہٹ دھرمی نکالو۔‘‘

ایس آئی نے دونوں آدمیوں کو حکم دیا جو اس کے پاس موجود تھے‘ ان میں سے ایک نے جو گہرے سیاہ رنگ اور بڑی بڑی مونچھوں کا مالک تھا میرے قریب پہنچ کر کہا۔

’’بیٹا بہت بُری بلات ہے زبان کھول دے کیا فائدہ تیرا ڈیزائن بگڑ جائے گا۔‘‘

میں نے خاموشی سے اسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ’’اگر مجھے......‘‘ لیکن میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ ایک بھرپور تھپڑ میرے گال پر پڑا اور میں دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا‘ لیکن وہ بدبخت میرے ساتھ ہی ساتھ آیا اور اس نے میرے بال پکڑ کر مجھے زمین پر گرا دیا پھر میرے شانے پر پاؤں رکھتے ہوئے بولا۔

’’ہڈیاں پسلیاں سب ٹوٹ کر برابر ہو جائیں گی سمجھا‘ بتانا بہت ضروری ہے۔‘‘

میں نے اب خاموشی اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں سمجھا۔ اس نے ایک ٹھوکر میری پسلیوں پر لگائی اور میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور آنکھیں بند کر

لیں‘ اس نے ایک بار پھر مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا پھر اس نے میری گردن پکڑ کر مجھے زور سے دیوار کی جانب دھکا دیا اور میں دیوار سے جا لگا۔ وہ مسلسل مجھے مار رہا تھا‘ تھپڑ گھونسے‘ میرے ہونٹوں سے خون نکل آیا‘ میں خاموشی سے پٹ رہا تھا اس نے مجھے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

’’کس استاد کا شاگرد ہے میری جان‘ مار کھانے میں تو خاصا ماہر ہوگیا ہے‘ زبان کھولے گا یا نہیں؟‘‘

میں نے سرد نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور اس کے بعد دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔

’’ماردوں گا سالے‘ بہت ڈھیٹ بن رہا ہے تو۔‘‘

’’گالی نہیں گالی نہیں۔‘‘ میں نے انگلی اٹھا کر کہا۔

اس بار ایس آئی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

’’ابے شریف زادے گالی اتنی بری لگتی ہے تجھے‘ ہمیشہ دھمکی دیتا رہتا ہے‘ لیکن یہ نہیں بتاتا کہ بریف کیس آخر گیا کہاں‘ چوری ہوئی ہے اس کی کسی نے تو چرایا ہی ہوگا۔‘‘

’’میں نے نہیں چرایا یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔‘‘

’’ایک بات سن لے کان کھول کر‘ اگر یہ معلوم ہوگیا کہ تو نے بریف کیس چرایا ہے تو پھر تو یہاں سے زندہ نہیں جا سکے گا‘ یہ میرا قول ہے۔‘‘

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو ایس آئی بولا۔ ’’بند کر دو اسے‘ مر جائے گا سالا میرے ہاتھوں بڑی [illegible] کر چکا ہے‘ مجھ سے اسے چھوڑوں گا نہیں آسانی [illegible]‘‘

وہ دونوں مجھے لیے ہوئے باہر نکل آئے اور ایک بار پھر مجھے حوالات میں دھکیل دیا گیا‘ حوالات کے [illegible] اٹھ کر بیٹھ گئے تھے‘ اندر ایک مدہم سا بلب جل رہا [illegible] وہ میرا جائزہ لیتے رہے اور اس کے بعد ان میں [illegible] ایک نے کہا۔

’’مار پڑی ہے شہزادے کو؟‘‘

’’خاموشی سے سو جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔‘‘ میں نے کہا اسی وقت ایک سنتری حوالات کے سامنے سے گزرا تو وہ جلدی سے منہ پر کمبل لے کر کروٹ بدل کر سو گیا۔ میں خاموشی سے ایک گوشے میں جا بیٹھا تھا‘ اس مصیبت سے چھٹکارہ کیسے حاصل کیا جائے‘ پھر رمضان خان پر غصہ آنے لگا‘ میں جانتا تھا کہ اس نے بریف کیس اپنے قبضے میں رکھا ہے‘ یہ تو ایک دھوکا دہی ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی‘ لیکن بلاوجہ ہی اس چوری میں شریک ہو گیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی‘ تھانے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

صبح ہو گئی اور اس کے بعد وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا‘ ہمیں چائے اور ڈبل روٹی کے دو دو ٹکڑے دیئے گئے‘ میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ چائے لے لی تھی‘ رات بھر کے جگراتے اور پھر ان لوگوں کے تشدد سے سخت نڈھال ہو گیا تھا‘ لیکن میرے حوصلے پست نہیں تھے‘ البتہ اب رمضان خان کے لیے میرے دل میں نفرت پیدا ہوتی جا رہی تھی‘ ادھر ان دونوں کو چھوڑ دیا گیا تھا جو بعد میں لائے گئے تھے‘ پھر تقریباً ڈیڑھ بجے کا وقت تھا جب مجھے دوبارہ اسی کمرے میں لایا گیا‘ وہاں ایس آئی موجود تھا۔

’’ہاں یاد آ گیا تجھے؟‘‘

’’نہیں کچھ یاد نہیں آیا۔‘‘

’’زبان تو تیری ایسی کھلے گی بیٹا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا...... اچھا یہ بتا اس سے پہلے کہاں رہتا تھا؟‘‘

’’بتا چکا ہوں کہیں نہیں۔‘‘

’’مطلب یہ کہ فٹ پاتھوں پر ہی زندگی گزاری ہے۔‘‘

’’ہاں‘ بس میں سوتا تھا۔‘‘

’’اور اس سے پہلے؟‘‘

"کسی اوراڈے پر تھا۔"

اسی وقت میں نے اس کالے کوٹ والے کو دیکھا جو بریف کیس کا مالک تھا وہ قریب پہنچا تو ایس آئی نے کہا۔

"یار وکیل صاحب کیا چیز ہمارے حوالے کر دی آپ نے، سالے کا ڈیزائن دیکھو اور ہماری محنت دیکھو، رات بھر پٹائی کرتے رہے ہیں مگر زبان نہیں کھول کر دی۔"

"میرا خیال ہے اب اسے چھوڑ دیجیے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہوسکتا ہے یہ اس میں ملوث نہ ہو وہ اصل کمبخت نکل گیا جو وہاں کا ہیڈ تھا، اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات خود بھی حاصل کر چکا ہوں، اس بچے کے بارے میں سنا ہے کہ یہ اچھا لڑکا ہے اور وہیں بسوں اور گاڑیوں کا کام کرتا ہے، ایک بس میں سو جاتا ہے اگر بریف کیس اس کے پاس ہوتا تو اس نے کہیں نہ کہیں تو رکھا ہی ہوتا، جبکہ اس کے سابقہ ٹھکانے کا بھی کوئی علم نہیں ہے۔ اصل آدمی وہی ہے۔"

"مگر اس کا پتہ بھی تو ضروری ملنا چاہیے۔"

"چھوڑیئے اب جو ہوگا دیکھا جائے گا اللہ مالک ہے۔"

"آپ کی مرضی ہے، بڑے صاحب سے بات کر لی ہے آپ نے؟"

"ہاں...... اس کے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا، میں نہیں چاہتا کہ بلاوجہ ایک لڑکے پر سختی ہوتی رہے چھوڑ دیں آپ۔"

"آپ کی مرضی ہے وکیل صاحب......" اس کے بعد وہ مجھے دیکھتا ہوا بولا "سن رمضان خان کا پتہ جب بھی معلوم ہو جائے سیدھے ادھر آجا اور اس کے بارے میں بتا جانا، چل دفع ہو جا یہاں سے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا اور اس کے بعد گردن جھکا کر وہاں سے نکل آیا۔ وکیل صاحب ایس آئی کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔ خیر تھانے کی عمارت سے نکلنے کے بعد میں نے باہر کے ماحول کو دیکھا، بدن بری طرح دکھ رہا تھا، چہرے پر جگہ جگہ نیلے نشان پڑے ہوئے تھے، جسم کے اور بھی حصے زخمی ہو گئے تھے۔ میں تھکے تھکے انداز میں چلتا رہا اس کے بعد ایک جگہ جا بیٹھا، سامنے ہی ڈینٹنگ پینٹنگ کی ایک دکان تھی اور وہاں ہتھوڑی کی ٹھکا ٹھک سنائی دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

خود غائب ہونے کے ساتھ اگر وہ مجھے بھی لے جاتا تب تو میں اسے مخلص مانتا مجھے نہیں پتہ تھا کہ میرے ساتھ یہ حالات پیش آئیں گے، بہرحال میرے دل میں نفرت کا ایک جذبہ اُبھرا اور میرے قدم خود بخود اسی طرف اٹھ گئے جہاں میں کام کرتا تھا۔ زندگی وہاں اسی طرح رواں دواں تھی، مجھے دیکھ کر سب میرے گرد جمع ہو گئے، چاچا نے ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مار پڑی تھی۔"

"نہیں بڑی محبت سے پیش آئے تھے وہ لوگ۔"

"ویسے رمضان نے غداری کی تیرے ساتھ، کیا تجھے یہ نہیں پتا کہ ایسی کوئی چیز وہ لے گیا ہے۔"

"نہیں مجھے نہیں معلوم۔"

"اسی لیے وہ غائب ہو گیا ہے بیٹا اب یہاں نہیں آئے گا۔ ویسے اس نے یہاں بڑی بدمعاشی قائم کر رکھی تھی، محنت ہم لوگ کرتے تھے اور ہماری محنت کا آدھا حصہ وہ لے جاتا تھا۔ اچھا ہوا دفع ہو گیا، چل آجا اب میرے ساتھ اس میں کام کر، چل چوٹیں تو زیادہ نہیں لگی ہیں؟"

"نہیں چاچا۔" میں نے جواب دیا اور کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔

"کچھ کھایا پیا ہے تو نے؟"

"ہاں دوپہر کو تھوڑی سی روٹی کھائی تھی۔"

"واہ حوالات کی روٹی بھی کھالی تو نے بیٹا، خیر تجربہ اسی طرح حاصل ہوتا ہے، زندگی میں اب کسی پر اتنا بھروسہ مت کرنا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رات تک کام میں مصروف رہا، تھوڑے بہت پیسے آ گئے تھے، رات کا کھانا خوب پیٹ بھر کر کھایا، وہ پولیس افسر بھی یاد آیا مجھے جس نے گالیاں دی تھیں اور میں نے اس کے لیے دل میں تہیہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن پھر اسی طرح زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اب میں چاچا کے ساتھ کام کرنے لگا تھا، دوپہر تک کام کیا اس کے بعد جب ذرا سناٹا ہو گیا تو میں اور چاچا ایک دیوار کے سامنے آ بیٹھے، میں نے چاچا سے کہا۔

"ایک بات بتاؤ چاچا۔ پولیس نے تم سے رمضان کا پتہ پوچھا تھا؟"

"ہاں پوچھا تھا، بس یوں سمجھ لے اللہ نے بچا لیا ورنہ میں چکر میں پھنس جاتا۔"

"میں یہ بات جانتا ہوں چاچا کہ تمہیں رمضان کا پتہ معلوم ہے۔"

"کبھی گیا تو نہیں اس کے ہاں، ایک بار اس نے بتایا تھا کہ کون سے محلے میں رہتا ہے۔ مکان وغیرہ کا نمبر بھی بتایا تھا اس نے۔"

"کیا نمبر ہے؟" میں نے پوچھا اور چاچا چونک کر مجھے دیکھنے لگے پھر بولے۔

"اب جان بچ گئی تو چھوڑ اس چکر کو، رمضان ذرا بدمعاش قسم کا آدمی ہے۔"

"یونہی پوچھ رہا تھا۔ مگر مجھے اس کا پتہ تو بتا دو۔"

"مکان نمبر تین سو تیرہ ہے، ایک ہوٹل اس کے سامنے ہے، اس علاقے میں ایک ہی ہوٹل ہے۔"

"تین سو تیرہ" میں نے نمبر ذہن نشین کر لیا، بہرحال مقررہ وقت پر میں وہاں چل پڑا اور راستے معلوم کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں وہ ہوٹل نظر آ رہا تھا، ہوٹل میں مَیں نے ایک چائے پی۔ شام کے تقریباً سوا پانچ بج رہے تھے پھر میں وہیں سے مکان نمبر تین سو تیرہ پہنچ گیا اور آخر ایک بوسیدہ مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس پر کوئلے سے تین سو تیرہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ دوسری یا تیسری بار دستک پر دروازہ کھلا اور ایک آواز سنائی دی۔

"کون ہو بابا، کیوں دروازہ توڑتے ہو؟"

میں نے ایک عمر رسیدہ عورت کو دیکھا جو میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھی۔

"رمضان خان یہاں رہتا ہے؟"

"ہاں بولو کیا بات ہے۔"

ایک لمحے میں میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اندھوں کی طرح پلکیں جھپکا رہی ہے۔ "رمضان خان اندر ہے۔"

"نہیں۔" عورت نے کہا۔

"کہاں گیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کب آئے گا؟"

"نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا۔"

"کون ہو تم؟"

"میں اس کا دوست ہوں، آپ رمضان کی کون ہیں؟"

"ماں ہوں اس کی۔"

"اچھا اماں جی میں چلتا ہوں۔"

"اچھا پھر کب آؤ گے؟" عورت نے پوچھا۔

"جب بھی فرصت ملی آؤں گا اماں۔" میں نے کہا

اور دروازے سے واپس پلیٹ پڑا۔ رمضان کی ماں اندھی عورت‘ ہاں وہ اندھی ہی تھی اور شاید گھر میں اکیلی تھی اور یہ گھر عورت اس کا سہارا رمضان دل نے کہا اچھا ہوا رمضان نہیں پکڑا گیا‘ اگر وہ پکڑا جاتا اور بریف کیس اس کے پاس سے مل جاتا تو اس کی اندھی ماں کا کیا ہوتا‘ یہ کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرتی‘ کون اس کے گھر کا چراغ جلاتا۔ اچھا ہوا بہت اچھا ہوا‘ میرا کون ہے اگر سزا بھی ہو مجھے تو تکلیف کسے ہوتی‘ کسی کو نہیں۔ دل پر جیسے شبنم کے قطرے پڑے تھے۔ ایک ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی تھی‘ پہلے رمضان کے خلاف دل میں غصہ تھا‘ گھٹن تھی‘ مگر اب نہیں۔

ہوٹل کے سامنے سے گزرا‘ سامنے ہی نظر پڑی‘ رمضان ہی تھا وہ شاید اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا‘ میں ٹھٹک گیا اب یہاں آیا ہوں تو اس سے مل ہی لوں‘ مگر میں نے خود کو اس سے چھپا لیا اور اس کا پیچھا کرنے لگا وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا‘ وہ اسی گھر میں داخل ہوا تھا۔ دو چار منٹ کے بعد میں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ رمضان نے ہی کھولا تھا۔ اس نے میری صورت دیکھی اور اس کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا‘ پھر اس نے گردن اٹھا کر میرے پیچھے دیکھا اور کسی کو نہ پا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا‘ پھر بولا۔

”آؤ اندر آ جاؤ‘ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم ہی آئے تھے یہاں؟“

”ہاں۔“

”اماں نے مجھے بتایا تھا آؤ اندر آ جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو گے۔“

میں اندر داخل ہو گیا‘ عسرت زدہ گھرانے میں پہلے اندھیرا تھا اب روشنی ہو گئی تھی‘ یہ روشنی یقیناً رمضان نے جلائی ہو گی‘ وہ نہ آتا تو روشنی نہ ہوتی وہ اس گھر کا چراغ تھا۔

”بیٹھو۔“ اس نے ایک تخت کی طرف اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔

”میں سمجھا کہ تم پولیس کو لے کر آئے ہو‘ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو رمضان بولا۔ ”مگر تمہیں یہاں کا پتہ کس نے دیا؟“

”تم نے مجھے دھوکا دیا ہے رمضان خان۔“

”خدا کی قسم لعنت ہے دھوکا دینے والے پر‘ مگر کیا کرتا‘ تم پھنس گئے تھے‘ میں نے سوچا کہ میں بچ جاؤں تجھے بہت مارا ہے نا پولیس والوں نے۔“

”بریف کیس کہاں ہے؟“

”رکھا ہوا ہے یار تقدیر نے یہاں بھی دھوکہ دیا ہے‘ اس میں تو کاغذ ہی کاغذ ہیں اور کچھ بھی نہیں نکلا۔“

”ایک بات بتاؤ رمضان اگر میں تمہیں تلاش نہ کرتا تو تم مجھے ملتے۔“

”خدا کی قسم‘ تیری پوری پوری خبر رکھتا۔ تیری ضمانت کراتا۔“

”اب کیا کرو گے؟“

”اور دروازہ تلاش کریں گے‘ بہت سے اڈے ہیں یہاں پر‘ تو نے میری ماں کو دیکھا ہے میرے سوا اس کا اور کوئی نہیں ہے دنیا میں‘ وہ اندھی ہے ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں آپریشن ہو گا۔ بہت بڑا خرچا آئے گا‘ یار میری ایک آرزو ہے۔“

”کیا؟“

”ویسے تو آرزوئیں بہت سی ہوتی ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ماں کا آپریشن ہو جائے پر تقدیر ساتھ نہیں دے رہی۔“

”اچھا چل تجھے چائے پلاؤں۔“

”نہیں چائے میں نے سامنے والے ہوٹل سے پی لی ہے۔“

”ناراض ہے مجھ سے؟“

”اب نہیں ہوں۔“

”پہلے تھے۔“

”ہاں۔“

”اب کیوں نہیں ہو؟“

”اس لیے کہ تیرے پاس ماں ہے‘ اندھی ہے اور تو اس کا علاج کرانا چاہتا ہے‘ اس لیے رمضان تجھے سب کچھ جائز ہے‘ ہاں یہ بریف کیس مجھے دے دے اگر تیرے کام کا نہیں ہے۔“

”تم کیا کرو گے اس کا؟“ رمضان نے پوچھا۔

”اسے اس کے مالک کو واپس کر دوں گا۔“

”تمہیں کیا ملے گا؟“

”کچھ نہیں یار‘ دنیا کو سمجھ رہا ہوں‘ آزمانا چاہتا ہوں۔“

”واہ پڑھے لکھوں جیسی بات کرتے ہو‘ مگر یہ دنیا تم کیا سمجھو گے دنیا کو‘ سب مطلب کے لوگ ہیں‘ کوئی ی کے کام نہیں آتا۔ تم بریف کیس لے کر جاؤ گے‘ وہ پوچھے گا کہ یہ بریف کیس کدھر سے ملا‘ کیا بولو گے اس کو؟“

”بریف کیس اس کے حوالے کر دوں گا اور اس سے کہوں گا کہ اس کی چیز اس کے حوالے ہے اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔“

”گردن پھنس جائے گی تیری نیکی مت کر‘ کچھ نہیں ملتا نیکی کرنے میں‘ بس اپنا دھندہ دیکھ‘ اب تو ے گھر آ گیا ہے تو پھر ایسا کر ابھی میرے ساتھ رہ ی اور جگہ دھندہ کریں گے‘ ادھر بڑی گڑبڑ ہے۔“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں رمضان۔ لاؤ بریف کیس مجھے دے دو۔“

”ٹھیک ہے جیسی تیری مرضی‘ ایک بات میں ں تیرے کو‘ ابھی میرا نام پولیس کو مت دینا‘ میں نے تیرے ساتھ دھوکا نہیں کیا‘ اپنا دل صاف ہے پھر بھی اگر تیرے دل میں برائی ہے تو تیری مرضی ہے‘ میری ماں کا اور کوئی سہارا نہیں ہے اس بات کا خیال رکھنا۔“ رمضان خان نے کہا اور اندر چلا گیا‘ پھر اس نے بریف کیس لا کر میرے سامنے رکھ دیا‘ میں نے بریف کیس کھول کر دیکھا‘ اس میں بہت سے کاغذات رکھے ہوئے تھے‘ مگر ان کاغذات کو پڑھ نہیں سکتا تھا میں۔

بریف کیس کی تلاشی لینے میں چھوٹے چھوٹے کارڈ بھی نظر آئے‘ ایسے کارڈوں کے بارے میں مَیں جانتا تھا کہ ان پر نام پتہ لکھا ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اس سے کہا۔

”چلتا ہوں تیرے پاس کبھی کبھی آتا رہوں گا۔“

”اسی اڈے پر کام کرے گا۔“

”نہیں۔ اب دیکھوں گا کوئی اور اڈہ تلاش کروں گا۔“

”مگر تیرا دل ابھی صاف نہیں ہوا ہے‘ تیری مرضی ہے‘ اور کچھ نہیں کہوں گا تجھ سے۔“

میں وہاں سے باہر نکل آیا‘ اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ بریف کیس کے ساتھ اب مجھے اپنے ٹھکانے پر نہیں جانا چاہیے‘ رات گزارنے کے لیے اور کوئی جگہ بھی نہیں تھی میرے پاس‘ بہت دیر تک سوچتا رہا اور اس کے بعد میں نے وہی ٹھکانہ پسند کیا چنانچہ بریف کیس کو میں نے اپنی اسی ٹوٹی ہوئی گاڑی کے نیچے چھپا دیا جس کا پتہ رمضان نے مجھے دیا تھا۔ پھر رات کو معمول کے مطابق بس میں کام کیا اور بس میں ہی سو گیا۔

دوسرے دن صبح حلوہ پوری کا ناشتہ کیا آج کام نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا‘ پہلے بریف کیس کا مسئلہ حل کر لیا جائے‘ بریف کیس اسی جگہ رہنے دیا اور وہ کارڈ جو

بریف کیس کی ایک جیب میں رکھے ہوئے تھے انہیں اپنے ساتھ لے لیا' ایک ہی جیسے کارڈ تھے' ایک پڑھے لکھے آدمی کو دیکھ کر میں نے اسے روکا سلام کیا اور کارڈ اس کے سامنے کرتا ہوا بولا۔

''آپ مجھے یہ پتا بتا سکتے ہیں؟''

''یہ پتا یہاں کا نہیں ہے' اس میں کسی رحمان بیگ ایڈووکیٹ کے بارے میں لکھا ہے اور ان کا دفتر سٹی چیمبر میں ہے۔''

اس نے مجھے سٹی چیمبر کا پتا بتایا اور میں نے کارڈ واپس جیب میں رکھ لیے' بہرحال بہت دیر تک سوچتا رہا اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ وہیں پر پہنچنا چاہیے جہاں کا پتا دیا گیا ہے۔ شام ساڑھے چھ بجے میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بریف کیس اس جگہ سے نکالا اور اسے ہاتھ میں لیے چل پڑا' اس کے دفتر اور گھر کے بارے میں مجھے تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد میں بس سے اتر کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں وکیل صاحب کی رہائش گاہ تھی۔

جب میں نے دروازہ کی بیل پر انگلی رکھی تو ایک درمیانی عمر کی خاتون باہر نکل آئیں اور آہستہ سے بولیں۔

''کس سے ملنا ہے؟''

''وکیل صاحب یہیں رہتے ہیں۔''

''ہاں آؤ اندر آ جاؤ۔''

نجانے ان کی آنکھوں میں کیسے تاثرات تھے' غالباً میرے چہرے کی نیلاہٹیں انہیں میرے بارے میں عجیب و غریب احساسات کا شکار کر رہی تھیں' انہوں نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر بٹھا دیا۔ صاف ستھرہ سا کمرہ تھا۔ صوفے پڑے ہوئے تھے میں اطمینان سے بیٹھ گیا' چند ہی لمحوں کے بعد وکیل صاحب اندر آ گئے' انہوں نے مجھے دیکھا اور بری طرح اچھل پڑے' پھر ان کی نظر میرے پاس رکھے ہوئے بریف کیس پر پڑی اور وہ بے اختیار اس کی جانب لپکے۔

''یہ..... یہ..... بب..... بریف کیس مم..... میرا ہے۔''

''جی جناب آپ ہی کا ہے۔''

''ارے اوہ اوہ.....'' انہوں نے جلدی سے بریف کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر بے تابی سے اسے کھولنے لگے۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح اس میں موجود کاغذات دیکھتے رہے' پھر جب انہوں نے تمام کاغذات دیکھ لیے تو ان کے چہرے پر گہرا سکون نظر آیا' انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔ غالباً جہانو بتایا تھا تم نے' یہی نام ہے نا تمہارا؟''

''جی صاب۔''

''کیا یہ بریف کیس تم مجھے پہنچانے آئے ہو؟''

''جی..... مجھے علم تھا کہ اس میں آپ کے ضروری کاغذات ہیں' آپ نے تھانے دار کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے اور اس کے علاوہ آپ نے میرے اوپر احسان بھی کیا تھا' آپ کے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا گیا' میں نے سوچا کہ اب یہ میری ذمے داری ہے بریف کیس تلاش کر کے آپ تک پہنچاؤں' سنئے وکیل صاحب بریف کیس میں نے نہیں چرایا تھا' اسے گاڑی صاف کرنے والا رمضان خان لے گیا تھا' مجھے واقعی اس کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا' پولیس نے مجھے بہت مارا پیٹا ہے بہت سختی کی ہے میرے ساتھ اور مجھے گالیاں بھی دی ہیں لیکن آپ نے میرے اوپر جو احسان کیا ہے' میں نے اس کا صلا آپ کو چکا دیا ہے۔''

''مگر یہ بریف کیس تم کہاں سے لائے؟''

''رمضان خان کا پتہ معلوم کر کے اس کے گھر گیا اور اس سے یہ بریف کیس لے کر آپ کا گھر تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا۔''

''تمہیں میرے گھر کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

انہوں نے کہا اور میں نے جیب سے وہ کارڈ نکال کر ان کے سامنے کر دیئے۔ ''یہ کارڈ آپ کے بریف کیس کی جیب میں موجود تھے' وکیل صاحب نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولے۔

''میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں جہانو' پورا نام کیا ہے تمہارا؟''

''چھوڑیئے وکیل صاحب ہم لوگوں کے نام پورے نہیں ہوتے' ویسے بس چھوڑیئے۔''

''تمہارا بہت شکریہ۔ یہ کاغذات میرے لیے زندگی کی طرح سے تھے' وکیل ہوں' وکالت کرتا ہوں اگر یہ کاغذات مجھے نہ ملتے تو تم میرے نقصان کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے' پچھلی رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا' خیر میں تم سے معافی مانگتا ہوں' میں اٹھا تو وہ جلدی سے بولے۔

''نہیں سنو' بیٹھو بیٹھو' تمہیں کہیں جانے کی جلدی ہے؟''

''نہیں اب میرا یہاں رُکنا مناسب نہیں ہے۔''

''بیٹھو' اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرتے ہو' میں جانتا ہوں تمہارے اندر اور بھی کچھ ہے۔''

''اجازت چاہتا ہوں۔''

''نہیں تمہیں چائے پی کر جانا ہوگا۔''

''نہیں وکیل صاحب' مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے' میرے ساتھ جو ہوا ہے میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔''

''زندگی بہت طویل ہوتی ہے اور راستے بہت وسیع' تم اگر اپنے لیے کسی راستے کا تعین کرو گے تو تمہیں بہت سی مشکلات پیش آئیں گی' میں تمہاری مدد کروں گا۔''

''نہیں میں کسی کی مدد نہیں چاہتا۔'' میں نے جواب دیا۔

وکیل صاحب مجھے بہت کچھ سمجھاتے رہے تھے لیکن میں نے ان کی ایک نہ مانی اور ان کے پاس سے واپس چلا آیا' دل پر ایک عجیب سا بوجھ طاری تھا آج یوں لگ رہا تھا جیسے میری زندگی خود مجھ پر بھاری ہو' کیا کروں کہاں جاؤں کیسے وقت گزاروں ایک بات جو سمجھ میں آ رہی ہو' کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا' ان دنوں جو گزری تھی مجھ پر میرا دل ہی جانتا تھا' نجانے کیوں شہر سے وحشت ہونے لگی۔ نگاہوں کے سامنے جو کچھ آ رہا تھا برا لگ رہا تھا' رمضان نے جن حالات میں وہ عمل کیا تھا وہ بھی کافی پریشان کن تھے۔

یونہی ٹہلتا ٹہلتا ریلوے اسٹیشن کی جانب نکل آیا اور پھر دل میں نجانے کیا سمائی کہ ریلوے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا' ایک ٹرین آ کر رکی تھی' لوگ اتر رہے تھے چڑھ رہے تھے' زندگی بڑی ہنگامہ پرور تھی' میرے قدم خود بخود ریل کے ڈبے کی جانب اٹھ گئے اور اس کے بعد میں ریل پر چڑھ گیا۔ بالکل دیوانگی کا سا عالم طاری تھا مجھ پر' میں ایک جگہ بیٹھ گیا اور بھاگتے دوڑتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ کب ریل کو جھٹکا لگا اور وہ آہستہ آہستہ رینگنے لگی' ایک عجیب سی کیفیت تھی میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی کے نجانے کتنے رُخ ہوتے ہیں' مجھ پر یہ مشکلیں نہ ٹوٹتیں تو بالکل ہی بے وقوف ہوتا۔ بس نوکری کرتا رہتا لیکن اس کوٹھی سے نکل آیا تھا اور اب پہلی بار ریل سے سفر کر رہا تھا۔ پھر ریل میں مجھے شبیر علی ملے' اسکول ماسٹر تھے۔ مجھ سے سلام دُعا ہوئی اور

یہ جان کر کہ میں بن ماں باپ کا ہوں، مجھے اپنے گھر لے گئے، نیک اور دین دار آدمی تھے۔ مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا......اور زندگی نئے تجربوں سے دوچار ہونے لگی۔ میں گھر کے کام کاج کرتا تھا، وہ مجھے پڑھاتے تھے یہاں سے میں پڑھنا لکھنا سیکھ گیا اور ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان کی پانچ بیٹیاں تھیں بیٹا کوئی نہیں تھا۔ سب سے بڑی لڑکی خالدہ تھی، مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی مگر چند سال بڑی لگتی تھی، میں اسے خالدہ باجی کہتا تھا۔

ایک دن صحن میں پیپل کے پیڑ کے نیچے سو رہا تھا کہ آنکھ کھل گئی، کوئی میرے پاس آ کر لیٹ گیا تھا۔

"کون ہے؟" میں نے حیرت سے کہا تو میرے منہ پر ایک ہاتھ آ جما۔

"شور کیوں مچا رہا ہے؟" سرگوشی خالدہ باجی کی تھی۔

"باجی!"

"کیا باجی باجی لگا رکھی ہے، چھوٹی ہوں تجھ سے۔"

"یہاں کیوں آ گئیں؟"

"اندر بڑی گرمی ہے، دیکھ تو پسینے میں بھیگ رہی ہوں۔" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے قمیص کے نیچے پسینہ دکھایا، عجیب پسینہ تھا۔ میں نے جلدی سے ان سے ہاتھ چھڑا لیا اور پلنگ سے نیچے اتر آیا۔

"میں کہیں اور سو جاتا ہوں۔"

"پاگل ہوا ہے کیا۔ چپ کا پڑا رہ۔"

"نہیں باجی۔"

"پھر باجی......"

"باجی آپ جائیں یہاں سے۔"

"نہیں جاؤں گی۔"

"میں ماسٹر صاحب کو آواز دے لوں گا۔"

"جہانو......تو جوان ہو چکا ہے، کیا تجھے اپنی جوانی کا احساس نہیں؟"

"بس آپ جائیں......" میں نے کہا۔

اسی وقت ماسٹر شبیر علی کی کھانسی کی آواز اُبھری اور خالدہ باجی بجلی کی طرح تڑپ کر اُٹھ گئیں اور پھر دبے پاؤں اندر چلی گئیں۔

دوسرے دن میں ماسٹر شبیر علی کے ساتھ اسکول گیا تو انہوں نے کپڑوں کی ایک پوٹلی مجھے دے کر کہا۔

"جہانو بیٹے! تو بہت اچھا ہے۔ خدا تجھے خوش رکھے۔"

"مگر یہ کیا ہے ماسٹر صاحب!"

"تیرے کپڑے۔"

"کیا کروں ان کو؟"

"یہ پانچ سو روپے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے مجھے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"کہیں جانا ہے؟"

"ہاں"

"کہاں؟"

"اپنی تقدیر پر بھروسہ کر، جہاں بھی تجھے لے جائے بیٹے اب میں تجھے گھر میں نہیں رکھ سکتا، بچیاں جوان ہو گئی ہیں لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔"

میں نے خاموشی سے یہ چیزیں ان سے لے لیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ رات کو ماسٹر صاحب جاگ رہے تھے۔ واقعی میں جوان ہو گیا تھا، کیونکہ میں نے ماسٹر صاحب سے کچھ نہیں کہا تھا اور خاموشی سے وہاں سے چل پڑا تھا۔

بہت کچھ ملا تھا مجھے اس گھر سے۔ اتنا علم مل گیا تھا کہ دنیا کو سمجھ سکوں۔ اعتماد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور ایک نئے شہر میں آ گیا۔ یہاں ریلوے کے ایک مال خانے کے منشی صاحب تھے۔ نام جمیل بیگ تھا۔ انہوں نے مجھے حساب کتاب کی نوکری

دے دی جس کی تنخواہ وہ اپنے پراسرار وسائل سے ادا کرتے تھے۔ ریلوے کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک بیٹا جمال بیگ تھا، بیوی تھیں، مجھے بھی اسی گھر میں ہی پناہ مل گئی۔

جمال بیگ آوارہ منش تھا، پورا گھرانہ دلچسپ تھا۔ جمیل بیگ کے بارے میں پتہ چلا کہ دنیا کا ہر نشہ کر چکے ہیں اور اب ہر نشہ ان پر بے اثر ہے۔ پھر بھی اخلاقاً افیون کھا لیا کرتے تھے، وہ کسی خاص مشن پر کام کر رہے تھے۔ عجیب عجیب بھٹیاں بنا رکھی تھیں، عجیب برتنوں میں کچھ پکاتے رہتے تھے۔

"یہ آپ کیا کرتے ہیں جمیل چچا؟"

"اپنے کام سے کام رکھا کر......!" انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔

"میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔"

"میرے ساتھ کام کرے گا؟"

"کیا کام!"

"یہی جو میں کرتا ہوں۔"

"میں نے پوچھا تو تم نے ڈانٹ دیا"

"رازداری کا وعدہ کر۔"

"کیا......" میں نے کہا۔

"سونا بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیمیا بنا رہا ہوں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے سونا بنتا ہے۔"

"تو پھر......؟"

"بس ذرا سی کسر رہ جاتی ہے لیکن کامیاب ہو جاؤں گا۔"

پھر میں نے بھی ان کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ نہ جانے کیسی کیسی جڑی بوٹیاں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ جھک مارنی پڑتی تھی۔

ایک دن جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو آج کل تم بھی ابا کے ساتھ سونا بنا رہے ہو؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے بےزاری سے کہا۔

"یہ دونوں پاگل ہیں۔"

"دونوں کون؟"

"اماں اور ابا۔"

"کیا بکواس ہے؟ اپنے ماں باپ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو؟"

"کیا کروں! بچپن سے یہی دیکھ رہا ہوں۔"

"مگر چچی کیا کرتی ہیں؟"

"دیکھا نہیں تم نے؟"

"کیا؟"

"اُلٹے سیدھے وظیفے پڑھتی رہتی ہیں۔ جنات اور آسیب کو قبضے میں کرنے کے لیے۔"

"کیا......؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"دونوں ہی مریض ہیں......"

جمال بیگ اپنے ماں باپ کی ذرا بھی عزت نہیں کرتا تھا۔ ویسے خود بھی کوئی بہتر انسان نہیں تھا لیکن مجھے ان تمام باتوں سے کیا غرض......وقت گزر رہا تھا اور میں بہت کچھ سیکھتا جا رہا تھا۔ جمیل بیگ کیمیا بنانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا اور پھر ایک دن آدھی رات کے وقت جب تمام لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ اچانک جمیل بیگ کی چیخوں سے سارا گھر لرزنے لگا۔ سب ہی جاگ گئے، جمیل بیگ شعلوں میں گھرا ہوا تھا اور پورے گھر میں لوٹتا پھر رہا تھا لیکن عجیب سی آگ تھی، یہ آگ اس کے لباس سے اٹھتی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن کی کھال جل رہی ہو، گوشت جلنے کی چراند اور نیلے شعلوں نے اس کے پورے بدن کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ جمال بیگ کمبل لے کر اس کی طرف دوڑا تو

اس کی ماں نے جمال بیگ کا کالر پیچھے سے پکڑ لیا اور اسے ایک جانب دھکیلتی ہوئی بولی۔

"اگر تُو اس کے قریب پہنچا تو تیری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں ہوگی......"

"مم...... مگر...... وہ مر جائے گا......"

"اس نے یہ موت خود خریدی ہے، حالانکہ میں نے اسے منع کیا تھا......"

"کیا مطلب؟" جمال بیگ بولا۔

"کیا یہ مطلب بتانے کا وقت ہے۔" اس کی ماں نے، جسے میں چچی کہا کرتا تھا...... سخت لہجے میں کہا، مجھے بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ چچی کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ جمیل بیگ کو جلنے دینا چاہتی ہے لیکن کیوں......؟ آخر کیوں......؟ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ جمیل بیگ زمین پر گر کر تڑپتا رہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد جھلس کر چرمر ہو گیا۔ میرے لیے یہ نہایت سنسنی خیز لمحات تھے، جمال بیگ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو موت کی آغوش میں جاتے دیکھ رہا تھا، چچی جان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میرا سہاگ ختم ہو گیا، لیکن کیا کروں۔ اس انسان کو کس طرح سمجھاتی۔ پوری زندگی ہی سمجھاتے سمجھاتے گزری ہے، نہ باپ نے کبھی کچھ کہا نہ بیٹے نے، کانٹوں کی سیج پر جھلستی رہی ہوں۔"

"لل...... لیکن...... لیکن......"

"نہیں...... بیکار ہے، جہانو بیٹے بیکار ہے۔ نہ تم کچھ کر سکتے ہو نہ میں اور نہ ہی جمال بیگ کچھ کر سکتا تھا۔ جمیل بیگ کو مرنا ہی تھا۔ میں جتنی کوشش کر سکتی تھی کر لی، کامیاب نہیں ہو سکی......" اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

عجیب کردار تھا اس عورت کا کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی میرے۔

بہرحال اہل محلہ کو علم ہوا کہ جمیل بیگ جھلس کر مر گیا ہے۔ سب ہی اس سے نالاں معلوم ہوئے۔ میں حالانکہ خاصا عرصہ یہاں گزار چکا تھا لیکن نجانے کیوں یہ خاندان میری نگاہوں میں بے حد پراسرار تھا۔ اب دنیا کو سمجھنا آ گیا تھا، ویسے بھی عمر کم نہیں رہی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ کافی آگے بڑھ گیا تھا اور دنیا کو بہت گہری نگاہوں سے دیکھ چکا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چچی جان اپنا سہاگ لٹ جانے کی وجہ سے دل برداشتہ رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے بیوگی خود پر طاری کر لی تھی لیکن شوہر کے سلسلے میں جب بھی کبھی گفتگو ہوتی ان کا لہجہ تلخی سے بھرپور نظر آتا تھا۔

بالآخر ایک دن یہ راز بھی کھل گیا۔ جمال بیگ تو اپنی آوارہ گردی میں مصروف رہتا تھا صرف میں تھا جو چچی جان کا راز دار، ہمدرد، مونس اور غم خوار تھا۔ انہوں نے کہا۔

"شادی کے بعد آج تک، یعنی اس وقت تک جب تک جمیل بیگ زندہ رہا صحیح معنوں میں مجھے یہ احساس ہی نہیں ہو سکا کہ عورت کو زندگی میں کبھی مرد کا تحفظ مل سکتا ہے یا نہیں، میں ان تمام چیزوں سے محروم ہوں۔ زندگی کے ہر شعبے سے گزرنے کے لیے مجھے اپنے طور پر ہی سب کچھ کرنا پڑا ہے......"

"لیکن چچی جان بات کیا ہے......؟"

"بات کیا ہوتی میں خود بھی ایک معمولی سے گھرانے کی فرد ہوں، دیکھو بیٹے ہر انسان زندگی اپنے طور پر اپنے انداز میں گزارتا ہے۔ جیسے اس کے وسائل ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی وسائل کی تلاش میں زندگی کھو دینے پر تل جائے تو اس کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ جمیل بیگ ابتداء ہی سے کچھ کرنے کا قائل نہیں تھا بلکہ اسی طرح جیسے اب اس کا بیٹا جمال کچھ نہ کرنے

کا قائل ہے۔ آوارہ گردی کی زندگی بسر کرنے کے بعد اپنے لیے پیٹ بھر روٹی حاصل کر لیتا ہے، تن پر کپڑا حاصل کر لیتا ہے اور بس اس کے بعد اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو میں دیکھ رہا ہوں......"

"جبکہ زندگی ایسی چیز نہیں ہے......"

"مجھے اندازہ ہے چچی جان......"

"یہی کیفیت جمیل بیگ کی تھی، مجھ سے شادی ہو گئی، جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ ایک معمولی سے گھرانے کی فرد ہوں میں بھی، میرے ماں باپ نے بھی مجھے یوں سمجھ لو بوجھ سمجھ کر اتار دیا تھا اور یہ بوجھ جمیل بیگ نے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اپنے مشاغل میں مصروف رہا اور اس نے ساری زندگی سونا بنانے کے چکر میں گزار دی، مجھے بھی اس نے اسی راستے پر لگا دیا نہ جانے کیسے کیسے گنڈے، تعویذ اور عمل نیک اور بد، میں کچھ نہیں جانتی بس کچی عمر میں آئی تھی اس کے پاس، اس کے رنگ میں رنگ گئی لیکن جوں جوں زندگی آگے بڑھی مجھے یہ احساس ہوتا چلا گیا کہ ایک انتہائی نکمے اور بدنیت انسان کے ساتھ زندگی کا یہ سفر کرنا پڑے گا۔ بہرحال جہانو، انسان کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے۔ میرا ابھی یہی ماحول تھا، رفتہ رفتہ میں نے یہ سب کچھ قبول کر لیا لیکن جمیل بیگ کی کارکردگی سے مجھے کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ میں بھی چلّے وظیفوں کی عادی ہو گئی اور اپنے طور پر اسی انداز میں کام کرنے لگی۔ پھر یہ کمبخت جمال بیگ میری زندگی میں آیا لیکن اس نے بھی جوان ہونے کے بعد جو روپ اختیار کیا اب وہ تمہارے سامنے ہے۔"

"لیکن چچی جان وہ آگ کیسی تھی جس نے جمیل بیگ کو جھلسا دیا......؟"

چچی جان کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پھیل گئی، تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"اس نے بھیروں جگانے کی کوشش کی تھی۔"

"کیا......؟"

"ہاں...... وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہا تھا۔ تمام کوششیں کر لیں اس نے۔ اس کا کہنا تھا کہ کیمیا بنانے کے لیے بس ایک ایسی کسر باقی رہ جاتی ہے جو آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر وہ کسر بھی پوری ہو جاتی تو وہ سونا بنا کر دنیا کا امیر ترین انسان بن سکتا تھا۔"

"پھر......؟" میں نے سوال کیا۔

"پھر میں نے اسے بھیروں جگانے کی ترکیب بتا دی......"

"کیا؟"

"ہاں......"

"آپ نے بتا دی چچی جان......؟"

"ہاں...... مجھے معلوم تھا......"

"مگر کیسے......؟"

"یہ نہ پوچھو بیٹے......" چچی جان نے کہا۔

"لیکن چچی جان اس ترکیب کے بعد تو جمیل بیگ کی زندگی ہی نہ رہی......"

"آسان کام نہیں تھا۔ بہت مشکل کام تھا۔ جن، بھوت، پریت، آسیب، آسانی سے قابو میں نہیں آتے وہ کسی انسان کی غلامی کیوں پسند کریں گے، لیکن ہاں اگر انسان کے پاس طاقت ہو تو وہ یہ غلامی قبول کر سکتا ہے اور یہی پیر دولہا میاں کا کہنا ہے......"

"پیر دولہا میاں......" میں نے چونک کر پوچھا اور محسوس کیا کہ چچی جان بھی ایک دم چونک گئی ہیں۔

"بہت زیادہ باتیں نہیں کرتے۔"

"لیکن چچی جان میرے دل میں یہ خیال ہے کہ میں آپ سے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم کروں۔"

وہ مجھے غور سے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

”پیر دولہا میاں...... ایک عجیب و غریب انسان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان‘ کون سے مذہب سے تعلق رکھتا ہے‘ بہت فاصلے پر اس نے اپنی مڑھیا بنا رکھی ہے وہیں رہتا ہے‘ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کا کوئی کام بھی کر دیتا ہے۔ مجھ پر خاص طور سے مہربان ہے‘ یقین کرو میں نے پورے خلوص کے ساتھ اس سے بھیروں جگانے کی ترکیب پوچھی تھی......“

”مگر بھیروں ہے کیا چیز......؟“

”کالے علم کا ایک دیوتا جو اگر قابو میں آجائے تو بہت سے کام آسان ہو جاتے ہیں اگر بھیروں جگالیا جاتا تو سونا بنانے کی وہ ترکیب آسانی سے جمیل بیگ کو حاصل ہو جاتی اور اس کے بعد اس کا کام بن جاتا۔ وہ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ بہت عرصے سے پیچھے پڑا ہوا تھا‘ لیکن پیر دولہا میاں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔“

”کیا کہہ دیا تھا......؟“

”یہی کہ بھیروں جگانے میں اگر اُسے ناکامی ہوئی تو پھر وہ زندگی نہ پا سکے گا......“

”یعنی مر جائے گا۔“

”ہاں......“

”تو پھر......؟“

”میں نے وہ ترکیب جمیل بیگ کو بتادی......“

”اور جمیل بیگ اس سلسلے میں مصروف ہو گئے؟“

”ہاں......“

”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے چچی جان کہ وہ بھیروں جگانے کی اس ترکیب کو صحیح طور پر استعمال ہی نہیں کر سکے۔“

”یہی بات ہے......“

”اور ان کے بدن کو آگ لگ گئی......“

”اس آگ کو کوئی نہیں روک سکتا تھا اور اسے بجھانے کی کوشش کرنے والا خود بھی اسی آگ کا شکار ہو جاتا۔ اسی لیے میں نے جمال بیگ کو اور تمہیں اس سے منع کیا تھا۔“

”یہ تو بہت بری بات ہوئی......“

”دیکھو بیٹے ویسے تو انسان بڑی کمزور شخصیت کا مالک ہوتا ہے لیکن بہتر یہی ہوتا ہے کہ اسے اپنے طور پر اپنی زندگی گزارنے کا بندوبست کرنا چاہیے اور ایسے طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔“

”مگر انسان چاہتا تو یہی ہے چچی جان......“

”ہاں یہی چاہتا ہے‘ تمہیں ہنسی آئے گی کہ اب میں خود بھی اس کی عادی ہو چکی ہوں۔“

”کیا......؟“

”طویل زندگی پڑی ہے میرے سامنے‘ نجانے کس طرح وقت گزرے نجانے کیا ہو‘ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”ٹھیک ہے...... لیکن اب آپ کیا کریں گی؟“

”کیا کر سکتی ہوں؟ تم دیکھ رہے ہو کہ جمال بیگ میرا بیٹا ہونے کے باوجود میرے لیے بالکل ہی ناکارہ ہے۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ تصور کبھی بھی نہیں آیا کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور ماں کی زندگی کے لیے اسے کچھ کرنا چاہیے‘ میں نے بھی دوسری ماؤں کی طرح اس کے لیے طرح طرح کے خواب دیکھے تھے‘ اس گھر کو ایک اچھے گھر کی مانند سجانا چاہا تھا‘ اپنے بیٹے کی زندگی اس کا مستقبل شروع کرنے کی خواہش کی تھی میں نے۔ لیکن کیا کروں ہر خواہش پوری نہیں ہو جاتی‘ وہ میرے ساتھ کسی طور تعاون نہیں کرتا‘ تم خود دیکھ رہے ہو آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ بس اس کے علاوہ اسے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہے لیکن میرے سامنے

میری ایک طویل زندگی پڑی ہے۔“

”چچی جان میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں......“ میں نے کہا اور چچی جان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بیٹے میں نے زندگی میں کبھی غیر حقیقی وقت نہیں گزارا۔ میں جانتی ہوں کہ جب اپنا خون ہی اپنے ساتھ وفا نہ کر سکے تو دوسروں پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟“

”چچی جان! کبھی کبھی غیر بھی اپنوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔“

”ہاں یہ ایک کہانی تو ہے‘ لیکن میں نے صرف کہانی کے طور پر اسے سنا ہے اپنی آنکھوں سے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔“

”میں کوشش کروں گا کہ اس کہانی کو حقیقت ثابت کر سکوں۔“ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گئیں اور میں اس گھرانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ واقعی اب سوچنے کا انداز تبدیل ہو گیا تھا۔ عمر اب اس منزل میں پہنچ گئی تھی کہ اپنی آنکھوں سے دنیا کی ان حقیقتوں کو دیکھ سکوں۔

بہرطور اس کے بعد جمال بیگ کا وہی وتیرہ تھا‘ آوارہ گردی کرتا‘ رات کو واپس آجاتا۔ کبھی نشے کے عالم میں‘ کبھی کسی اور کیفیت میں۔ بھلا میں اسے کیا ٹوک سکتا تھا‘ جبکہ اس کی ماں اس کی اصلاح نہیں کر پائی تھی لیکن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ چچی جان کے چلے اور وظیفوں کا وہی عالم ہے۔ راتوں کو جاگتی رہتی ہیں ویسے میں نے کبھی اسے نماز وغیرہ پڑھتے نہیں دیکھا تھا جبکہ تہجد گزار اور دین دار لوگ اپنی بقاء کے لیے یا اپنی عاقبت کے لیے اس قسم کے وظائف کیا کرتے ہیں۔ چچی جان کا سلسلہ کچھ مختلف ہی تھا اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کے راستے بھی درست نہیں رہے۔ نجانے اب اسے دولت کی خواہش کیوں تھی۔ ہو سکتا ہے اپنے بیٹے کو ایک بہتر مستقبل دینا چاہتی ہو۔ یوں زندگی کا ایک دور بھی گزرا اور ذہن مختلف تبدیلیاں قبول کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن چچی جان نے کچھ عجیب سے الفاظ میرے سامنے کہے۔

”جہانو...... اب تم اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے...... کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تمہیں...... میں نہیں چاہتی کہ جمال کی طرح تم بھی ایک بے مقصد اور بے نام سی زندگی گزار دو۔“

میں سوچ میں ڈُوب گیا۔ ماضی کے جو نقوش میرے ذہن پر چسپاں تھے وہ کبھی کبھی مجھے اپنا گھر یاد دلاتے تھے لیکن اب میں یہ سوچتا تھا کہ واقعی دنیا میں رہنے والے جس انداز میں زندگی گزارتے ہیں مجھے اس سے مختلف زندگی نہیں گزارنی چاہیے۔ مجھے کچھ سوچنا چاہیے‘ اپنے بارے میں بھی...... لیکن کیا...... یہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ میں نے کہا۔

”چچی جان میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔“

”صرف چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر کام کے لیے کچھ نہ کچھ عمل کرنا ہوتا ہے۔“

”میں کیا عمل کر سکتا ہوں؟“

”دیکھو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وقت بہت بدل گیا ہے۔ نئی دنیا کے نئے لوگ ذرا مختلف انداز میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں لیکن ہم ان ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو بہرحال اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں چچی جان!“

”دولت...... دولت...... دولت...... اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس دنیا میں صرف دولت کی عزت کی

جاتی ہے۔تم خود کتنی ہی اچھی شخصیت کے مالک کیوں نہ ہو کوئی مقام کبھی نہیں حاصل کر سکتے۔ کسی خوبصورت سی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کرو دروازے کا چوکیدار تمہیں دروازے پر ہی روک دے گا۔ ہاں اگر تم کسی اعلیٰ درجے کی کار میں بیٹھ کر اس دروازے تک پہنچو تو وہ تمہیں سلام کرے گا اور اس کے بعد ادب سے گیٹ کھول کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ جانے بوجھے بغیر کہ تم کون ہو۔"

"یقیناً چچی جان ایسا ہوتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنے آپ کو ان لوگوں میں شامل کرنا چاہتے ہو جو دروازے پر کھڑے ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے ہیں یا پھر ان لوگوں میں جو کھلے دروازے سے بآسانی اندر داخل ہو جاتے ہیں؟"

"چچی جان دنیا کا ہر شخص اپنے لیے تمام دروازے کھلے ہی دیکھنا چاہتا ہے۔"

"لیکن یہ اتنا آسان تو نہیں۔"

"میں جانتا ہوں......"

"اب تمہیں تجربہ بھی ہو چکا ہوگا۔"

"کافی حد تک......"

"تو پھر اس کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"میں نہیں جانتا کہ یہ کوشش میں کیسے کر سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔"

"تو بتائیے......"

"ہر جمعرات کو پیر دولہا میاں کے پاس جایا کرو......"

"یہ پیر دولہا میاں کیا چیز ہیں؟"

"اس انداز میں ان کے بارے میں گفتگو نہ کرو۔ بہت کارآمد شخصیت ہیں۔ اگر اس کی نظر تم پر ہو گئی تو یوں سمجھ لو کہ تمہارے بہت سے مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں گے۔"

"چچی جان میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میرے ساتھ چلنا......"

اور پھر پہلی بار میں نے پیر دولہا میاں کی خانقاہ دیکھی۔ ایک ویران سی جگہ آباد کر رکھی تھی اس نے۔ قرب و جوار میں پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے ناریل کے درخت بھی اُگے ہوئے تھے۔ پانی کا ایک چشمہ بھی تھا اور اس کے درمیان پیر دولہا میاں نے اپنی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ عقیدت مند اپنی کاروں میں بیٹھ کر وہاں جایا کرتے تھے اور نجانے کیا کیا حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ پیر دولہا میاں ایک بھاری بدن کا آدمی تھا۔ سر گنجا' داڑھی بہت بڑی لیکن چہرے پر ایک ایسی کرختگی' ایسی خشونت اور آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت نظر آتی تھی کہ اسے دیکھ کر ایک کراہیت کا احساس ہوتا تھا...... حالانکہ چچی جان کا کہنا تھا کہ وہ ایک پہنچی ہوئی شخصیت ہے لیکن پتہ نہیں وہ شخصیت کہاں تک پہنچی ہوئی تھی۔ کم از کم مجھے تو اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔

چچی جان نے مجھے ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جہانو ہے!"

"میں جانتا ہوں......" پیر دولہا میاں کے ان الفاظ نے مجھے چونکا دیا لیکن چچی جان کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں پیدا ہوئی۔ البتہ میں نے ہی جرأت سے سوال کیا۔

"آپ جانتے ہیں مجھے؟......" میرے ان الفاظ پر پیر دولہا میاں نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"تیرا کیا خیال ہے...... کیا میں نہیں جانتا؟"

"نہیں میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ پہلے میری آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"کس وقت کی بات کرتا ہے...... کیا اس وقت کی جب تو نے وہ کوٹھی چھوڑی تھی۔"

"جی......"

"یا پھر اس وقت کی جب تیری نقلی ماں باورچی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔" اس نے کہا اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے خوف بھری نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ تو پیر دولہا میاں پھر بولا۔

"اور اب تُو یہ سوچ رہا ہے کہ کہیں میں تیری بستی کا کوئی آدمی نہ ہوں؟"

میرے ہوش و حواس جواب دے گئے تھے۔ یہ شخص جو کچھ بتا رہا تھا وہ ایک کھلی کتاب کی مانند تھا اور اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس کے سامنے عقیدت گزار نہ ہو جاؤں جبکہ چچی جان مسکرا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

"کہو جہانو کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہو......"

"نن...... نہیں" میں نے جواب دیا۔

"کیا چاہتی ہے اس کے لیے؟"

"میں چاہتی ہوں کہ یہ کچھ بن جائے......"

"خدمت کرنا ہو گی اسے ہماری......"

"کرے گا......"

"نہیں کر سکے گا......"

"نہیں پیر صاحب اگر آپ چاہیں تو ضرور کر سکے گا۔"

"تو اگر اس کی سفارش کرتی ہے تو میں کچھ سوچنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن یہ بھی جان لے کہ اسے جو کچھ کرنا ہو گا وہ رازداری میں رہے گا۔ اس لڑکے کو کل پھر میرے پاس بھیج دینا۔"

"کس وقت پیر صاحب؟"

"کل دوپہر کو ایک بجے......" پیر دولہا میاں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔"

"تو پھر اب بھاگ جا تیرا یہاں رکنا اب بے مقصد ہو گیا ہے۔" پیر دولہا میاں نے کہا اور چچی جان مجھے وہاں سے اٹھا کر لے چلیں۔

میں حیرت سے اب بھی گنگ تھا' جو باتیں پیر دولہا میاں نے بتائی تھیں وہ تو چچی جان کو بھی نہیں معلوم تھیں' تاہم راستے میں میں نے ان سے کہا۔

"چچی جان...... یہ سب کیا ہے؟ اس شخص کو میرے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا؟"

"میں نے تم سے کہا تھا نا جہانو کہ وہ بہت پہنچی ہوئی شخصیت کا مالک ہے۔"

"لیکن اتنی ساری باتیں میرے بارے میں جاننا کیسے ممکن ہو سکا؟"

"تم کیا سمجھتے ہو اس قسم کے لوگ حالات سے واقف نہیں ہوتے!"

"نہیں اب تو میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔"

"پیر دولہا میاں تمہیں جو کچھ بتائے یا تم سے جو کچھ چاہے جہانو ہو سکتا ہے وہ سخت ہو' لیکن تمہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا۔"

"چچی جان میں نہیں سمجھتا کہ میں وہ کر پاؤں گا یا نہیں۔"

"یہ بات وہ خود تمہیں بتا دے گا......" چچی جان نے کہا۔

بہرحال دوسرے دن میں مقررہ وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اب میرے دل میں بھی لگن پیدا ہو گئی تھی ایک ایسا شخص واقعی قابلِ حیرت ہوتا ہے جو کسی کو کسی کے ماضی کے بارے میں وہ باتیں بھی بتا دے جو باتیں خود اس کے اپنے ذہن سے نکل چکی ہوں۔

اس وقت پیر دولہا میاں کے پاس کوئی موجود نہیں

تھا' میں اس کے پاس پہنچا اور میں نے اسے سلام کیا لیکن اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس بات پر مجھے حیرت ہوئی' تاہم اس شخص نے جس طرح مجھ پر اپنا اثر قائم کر رکھا تھا اس کے تحت مجھے اس بات کو نظر انداز کرنا پڑا۔ پیر دولہا میاں نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ نجانے کیوں مجھے اس وقت اس کے چہرے کے خدوخال بدلے بدلے نظر آئے۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ پھر تقریباً پانچ منٹ وہ آنکھیں بند کئے خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن بہرطور میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی تھی۔ پھر کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں میری جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"زندگی کے یہ راستے بہت کٹھن ہوتے ہیں لڑکے! کیا تم اپنی زندگی کو ایک بہتر شکل دینے کے لیے ان کٹھن راستوں سے گزر سکو گے؟"

"میں کوشش کروں گا۔"

"اور اس وقت جب تم اس کام کو سرانجام دے لو گے تو تمہیں بہت سی ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے شاید تم اُکتا جاؤ۔"

"میں کوشش کروں گا کہ نہ اُکتاؤں۔"

"ہوں...... تو اب ایسا کرو کہ ایک پتا ذہن میں رکھ لو' کل تمہیں اس جگہ جانا ہے' وہاں تمہیں جو کوئی بھی ملے گا اور تم سے جو کچھ کہے گا تمہیں اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔"

"آپ مجھے پتہ بتا دیجئے......" میں نے کہا۔

"اور سنو! تم جس عورت کے ساتھ آئے تھے وہ اچھی ہے' میری تابعدار ہے لیکن اب میرا اور تمہارا براہِ راست واسطہ ہے۔ یہاں جو کچھ ہو یا تمہیں جو کچھ کرنا پڑے اس کا کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت لگتا ہے ہر کام میں اور تمہیں بھی اس کام میں وقت لگے گا۔"

"میں جانتا ہوں......"

"بس تو پھر ٹھیک ہے...... میں تمہیں پتا بتائے دے رہا ہوں۔" اس نے مجھے جو پتا بتایا وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور بالآخر اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا پھر دوسرے دن منصوبے کے مطابق میں چل پڑا' اس علاقے میں مَیں شاید پہلی بار آیا تھا۔ شہر سے دُور دراز کا علاقہ تھا' کچھ تھوڑی سی الگ ہٹ کر آبادی تھی جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر مکانات ٹوٹے پھوٹے تھے۔ کوئی ایک آدھ ہی مکان ثابت یا دو منزلہ نظر آ جاتا تھا۔ گلیاں گندی تھیں اور یہاں کتوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ بہرحال جس گھر کا پتہ مجھے بتایا گیا تھا وہ اس آبادی کے آخری سرے پر تھا۔ میں بالآخر تیز قدموں سے چلتا ہوا اس مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ نجانے اندر سے کیسی آواز ابھر رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں واپس لوٹ جاؤں اور اس خیال کو دل سے نکال دوں لیکن نجانے کون سے جذبے کے تحت میرے قدم رک گئے۔ دیکھنا تو چاہیے کہ پیر دولہا میاں کے کہے ہوئے اس مکان میں کیا چیز ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی جو دروازے کے قریب آ رہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ پھر دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد اس کے دونوں پٹ کھل گئے۔ میرے سامنے دبلے پتلے بدن کا ایک بھدی سی شکل کا بوڑھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر پیلے رنگ کا چونہ تھا جو گردن سے لے کر ٹخنوں تک تھا۔ وہ کچھ عجیب سی شکل کا مالک تھا' گول گول آنکھیں' ناک طوطے کی

چونچ کی طرح مڑی ہوئی اور ہونٹ بھی عجیب سے بدنما' ایک ہونٹ نیچے لٹکا ہوا تھا جس سے اس کے نچلے دانت نظر آ رہے تھے۔ نجانے کیوں میرے دل پر دہشت کا ایک اثر قائم ہو گیا۔ بہرحال وہ آہستہ سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں پیر دولہا میاں نے بھیجا ہے۔ کیا میرا خیال غلط ہے؟"

"نہیں۔" میں نے گردن ہلائی۔

"آؤ...... اندر آ جاؤ۔" اس نے کہا اور میرے دروازے کے دوسری طرف جانے کے بعد دروازے کی کنڈی واپس لگا دی۔ پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ مکان باہر سے بالکل بوسیدہ اور بدشکل نظر آتا تھا۔ اندر سے ایسا نہیں بلکہ خاصا وسیع تھا۔ بوڑھا مجھے اندرونی کمرے میں لے گیا اور پھر اس کے آخری سرے پر بنی ہوئی چھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک تہ خانے میں پہنچ گئے' تہ خانہ بہت عجیب سا تھا۔ چھتوں سے جالے لٹک رہے تھے' پرانا فرنیچر پڑا ہوا تھا جن میں سے بعض کرسیاں ایسی تھیں جن کے نیچے اینٹیں لگا کر ان کے پایوں کی کمی پوری کی گئی تھی۔ وہ مجھے کرسی کی طرف اشارہ کر کے سامنے بیٹھ گیا۔ یہاں اچھی خاصی تاریکی پھیلی ہوئی تھی' جبکہ باہر کا ماحول روشن تھا لیکن تہ خانہ ہونے کی وجہ سے اس میں تاریکی تھی کوئی ایسا روشن دان وغیرہ بھی نہیں تھا جس سے روشنی اندر آئے۔ میں اس وقت بوڑھے کے خدوخال بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور اس نے ایک طرف رکھے ہوئے مٹی کے تیل کے لیمپ کو جلا دیا جس سے کمرے میں زرد روشنی پھیل گئی۔ اس زرد روشنی میں مجھے اس کا چہرہ بے حد بھیانک نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ کچھ وقت قیام کرنا ہوگا......"

"کتنے وقت؟" میں نے سوال کیا۔

اس کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا' بس یوں سمجھ لو جب تک مجھے تمہاری ضرورت پیش آئے...... اور اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"کس نے؟"

"جس کے پاس سے تم یہاں آئے ہو......"

میں خاموش ہو گیا کچھ لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

"تو پھر مجھے میرے قیام کے لیے جگہ بتا دو......"

"یہ جگہ سب سے بہتر ہے' ویسے سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد تم باہر بھی آ سکتے ہو۔ یہاں تم پر کوئی پابندی ہے نہ قید' سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں......" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور اس کے بعد کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"تو اب تم اس جگہ کے مکین ہو......" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر نکل گیا' ایک عجیب سا احساس میرے دل میں جاگزیں تھا اور اندر کشمکش ہو رہی تھی' جو کچھ میں کر رہا ہوں یا چچی جان نے جو کچھ کرنے کے لیے کہا ہے' کیا موزوں رہے گا' کیا یہ انوکھی زندگی مجھے راس آ سکتی ہے' کیا یہ سب کچھ جو میرے اپنے ذہن میں بالکل نہیں تھا ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ تمام تصورات اور خیالات میرے دل و دماغ کو الجھا رہے تھے' لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا' میں نے وہ سب کچھ تسلیم کر لیا تھا جو اس نے کہا تھا' چنانچہ اب کوئی انحراف ممکن نہیں تھا اور وہ بھی ان پراسرار لوگوں سے' جن کی حقیقت سے میں واقف تھا۔ چنانچہ اب حالات کچھ بھی ہوں' مجھے وہی کرنا تھا جو میری تقدیر کا ایک حصہ بن چکا تھا' اس ویران اور بوسیدہ قید خانے میں زندگی بڑی عجیب و غریب تھی' اپنی

اس رہائش گاہ کو میں نے بغور دیکھا تو میرے دل میں خوف کا ایک احساس جاگ اٹھا۔

کتنی بھیانک جگہ ہے' ہر شے سے نحوست ٹپکتی ہے' پیر دولہا میاں نے نہ جانے مجھے اس شخص کے پاس کیوں بھیج دیا ہے' ویسے اب میں ناسمجھ نہیں رہا تھا۔ اتنی عمر ہوگئی تھی کہ نیک و بد کی تمیز کرسکوں۔ پیر دولہا میاں مسلمان تھا اور یہ شخص جس نے مجھے نہ تو اپنا نام بتایا تھا اور نہ ہی اپنے بارے میں کچھ اور۔ ہندو معلوم ہوتا تھا۔ کم از کم اس کی زبان اور حلیے سے مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ جانے پیر دولہا میاں کا اس سے کیسا گٹھ جوڑ ہے لیکن اب یہ تمام باتیں فضول تھیں۔ بعض اوقات میں سوچنے لگتا کہ چچی جان نے مجھے واقعی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا گھرانا ہی منحوسوں کا گھرانا تھا۔

جمیل بیگ اچھی خاصی ملازمت کرتا تھا۔ ایمانداری سے کام کرتا تو تین افراد کا گھرانہ تھا' اسے زندگی گزارنے میں کیا دقت پیش آتی' لیکن وہ سونا بنانے کے چکر میں اپنی زندگی کھو بیٹھا تھا۔ جمال بیگ آوارہ شخص تھا اور نجانے کہاں کہاں گھومتا پھرتا تھا اور وہ محترمہ چچی جان بھی چکروں میں پڑی ہوئی تھیں۔ آخر وہ اس عمر میں اپنے لیے کیا حاصل کرنا چاہتی تھیں اور پھر وہ پیر دولہا میاں' مجھے سارے کا سارا ایک جال سا محسوس ہو رہا تھا جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ساری کڑیاں ایک زنجیر کی کڑیاں ہی معلوم ہوتی تھیں..... لیکن میں بھی اب تن بہ تقدیر ہوگیا تھا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

میں اس قید خانے میں رہنے لگا۔ ہاں میں اسے قید خانہ ہی کہہ سکتا ہوں حالانکہ مجھے بوڑھا کہہ کر گیا تھا کہ میرے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن کچھ ایسی بیزاری مجھ پر سوار تھی کہ میں خود بھی یہاں سے نکل کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا کیا فائدہ..... کون ہے میرا' کہاں جاؤں۔ کیا واپس چچی جان کے پاس جاؤں' تو یہ بھی حماقت کی بات ہے' کیونکہ وہ خود ہی مجھے ان لوگوں کے سپرد کرگئی تھیں۔

چار دن چار راتیں اسی تنہائی میں گزار چکا تھا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ بوڑھا آتا تھا اور مجھے کھانے پینے کی چیزیں دے جاتا تھا۔ ترکاری' پوریاں اور ایسی ہی چیزیں ہوا کرتی تھیں جو بہرحال پیٹ بھر دیا کرتی تھیں۔ پانچویں دن دوپہر کے وقت جب میرے اندازے کے مطابق دن کا ڈیڑھ بجا ہوگا' بوڑھا میرے پاس آیا اور مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بے حد عجیب تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''نام کیا ہے رے تیرا.....؟''

''جہانو.....''

''ناموں کی پروا کرتا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں.....''

''نام کوئی اہمیت رکھتے ہیں.....؟''

''میں نہیں جانتا.....''

''نام ایک دوسرے کو پکارنے کے لیے ہوا کرتے ہیں' ایک دوسرے کی شناخت ہوتے ہیں.....''

''ہوں..... ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں تیرا نام رامو رکھ دوں تو.....!''

''نہیں یہ ہندوانہ نام ہے.....''

''کیا ہندو..... کیا مسلمان..... یہ سب بے کار کی باتیں ہیں جہانو۔'' وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا' میں اسے دیکھنے لگا۔

''کیا کہتا ہے تو.....؟''

''کس سلسلے میں.....؟''

''میں نے جو کہا ہے.....''

''نہیں یہ بات نہیں ہے..... بہرحال انسان کی شناخت تو ہوتی ہے۔''

''ہوں..... اچھا تو یہ بتا تیرے پتا کا کیا نام تھا؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''مسلمان تھا؟''

''ظاہر ہے۔''

''کیا وہ اپنے دھرم کی ساری باتیں پوری کرتا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ منش سب سے پہلے اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے پھر اپنے دین دھرم کے بارے میں' جہانو کا نام اگر رامو ہو جائے تو کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے مگر چھوڑو..... میں کون سا دھرم سیوک ہوں کہ تجھے دھرم داس بناؤں جو تیری مرضی آئے اپنا نام رکھ۔ ویسے میرا نام سیوک رام ہے۔''

''جی.....'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا کہے گا تو مجھے.....''

''سیوک رام!''

''بس؟''

''اور کیا کہوں.....؟''

''گرو سیوک رام..... گرو جانتا ہے کسے کہتے ہیں.....؟''

''ہاں!''

''کسے کہتے ہیں؟''

''استاد کو.....''

''ہاں وہ جو کچھ سکھاتا ہے۔''

''بے شک۔''

''تو پیر دولہا میاں نے تجھے میرے پاس جو بھیجا ہے وہ اسی لیے بھیجا ہے کہ میں تجھے کچھ سکھاؤں.....''

''پیر دولہا میاں نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا.....''

''تو پھر تُو پیر دولہا میاں کے پاس کیوں گیا تھا.....؟''

''اس سے کچھ سیکھنے۔''

''ٹھیک..... ٹھیک..... کیا تجھے اس بات کا علم ہے کہ وہ جو تیرا پیر دولہا میاں ہے نا اس کا بھی کوئی دھرم نہیں ہے۔''

''کیا مطلب.....؟''

''پھر وہی بات..... میں کہہ رہا ہوں نا کہ اس کا بھی کوئی دھرم نہیں ہے۔''

''لیکن وہ تو مسلمان ہے' لوگ اس کے پاس بڑی عقیدت سے آتے ہیں۔'' میں نے کہا اور بوڑھا پھر ہنسنے لگا۔

''ہاں اس لیے آتے ہیں کہ وہ دوسروں کے کام کر دیتا ہے مگر دھرم کے ذریعے نہیں۔''

''تو پھر.....؟''

''وہ بھی میرا چیلا ہے!''

''تمہارا.....؟''

''ہاں!''

''گویا اس نے.....''

''ہاں..... اس نے جو کچھ سیکھا ہے مجھ سے ہی سیکھا ہے' مگر چونکہ اس نے اپنا نام پیر دولہا میاں رکھا ہوا ہے اس لیے وہ اس نام سے کام کرتا ہے' میں سیوک رام ہوں' سو سیوک رام نام سے کام کرتا ہوں۔ تجھے رامو بنا دوں تو' تو رامو کہلائے گا۔ جہانو بننا چاہتا ہے تو جہانو بن کر رہ۔ کام جو کرنا ہے اس کا معاملہ الگ ہی ہوتا ہے.....''

میں اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''خیر یہ ساری باتیں تو ایک طرح سے بے کار

ہیں۔ یہ بتا من سے اپنا گرو مانتا ہے مجھے......؟"

"اب تو ماننا ہی پڑے گا!"

"کیا مطلب......؟ مجبوری ہے کوئی؟"

"نہیں......"

"تو پھر......؟"

"میں آیا ہی اس لیے ہوں۔"

"دیکھ لڑکے میں کبھی کسی کو اپنا چیلا نہیں بناتا۔ ورنہ اگر میں چیلا بنانے پر تل جاؤں تو یہاں اتنا مجمع جمع ہو جائے کہ دوسرے آدمی کے بیٹھنے کی جگہ نہ رہے۔ کیا سمجھتا ہے تو سیوک رام کو۔"

"نہیں گرو جی...... آپ یقیناً مہان ہوں گے۔" میرے ان الفاظ پر اسے جیسے خوشی ہوئی۔ اس نے کہا۔

"مگر میں نے تیرے اندر بھی کچھ دیکھا ہے۔ یہ دیکھا ہے میں نے تیرے اندر کہ اگر میں تجھے کچھ سکھاؤں تو تُو سیکھ جائے گا۔"

"یہ تو آپ نے بہت اچھی بات بتائی ہے مجھے۔"

"مگر ایک بات اور سیکھ لے جسے من سے گرو مان لیا جاتا ہے اس کی کسی بات میں دخل نہیں دیا جاتا اور اس کی ہر بات کی آنکھیں بند کر کے تعمیل کرنا ہوتی ہے۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں۔ ظاہر ہے آپ مجھے اپنا علم سکھائیں گے تو مجھے آپ کی عزت کرنا ہوگی۔"

"جو کچھ میں کہوں گا کرے گا......؟"

"ضرور کروں گا۔"

"وچن دے۔"

"جی وعدہ کرتا ہوں۔"

"نہیں مجھے وچن دے۔" بوڑھے نے اپنا ہاتھ سامنے پھیلا دیا۔

"میں کیا کروں......؟" میں نے سوال کیا۔

"اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دے۔" اس نے کہا اور میں نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نجانے کیوں مجھے اپنے بدن میں ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ویسے بھی بوڑھے کا ہاتھ کوئی انسانی ہاتھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پتھر کی طرح سخت اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے گردن ہلا کر مطمئن انداز میں کہا۔

"بہت بڑا دل ہے تیرا، بہادر ہے دلیر ہے۔ اچھا خیر اب سن میری بات۔"

"جی گرو مہاراج......!"

"میں تجھے ایک جاپ بتا رہا ہوں، تجھے سات دن یہ جاپ کرنا ہوگا اس سے جانتا ہے کیا ہوگا......؟"

"میں نہیں جانتا......"

"من صاف ہوگا تیرا۔ تیرے من سے یہ ساری فضول باتیں نکل جائیں گی کہ دین کیا ہے دھرم کیا ہے انسانیت کیا ہے شرافت کیا ہے۔ جب تو اندر سے صاف ستھرا ہو جائے گا تب میں تجھے دوسرا جاپ بتاؤں گا اور تو ایک بات سن لے اگر یہ دوسرا جاپ تو نے مکمل کر لیا تو پھر تو اتنی بڑی قوت کا مالک بن جائے گا کہ بعد میں ہماری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

"مہاراج...... میں ایسا انسان نہیں ہوں۔"

"تجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا...... ہمارے حکم کے مطابق کرنا ہوگا۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔"

"یہ نہیں سوچے گا کہ ایسا کرنے سے تجھے فائدہ ہو رہا ہے یا نقصان۔ یہ بہت بڑا کام ہوتا ہے یہ بہت بڑی تپسیا ہوتی ہے جو تجھے کرنی ہے۔"

"آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں......" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر سن......" بوڑھے نے کہا اور اس کے بعد

اس نے مجھے کسی عجیب و غریب زبان کے کچھ لفظ بتائے اور بار بار انہیں دہرانے لگا۔ میں یہ الفاظ سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اب ایسا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جا۔" میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دوزانو بیٹھ کر اسے دیکھا تو وہ بولا۔

"جو الفاظ میں نے کہے ہیں انہیں دُہرا......"

وہ ایک ایک لفظ مجھے بتانے لگا اور جب میں نے پہلی بار یہ الفاظ اپنے منہ سے نکالے تو مجھے اپنے اندر ایک گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی، میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کوئی اندر سے مجھے کہہ رہا ہو کہ یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہ کروں، لیکن میں نے اس آواز پر کان نہ دھرے اور ایک ایک لفظ دہرا کر پوری لائن دہرا دی۔ بوڑھے نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

"میرے ساتھ تین دفعہ یہ الفاظ دُہرا۔" اور میں بوڑھے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ دہرانے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے اندر سکون پھیل گیا۔ اب وہ کیفیت نہیں رہی تھی، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے لیکن جب تین دفعہ میں نے ان الفاظ کو دہرایا تو سیوک رام نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب سات دن تجھے اس کا جاپ کرنا ہے، لیکن یہاں نہیں۔"

"پھر کہاں......؟"

"اس عمارت کے پیچھے ایک چھوٹی سی پھوکر ہے، اس تالاب کے کنارے بیٹھ کر تجھے یہ جاپ کرنا ہے اور شام کو جب سورج چھپ جائے اس وقت سے لے کر جب تک چاند نہ نکلے اس وقت تک تجھے یہ جاپ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد واپس آ جانا اور آرام سے سو جانا بہت مشکل کام نہیں ہے پر ایک بات تجھے بتائے دیتا ہوں۔"

"کیا گرو مہاراج......؟"

"ہمت سے کام لینا ہوگا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"تجھے بہت سی چیزیں ڈرائیں گی، اگر ڈر گیا تو سمجھ لے مر گیا۔"

"مطلب؟"

"مطلب صاف ہے...... پھر وہی مطلب مطلب میرے سامنے کرتا ہے۔ مجھے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔ ایک بات جو زبان سے ادا کی جائے اس کو سننا ہے سمجھنا ہے اور اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرنا۔"

"جی گرو مہاراج......"

"اب آ میرے ساتھ، میں تجھے وہ جگہ دکھا دوں جہاں تجھے جاپ کرنا ہے۔"

میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی اور اٹھ کر بوڑھے کے ساتھ باہر نکل آیا۔

☆☆☆

یہ جگہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ احساس تو مجھے ہمیشہ سے رہتا تھا کہ یہ بے رونق علاقہ ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آسمانی نحوستوں نے یہاں بسیرا کر رکھا ہے۔

ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے کنارے لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کئی درخت تالاب کے آس پاس موجود تھے، عام حالات میں یہ ایک خوشنما علاقہ ہونا چاہیے تھا لیکن نجانے کیوں اس پر نحوست نازل تھی اور دُور دُور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ایک عجیب ویران سا میدان پھیلا ہوا تھا اور اس میدان میں یہ تالاب بھی مصنوعی سا ہی محسوس ہوتا تھا لیکن ایک

بات اور بھی میں نے محسوس کی تھی کہ تالاب کے پانی سے ہلکی ہلکی ناگوار بدبو اٹھ رہی تھی جیسے پانی سڑا ہوا ہو۔ حالانکہ اس پر کائی تھی اور نا ہی وہ دور سے یا قریب سے گندا نظر آتا تھا۔ شاید ایک قدرتی گندگی ہی اس میں موجود تھی۔ درخت بھی اچھے خاصے پھیلے ہوئے تھے لیکن کچھ عجیب سے رنگ کے۔ ان میں وہ سبز رنگ تھا ہی نہیں جو درختوں کا رنگ ہوتا ہے۔ بس یہ میرے محسوسات تھے جنہیں میں نے محسوس کیا۔ بوڑھے نے مجھے ایک جگہ بتائی اور کہا۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر تجھے جاپ کرنا ہے۔“

یہ جگہ ایک درخت کے تنے کے پاس تھی اور درخت کا پورا سایہ اس جگہ پھیلا ہوا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

”جب تُو جاپ کر رہا ہو تو‘ تیرے من میں کوئی اور خیال نہیں ہونا چاہیے اور سن بات کچھ بھی ہو جائے جاپ کے دوران اس درخت کے سائے سے نکلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ نقصان اٹھائے گا۔“

”جی گرو مہاراج۔“

”اس کے علاوہ ایک بات تجھے اور بھی بتا دوں۔ وہ یہ کہ یہاں جو کچھ بھی ہو‘ تجھے اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے‘ چاہے کیسے ہی تیرا من تڑپے‘ مگر تجھے اپنی جگہ سے ہلنا نہیں جب تک کہ جاپ پورا نہ کر لو۔ سمجھ رہا ہے نا......؟“

”مجھے یہ الفاظ کتنی دفعہ دہرانے ہوں گے؟“

”دو سو اکہتر دفعہ۔“

”یہ تو اہم بات تھی جو میں نے آپ سے پوچھی ہی نہیں گرو مہاراج۔“

”نہ پوچھتا تو میں تجھے خود بتاتا۔“

”دو سو اکہتر دفعہ دہرانے کے بعد مجھے یہاں سے اٹھ جانا ہوگا۔“

”ہاں جب تو اپنا یہ جاپ پورا کر لے تو آرام سے اٹھ جا پھر تیری مرضی ہے مگر سن اس کے بعد بھی یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس میں دخل مت دینا۔ ایک بار پھر کہتا ہوں کہ تیرا من تڑپے گا‘ تُو چاہے گا کہ کوئی کام کرے لیکن یہاں کچھ مت کرنا‘ یہ سمجھ لینا اچھی طرح اور گرد جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں گرو مہاراج۔“

”تو پھر اب میں چلتا ہوں۔“

”آج ہی سے یہ جاپ شروع کر دوں؟“

”ہاں بس آج ہی سے۔“

”ٹھیک ہے...... جیسا آپ کا حکم۔“

”بس تو یہاں بیٹھ جا اور اپنا کام کر۔“

”لیکن ابھی تو وقت ہے گرو مہاراج۔“

”ایں...... ہاں وقت تو ہے۔ یہ بات میں بھول گیا تھا۔ چل ٹھیک ہے تھوڑی دیر کے بعد آ جانا۔ لیکن اب تو یہاں گھوم پھر میں تیرا ساتھ نہیں دوں گا۔“ بوڑھے نے کہا اور وہ اپنی رہائش گاہ کی جانب چلا گیا۔ میں نے اس کا تعاقب نہیں کیا تھا بلکہ میری نگاہیں دُور دُور تک بھٹکنے لگی تھیں۔ تاحدِ نظر انسان کا پتا نہیں تھا ویسے بھی اس ویرانے میں کسی کا آنا بے مقصد ہی ہو سکتا تھا۔

بہت دیر تک میں وہاں گھومتا رہا اور اس کے بعد واپس اپنے اس تہہ خانے میں پہنچ گیا‘ یہاں آنے کے بعد پہلی بار باہر نکلا تھا‘ بدن کو ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔ بہرطور اب جو کچھ شروع کر دیا تھا اس سے دُور ہٹنا تو مناسب نہیں تھا۔

پھر مقررہ وقت پر میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے جاپ کرنا تھا۔ جو کچھ سیوک رام نے مجھے بتایا تھا وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب سورج چھپا تو میں اس درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ دو سو اکہتر دفعہ وہ الفاظ

پڑھنا تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کروں تو زیادہ سے زیادہ ایک یا ڈیڑھ گھنٹے میں یہ کام کر لوں گا لیکن سیوک رام نے یہ بھی کہا تھا کہ جب تک چاند نہ نکلے میں یہاں سے نہ اٹھوں اس لیے جو کچھ بھی کرنا تھا آہستہ آہستہ اس وقفے کے دوران کرنا تھا لیکن یہ وقفہ بھی خاصا طویل تھا۔

پھر جب چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تو میں نے اس جاپ کو پہلی دفعہ دہرایا میں آنکھیں کھولے بیٹھا ہوا تھا اور وہ الفاظ آہستہ آہستہ میرے منہ سے نکل رہے تھے جن کا مجھے مفہوم نہیں معلوم تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک بار پھر میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی سی پیدا ہو گئی ہے میرا دل سینے میں پھڑ پھڑا رہا ہے لیکن میں نے اپنی ہر کیفیت کو نظرانداز کر دیا۔ سات مرتبہ یہ جاپ پڑھنے کے بعد ایک بار پھر میں مطمئن ہو گیا تھا اور اس کے بعد زیادہ اہتمام سے میں نے اس کا آغاز کر دیا۔ میری نگاہیں اب بھی چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ ہر چند کہ اندھیرا پھیل گیا تھا لیکن بہرحال میری آنکھیں تاریکی میں بھی دیکھ سکتی تھیں۔

سامنے والے درخت پر چڑیا کا ایک گھونسلا نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی خوبصورت چڑیا تھی اور اپنے گھونسلے میں بیٹھی تھی۔ میں ان پرندوں کے بارے میں سوچنے لگا کیا آزاد زندگی گزارتے ہیں‘ فضاؤں میں بسیرا کرتے ہیں۔ جب دل چاہا اپنی جگہ سے پرواز کی اور جہاں دل چاہا پہنچ گئے لیکن انسانی زندگی پر کتنے بوجھ ہیں۔ اسے اپنی کوششوں‘ اپنی کاوشوں سے گھر بنانے پڑتے ہیں اور اس کے بعد نجانے زندگی کے کیسے کیسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بڑا فرق ہے ان پرندوں اور انسانوں کی زندگی میں۔ تب ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا۔

پرندوں کی زندگی تو بہت ہی مختصر ہوتی ہے‘ تیز ہوا چلتی ہے تو ان کے گھونسلے اڑ جاتے ہیں اور وہ درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر چھوٹے پرندے کو بڑا پرندہ شکار کر لیتا ہے۔

انہی خیالات میں وقت گزر رہا تھا اور زبان سے جاپ کے الفاظ نکل رہے تھے۔ پھر پہلے دن کا جاپ پورا کر کے جب چاند نے آسمان پر سر ابھارا تو میں وہاں سے اٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔ میں رہائش گاہ کی سیڑھیاں طے کر ہی رہا تھا کہ اچانک ہی کہیں سے ایک نسوانی چیخ میرے کانوں میں ابھری۔ کوئی عورت دلدوز انداز میں چیخ رہی تھی۔

میرے دل میں ایک دم تجسس بیدار ہو گیا‘ لیکن پھر گرو سیوک رام کے الفاظ کا خیال آیا کہ یہاں جو کچھ بھی ہو اس کی طرف سے آنکھیں اور کان بند ہی رکھنا ہیں۔ ایک بار پھر دل نے اندر سے بغاوت کی کہ کم از کم دیکھوں تو سہی کہ کون مصیبت میں ہے لیکن دو ہی باتیں تھیں یا تو اپنے دل کی بات مان لیتا یا سیوک رام کی بات مان لیتا...... چنانچہ میں نے خاموشی سے اپنی رہائش گاہ کی جانب رخ کیا اور تہہ خانے میں پہنچ گیا...... لیکن یہ احساس میرے دل میں بہت دیر تک تڑپتا رہا کہ چیخنے والی عورت کون تھی اور اس پر کیا بیت رہی تھی۔

لیکن دوسرے دن جب سورج نکل آیا اور میں اپنے معمولات سے فارغ ہو گیا تو میں سیوک رام کو تلاش کرنے لگا‘ اس نے ویسے بھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی اور کہہ دیا تھا کہ میں جہاں چاہوں گھوم پھر سکتا ہوں‘ حالانکہ اس دوران میں نے اپنی اس رہائش گاہ میں ہی وقت گزارا تھا اور جان بوجھ کر باہر نہیں نکلا تھا۔ بس اپنے سحر میں گرفتار تھا اور اسی کشمکش کا شکار کہ جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ مناسب ہے بھی یا نہیں‘

لیکن اب جب میں نے ایک دن کا جاپ کر لیا تھا تو پھر یہ میرا آخری فیصلہ ہو گیا تھا کہ اب مناسب اور نامناسب کا تصور ذہن سے نکال دیا جائے اور صرف وہ کیا جائے جو میں شروع کر چکا ہوں۔

سیوک رام مجھے ایک ایسی جگہ ملا جو ایک کھلا ہوا علاقہ تھا اور میں نے یہاں ایک اور منظر دیکھا اس وقت یہاں آٹھ نو افراد موجود تھے اور بڑے ادب سے بیٹھے ہوئے تھے سیوک رام ایک چوکی پر بیٹھا انہیں کچھ بتا اور سمجھا رہا تھا۔ میں نے اسے مصروف دیکھ کر باہر قدم نہیں نکالے اور پیچھے ہی رہ گیا۔ وہ لوگ بڑی عقیدت سے سیوک رام کی باتیں سن رہے تھے۔ پھر خاصی دیر تک میں سیوک رام کا جائزہ لیتا رہا اور اس کے عقیدت مندوں کو بھی دیکھتا رہا۔ ایک ایک کر کے وہ لوگ اٹھنا شروع ہو گئے اور پھر انہوں نے اپنی جیب سے چیزیں نکال کر رکھنا شروع کر دیں، یہ نوٹ تھے کھانے پینے کی اشیاء تھیں اور ایسی ہی دوسری چیزیں جو وہ سیوک رام کی نذر کرنا چاہتے تھے۔ سیوک رام نے الٹا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اسے سیدھا کر کے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دی۔ تب وہ لوگ باہر نکل گئے اور سیوک رام اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر اسی وقت جب میں عقب سے نکل کر سیوک رام کے سامنے پہنچا تو سیوک رام نے چونک کر مجھے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"تو پہلے دن کا جاپ کر چکا ہے تو!" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"ہاں گرو مہاراج......"

"اچھا چل یہ چیزیں اٹھا، پھل وغیرہ الگ کر لے، نوٹ سمیٹ لے انہیں ایک جگہ کر کے میرے حوالے کر دے۔ اصل میں میں نے تجھے بتا دیا تھا کہ میں نے کوئی چیلا نہیں بنایا، بہت سے لوگوں نے یہ کوشش کی لیکن تو جانتا ہے کہ ایرے غیرے کو کوئی علم نہیں دیا جاتا۔ یہ تو تیری خوش قسمتی ہے کہ تو نے مجھ سے وہ حاصل کر لیا جو اچھے اچھے نہ حاصل کر سکے۔ یہ چیزیں اٹھا لے۔"

میں نے سیوک رام کی ہدایت پر عمل کیا، پھل وغیرہ سمیٹ کر ایک جگہ کر دیئے۔ سیوک رام بولا۔

"لے اب اس میں سے جو کچھ بھی تیری پسند ہو اٹھا لے لیکن اپنی رہائش گاہ میں جا کر ہی ان کو کھانا پینا آج سے یہ بھی کیا کر تو، یہ لوگ روزانہ نہیں آتے، تین دن کے بعد آتے ہیں۔ چنانچہ آج سے تیسرے دن تو پھر اسی وقت یہاں آ جانا تاکہ یہ تمام چیزیں سمیٹ لے۔"

"جی گرو مہاراج......" میں نے جواب دیا پھر میں نے کہا۔

"آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں گرو مہاراج۔"

"ہاں پوچھو!"

"رات کو جب میں جاپ کر کے واپس لوٹا تھا تو مجھے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں سنائی دی تھیں......" سیوک رام نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولا۔

"ہاں......تو پھر؟"

"میرا مطلب ہے کون تھی وہ جبکہ یہاں تو دور دور تک آبادی نہیں ہے؟" سیوک رام چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"کچھ سمے گزار لے اس کے بعد تجھے یہ سب کچھ بھی معلوم ہو جائے گا تجھے ہمارے ہر کام میں شریک ہونا ہو گا۔ تو اس کی بالکل چنتا نہ کر۔"

"وہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں تھی؟"

"دیکھ ابھی بہت کم وقت گزرا ہے تجھے یہاں کوئی ایسی ویسی بات ہو چکی تو ابھی اس پر دھیان مت دے

اور اگر ایسی چیخیں تجھے دوبارہ بھی سنائی دیں تو اس کی فکر نہ کرنا۔"

"جی گرو مہاراج......" میں نے جواب دیا۔ لیکن میرے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ سیوک رام نے حتمی طور پر یہ بات کہہ دی تھی کہ میں ایسی باتوں پر نظر نہ رکھا کروں، مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا تھا کیونکہ بہرطور اس سے کچھ سیکھ رہا تھا لیکن اندر کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ کبھی کبھی انسان کے بس سے باہر ہو جاتی ہے نہ جانے وہ کیسی چیخیں تھیں......

بہرحال جو پھل وہاں سے اٹھا کر لایا تھا انہیں کھایا اور اس کے بعد آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا، پھر دوسری رات میں نے جاپ شروع کیا پھر تیسری رات بھی ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سامنے والے درخت پر جو حسین چڑیاں تھیں اور جنہیں میں نے اب دن میں بھی آ کر دیکھا تھا وہ بے حد خوبصورت تھیں۔ اس وقت جب میں جاپ کر رہا تھا میں نے دیکھا کہ درخت کی اوپری شاخ سے ایک سانپ نیچے اتر رہا ہے، میں جاپ کر رہا تھا لیکن کالے ناگ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل کو خوف کا ایک احساس سا ہوا اگر یہ اتر کر میرے پاس آیا مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے دل میں سوچا اور اس کے بعد اس احساس کے ساتھ خاموش ہو گیا کہ گرو سیوک رام نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہو تو اپنی جگہ نہ چھوڑنا، ہو سکتا ہے یہ سانپ مجھ تک نہ پہنچے لیکن میری نگاہیں سانپ پر جمی رہیں۔ سانپ آہستہ آہستہ نیچے اترا اور اٹھ کر تھوڑی دیر بعد اس گھونسلے کے قریب رک گیا۔ پھر میں نے سانپ کو اپنا پھن گھونسلے میں داخل کرتے دیکھا اور چند لمحوں کے بعد جو منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا اس نے میرا دل تڑپا دیا۔ وہ رنگین اور حسین چڑیا سانپ کے منہ میں دبی ہوئی پر پھڑ پھڑا رہی تھی اور سانپ اسے منہ میں دبائے پیچھے ہٹ گیا۔ چڑیا پھڑ پھڑاتی رہی میرا دل سینے سے نکلا پڑ رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ کسی طرح اس سانپ کو ہلاک کر کے اس چڑیا کو آزاد کرا دوں لیکن سیوک رام کے الفاظ بھی میرے ذہن میں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ چڑیا کو چٹ کر گیا پھر اس نے دوبارہ پھن اندر ڈالا اور دوسری چڑیا نکال لی، اسے بھی ہلاک کرنے کے بعد سانپ نے اپنی منزل کی جانب رخ کیا اور درختوں کی شاخوں میں گم ہو گیا، حسین چڑیوں کا گھونسلا خالی ہو گیا تھا اور نہ جانے کیوں میرے دل کو ایک دکھ کا سا احساس ہوا، کتنی سکون کی زندگی گزار رہی تھیں وہ لیکن اب ان کا وجود مٹ گیا، ایک دشمن انہیں کھا گیا تھا۔ سانپ اپنی جگہ سے غائب ہونے کے بعد پھر نظر نہیں آیا اور میں اطمینان سے اپنا جاپ پورا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ چاند نے سر ابھارا اور میں نے جاپ ختم کر کے اپنی جگہ کی راہ لی۔ آج مجھے کوئی چیخ نہیں سنائی دی تھی۔ پھر اسی طرح یہ جاپ کرتے ہوئے مجھے پانچواں دن آ گیا اس دوران عجیب و غریب حالات پیش آئے تھے، ویسے جاپ کرنے کے وقت کے لیے میں نے ایک ڈنڈا اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ اگر سانپ میری طرف آئے تو اس سے کم از کم اس درخت کی چھاؤں کے نیچے ہی نمٹ سکوں، موذی کا کیا بھروسہ کب کس طرح نکل آئے۔ خیر جناب یہ واقعات گزرتے رہے تو میں پانچویں دن کا تذکرہ کر رہا تھا۔ یہ میرے جاپ کا پانچواں دن تھا۔ دو دن باقی رہ گئے تھے۔ میں بیٹھا ہوا جاپ کر رہا تھا موسم خوشگوار تھا آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور آج یہ خطرہ تھا کہ شاید چاند نظر نہ آئے لیکن بہرحال ایک تعین ہو گیا تھا کہ اگر چاند بادلوں کی وجہ سے نظر نہ بھی آیا تو کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ جوں جوں رات گزرتی رہی، بادل چھٹتے چلے

گئے اور چاند پوری آب وتاب کے ساتھ نکل آیا۔ فضا میں چاروں طرف روشنی پھیل گئی' میں اپنے جاپ کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا کہ کہیں سے ایک بلی میرے سامنے میاؤں میاؤں کرتی ہوئی آ گئی۔ وہ درخت کی چھاؤں کے اس طرف میری جانب رُخ کر کے بیٹھ گئی۔ میں چند لمحوں کے لیے رک گیا اور اس بلی کو دیکھنے لگا جو نجانے مجھ سے کیا چاہتی تھی' وہ تین بار منہ سے میاؤں میاؤں کی آوازیں نکال چکی تھی۔ بہت خوبصورت بلی تھی' میں اسے دیکھ کر مسکراتا رہا' نہ جانے کیا سمائی ہے اس کے دل میں......؟ لیکن پھر وہ خوفناک لمحہ آ گیا جس نے میری روح تک کو لرزا دیا۔

اسی سامنے والے درخت سے جس پر میں چڑیوں کا وہ گھونسلہ دیکھتا تھا اور اب وہ گھونسلہ ویران دیکھ کر میرے دل کو دکھ ہوتا تھا اچانک ہی ایک قدآور بلے نے چھلانگ لگائی۔ کالے رنگ کا یہ بلا بڑی لمبی زقند بھر کر بلی پر آ کودا تھا۔ بلی اپنی جگہ سے اٹھ بھاگی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ میں نے حیرت سے دیکھا وہ بلا عام جسامت سے کہیں زیادہ تھا اور بہت تندرست وتوانا معلوم ہوتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بلی پر جھپٹا مارا اور اس کی گردن اپنے دانتوں میں دبوچ لی۔ میرے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو گئی میں نے ڈنڈے کو مٹھی میں پکڑ لیا اور ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ اٹھ کھڑا ہو جاؤں اور اس خوبصورت بلی کو بچاؤں' جو اب بلے کے جبڑوں میں دبی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ زمین پر اچھا خاصا ہنگامہ ہو رہا تھا' بلا اس بلی کو بھنبھوڑ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بلی خون میں نہا گئی۔ بلے نے اس کی ٹانگیں چبا ڈالیں اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کے پورے بدن کو چٹ کر گیا۔ بلی کو اس نے توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا اور اب زمین پر خون کے چھینٹوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کالے بلے کا منہ خون سے رنگین ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کی جسامت پہلے سے بھی کچھ بڑھ گئی ہے۔ بلی کو ہضم کرنے کے بعد وہ لمبی زبان نکال کر اپنے منہ پر لگا خون چاٹنے لگا۔ تب ہی اس کی گول گول خوفناک آنکھیں میری جانب اٹھ گئیں اور وہ اس طرح ٹھٹک گیا جیسے پہلی بار اس نے مجھے دیکھا ہو۔ نہ جانے کیوں میرے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ بلے کی آنکھوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے شکار کو تاک رہا ہو پھر وہ دبے قدموں میری جانب بڑھنے لگا اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ کمبخت بلا آخر کیا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا' بلا آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہا تھا اور میں ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالے اٹھتا جا رہا تھا۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا تو ظاہر ہے مجھے اس سے جنگ کرنی ہے۔ پھر بلا درخت کی چھاؤں کے اس حصار کے قریب آ گیا جس سے باہر نکلنے کی مجھے ممانعت تھی اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس سے مقابلہ کروں۔ لیکن اس وقت بھی میں نے اپنے ہوش وحواس نہیں کھوئے تھے اور یہ سوچ رہا تھا کہ بلا اگر اندر آ گیا تو اس حصار کے اندر ہی اندر میں اس سے جنگ کروں گا لیکن بلا اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس طرح مجھے تاکتا رہا جیسے موقع ملتے ہی مجھے بھی بلی کی طرح چیر پھاڑ کر چٹ کر جائے گا۔ بلی کو اس نے جس وحشیانہ انداز میں چبایا تھا وہ اب بھی میرے ذہن پر نقش تھا اور میرا بدن اسے دیکھ کر ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔

بلا تقریباً دو یا تین منٹ وہاں کھڑا رہا' پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ چاند نکل آیا ہے اور مجھے اپنا جاپ ختم کر لینا چاہیے۔ ویسے بھی صرف چند لمحوں کی بات رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بیٹھ گیا لیکن ڈنڈا اب بھی میں نے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا

یہاں تک کہ میں نے اپنا جاپ پورا کیا اور جیسے ہی میرے جاپ کی آخری لائن ختم ہوئی میں ڈنڈا لے کر اس بلے کی طرف دوڑا۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا' میں تقریباً دو یا تین منٹ تک درخت کے نیچے کھڑا رہا تھا اور اس کے تنے کو ڈنڈے سے بجاتا رہا تھا......

''آ کمبخت نیچے تو آ میں تجھے دیکھ لوں گا۔'' اب میرے دل سے نہ جانے کیوں خوف نکل گیا تھا۔ بلے پر میرا غصہ بہت شدید ہو گیا تھا۔ یہ درخت ہے ہی دوست کی جڑ۔ اس کمبخت پر ساری خونخوار بلائیں ہی اتری ہیں۔ وہ سانپ اور وہ بلا...... لیکن اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بلا درختوں کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا ہو۔ بہرحال دیر تک میں درخت پر ڈنڈے برساتا رہا لیکن بلے نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا نا ہی اس کی آنکھیں کہیں چمک رہی تھیں جبکہ میں ان کی تلاش میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل چاہا کہ درخت پر چڑھ کر اسے تلاش کروں لیکن پھر اپنی اس دلیری کو خود ہی اپنے سینے میں دبا لیا کیا فائدہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤں' وہاں سانپ بھی ہے اور اس کے بعد میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ دوبارہ جب بھی وہ نظر آیا میں اس پر ڈنڈا پھینک کر ماروں گا لیکن یہ بھی ایک غلط طریقہ کار تھا۔ میرے ہاتھ سے اگر ڈنڈا نکل گیا تو صرف ہاتھوں سے میں اس کا صحیح طور پر مقابلہ نہ کر پاؤں' ورنہ وہ مجھے زخمی کر دے گا۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا' دفعتاً مجھے اپنے عقب میں سرسراہٹیں محسوس ہوئیں اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک انتہائی مکروہ وجود تھا جو میری جانب بڑھ رہا تھا' میں رک کر اسے دیکھنے لگا' اب مجھے اس کا وہ صاف نظر آ رہا تھا اس کی آنکھوں میں میرے لیے ایک نفرت بھرا انداز تھا یہ ہے کون' میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ ہے کیا چیز' مجھ سے کوئی پانچ گز کے فاصلے پر وہ آ کر کھڑا ہو گیا' پھر اس کی کرخت آواز ابھری۔

''مانگ کیا مانگتا ہے؟''

بڑے عجیب سے الفاظ تھے' میں نے حیرانی سے سنے' لیکن پھر فوراً ہی میرے ذہن کے دریچے کھل گئے' اس کا مطلب ہے کہ میرا جاپ پورا ہو گیا ہے اور یہ کوئی ایسا وجود ہے جو میرے تابع ہو چکا ہے' لیکن پھر بھی میں نے اس سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

''کون ہے تو؟''

''بھیروں۔'' اس کی غرغرائی ہوئی آواز ابھری۔

''کیا دے سکتا ہے مجھے؟''

''کچھ بھی نہیں' پر ایک سودا کرنا چاہتا ہوں تجھ سے۔'' وہی منحوس آواز ابھری۔

''سودا؟''

''ہاں۔''

''کیسا سودا؟''

''تیرا جاپ ابھی تک پورا نہیں ہوا ہے' بڈھے سیوک رام نے خود تو جیون میں کبھی مجھ پر قابو نہیں پایا' لیکن دوسروں کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے' چار بندے مار چکا ہوں میں جو مجھے قابو کرنا چاہتے تھے' مگر تیری بات اور ہے' میں تجھے نہیں مار سکتا۔''

میں دلچسپی سے اس کے یہ الفاظ سن رہا تھا' میں نے کہا:

''تو مجھے کیوں نہیں مار سکتا؟''

''اس لیے کہ تو مسلمان ہے اور میں کسی مسلمان کو نہیں مار سکتا۔''

میرے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی' یہ تو اچھی بات ہے میں نے دل میں سوچا پھر میں نے اس سے کہا۔

"تو پھر تُو مجھ سے یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ میں تیرے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"
"بتایا ہے نا میں نے تجھے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں تجھ سے۔"
"تو بھیروں ہے نا؟"
"ہاں۔"
"جسے جگانے کے لیے سیوک رام نے مجھے یہ منتر بتایا تھا۔"
"ہاں۔"
"مگر میرا یہ منترا بھی پورا تو نہیں ہوا۔"
"یہی بات ہے، میں چاہتا ہوں کہ تو اپنا یہ منتر کبھی پورا نہ کرے۔"
"یہ کیوں چاہتے ہو تم؟"
"اس لیے کہ میں تیرے قبضے میں نہیں آنا چاہتا۔"
"ارے واہ، اور میں جو اتنے دن سے محنت کر رہا ہوں وہ۔"
"اسی محنت کا صلہ تو میں تجھے دینا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔
"وہ صلہ کیا ہوگا؟"
"تین وچن دیئے جائیں گے تجھے جو تیرے لیے بڑے فائدہ مند ہوں گے اگر تُو اپنا یہ جاپ پورا کرلے گا تو بے شک بھیروں تیرے قبضے میں آجائے گا لیکن پھر میری اور تیری دشمنی چلے گی۔ تیرے لیے میں جو کچھ کروں گا وہ مجبوری سے کروں گا، جبکہ اگر تو مجھ سے سودے بازی کرلے تو تیرے لیے بڑے فائدے رہیں گے۔"
"اچھا بول کیا سودے بازی کرنا چاہتا ہے تُو؟" میں نے کہا۔ اصل میں جن حالات سے اب تک گزرا تھا انہوں نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ کسی کے ساتھ رعایت مت کرو، دنیا بہت بری چیز ہے، بہت بری جگہ ہے یہ دنیا، تم اگر کسی کے ساتھ رحم کرو گے تو وہ تم پر کبھی رحم نہیں کرے گا، ہاں اگر کسی کا کوئی مفاد تم سے وابستہ ہے تو پھر وہ مفاد کی قیمت لگائے گا، میں نے سوچا کہ چلو اگر کوئی کام کی بات ہے تو سنا تو جائے، میں نے اس سے کہا۔
"کیا وچن دو گے تم؟"
"چھ بار۔ پورے چھ تو اپنے منہ سے جو بات کہے گا وہ پوری ہو جائے گی، تو کسی سے کہے گا کہ وہ تیرا یہ کام کردے تو سمجھ لے کہ وہ تیرا وہ کام کرنے پر مجبور ہوگا، چھ دفعہ اور اگر کوئی بھی تیرا کام نہ کرے تو تُو اسے اس کے لیے حکم دے سکتا ہے کیا سمجھا، بہت بڑی چیز ہے یہ۔"
"ٹھیک اور......"
"ایک وچن راز میں رہے گا اور سمے آنے پر دیا جائے گا۔"
"وہ کیوں؟"
"یہ بات بھی راز ہی ہے، سمجھ لے کہ اس کا راز میں رہنا تیرے لیے بڑا فائدہ مند ہے۔"
"چل ٹھیک ہے تیسرا۔" میں نے سوال کیا تو اس نے اپنی جیب سے چاندی کا ایک کڑا نکالا اور اسے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔
"یہ کڑا تو جس کے ہاتھ میں ڈالے گا وہ جیون بھر تیرا غلام ہوگا۔ تیرے ہر حکم کی تعمیل کرے گا، یہ کڑا وہ اپنے ہاتھ سے اتار کر نہیں پھینک سکتا جب تک کہ تو اِسے اُس کے ہاتھ سے نہ اُتارے سمجھ لے وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو تیرے سامنے بھیگی بلی ہوگا۔"
میرے ذہن میں ایک لکیر سی تیر گئی، اگر یہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو پھر بہت بڑی بات ہوگی، میں ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔
"مگر وہ میرے ہاتھ سے یہ کڑا اپنے ہاتھ میں

کیوں ڈلوائے گا؟"
"اسے بتا کر تھوڑی ڈالنا ہوگا کڑا، تو اسے کسی بھی بہانے سے ہاتھ سیدھا کرا لینا، اس سے کہنا اپنا پنجہ جوڑے اور بس پھر پھرتی سے یہ کڑا اس کے ہاتھ میں ڈال دینا۔"
"اتنی آسانی سے تو نہیں ہوگا جیسے میں یہ تیرا ہاتھ پکڑتا ہوں، مجھے بتانا کہ اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا؟"
اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اسے پکڑ لیا وہ بولا "بس اس طرح سے ہاتھ کرا کے وہ کڑا اس کے ہاتھ میں ڈال دینا۔"
"ایسے......" میں نے کہا اور کڑا اس کے ہاتھ میں ڈال دیا۔ ایک لمحے تک تو وہ کچھ نہ سمجھ پایا لیکن جب اسے میری اس چالاکی کا احساس ہوا تو وہ لوہے کی طرح تپ کر سرخ ہوگیا اور پھر اس نے وہ غل غپاڑہ مچایا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اس کی چیخیں دھاڑیں سی طرح گونج رہی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔
"ارے پاپی، ارے ہتیارے تیرا ستیاناس۔ مر جائے تُو کیا کر ڈالا تُو نے کیا کر دیا یہ میرے ہاتھ میں ڈال دیا، تُو نے چالاکی کی ہے میرے ساتھ۔"
جواب میں میرے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ "ہاں بھیروں مہاراج، میں نے تمہیں قبضے میں کرنے کے لیے جس چلّے کا آغاز کیا تھا اور سیوک رام نے جو چلّہ مجھے بتایا تھا اس میں تو ابھی کافی محنت کرنی پڑتی مجھے، لیکن دیکھ لو کس طرح میرا کام ہوگیا یہ تمہاری مہربانی ہے بھیروں مہاراج، واہ...... اس کا مطلب ہے کہ اب تم میرے غلام بن گئے جو کام کرنے کے لیے مجھے ابھی طویل جاپ کرنا تھا وہ تم نے پورا کر دیا۔"
"دیکھ لے...... دیکھ لے، میں تجھ سے تیری اس حرکت کا بدلہ لوں گا جب بھی کبھی موقع ملا تجھے نقصان پہنچادوں گا یہ میرا وچن ہے۔"
"وہ بعد کی بات ہے یہ بھی تم نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا، اب میں تم سے ہوشیار رہوں گا۔" وہ چیختا چلاتا رہا، میں نے اس سے اور کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ ہنستا ہی رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک اس نے اودھم مچایا اور اس کے بعد ڈھیلا پڑ گیا۔
"ٹھیک ہے اب میں تیرا داس ہوں، مجھے کوئی حکم دے۔"
"ابھی نہیں بھیروں داس، ذرا مجھے سکون لینے دو، یہ یقین تو کر لینے دو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے اور تم وہی کرو گے جیسا کہ تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میرے ساتھ تمہاری دشمنی شروع ہوگئی ہے۔"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بس بُری نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا نجانے کیوں مجھے اپنے اندر ایک اعتماد سا محسوس ہو رہا تھا، مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کوئی بڑی قوت حاصل کر چکا ہوں میں نے اس سے کہا۔
"ٹھیک ہے اب تم جاؤ بھیروں مہاراج، مجھے جب ضرورت ہوگی تمہیں آواز دے لوں گا۔"
وہ تھوڑی دیر تک کھڑا خونی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا اس کے بعد مڑا اور پھر چھلانگ لگا کر فضا میں غائب ہوگیا، میری خوشی کی انتہا نہیں تھی اگر وہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مجھے تو بڑی شاندار قوت حاصل ہوگئی اور اب اس قوت کے ذریعے میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ واقعی کمال ہوگیا، یہ تو ایک طرح سے یہ کہنا چاہئے کہ میری لاٹری نکل آئی تھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اس کا تجربہ کہاں سے کروں کہ جو اس نے کہا ہے وہ سچ ہی ہے، بہت دیر تک سوچتا رہا اب چلّہ کشی بیکار تھی، چنانچہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔
پھر اچانک ہی بالکل پہلے جیسی نسوانی چیخ میرے کانوں میں ابھری اور میں ایک دم چونک کر رُک گیا،

تھوڑے فاصلے پر سیوک رام کی جھونپڑی تھی' میرے قدم اس جھونپڑی کی جانب اُٹھ گئے' میں جھونپڑی کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دوبارہ وہی چیخ مجھے سنائی دی اور اس بار کچھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی' میں نے سامنے دیکھا جھونپڑی کے احاطے میں ایک سایہ جھونپڑی سے نکل کر باہر آیا تھا اور پوری قوت سے دوڑ رہا تھا' اچانک ہی اس نے ٹھوکر کھائی اور نیچے گر پڑا' لیکن اس کے پیچھے ہی دوسرا سایہ بھی آیا تھا۔ میں نے دُور سے اُسے پہچان لیا' یہ سیوک رام ہی تھا۔

میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچا تب میں نے دیکھا کہ وہ سایہ جو زمین پر گرا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کے حلق سے سسکیاں نکل رہی تھیں' وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''ہائے رام' ہے بھگوان' ہے بھگوان' میری سہائتا کر' بچالے مجھے میرے بھگوان' بھیج دے اپنا کوئی داس میرے لئے' میرے بھگوان مجھے بچالے' مجھے بچالے نہیں تو مجھے مرنا ہی پڑے گا۔''

اچانک ہی سیوک رام کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ ٹھٹک گیا' میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ رونے والی اور بھگوان کا نام لینے والی کوئی عورت تھی جو ساڑھی میں ملبوس ہوگی' لیکن اس وقت اس کے نچلے جسم پر ایک پیٹی کوٹ تھا' اوپری بدن بھی مختصر سا ڈھکا ہوا تھا' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپائے بیٹھی رو رہی تھی' سیوک رام حیرت سے مجھے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ بوڑھا شیطان اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کررہا تھا میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

''ہتھیارے پاپی تُو کہاں سے آمرا' ارے' ابھی تیرا جاپ کہاں ختم ہوا' تو نے جاپ ادھورا چھوڑ دیا۔''

''میں نے تو جو کچھ کیا وہ بہتر کیا ہے سیوک رام جی' یہ آپ کیا کررہے ہیں؟''

''دفع ہوجا یہاں سے دُور ہوجا میری نگاہوں سے' اب تُو اپنا وہ جاپ بھی پورا نہیں کرسکتا تو دیکھنا بھیروں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا' اب وہ تجھے جیتا نہیں چھوڑے گا' چل بھاگ جا یہاں سے۔''

''میرے ساتھ تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا ہی سیوک رام جی پر یہ بتاؤ کہ یہ کیا ہورہا ہے؟''

''تجھے کیا؟'' وہ بولا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تیری ماں ہوگی۔'' سیوک رام نے جواب دیا اور میری آنکھوں میں خون اُتر آیا' یہ ایسا جملہ تھا جو میری دُکھتی رَگ تھا۔

''ماں......'' ماں کے لیے میرے دل میں نجانے کیا کیا خیالات تھے اور اس شخص نے اسے میری ماں کہا تھا' میں ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

''اگر یہ میری ماں ہے تو یہ رو کیوں رہی ہے؟''

''جائے گا نہیں تُو یہاں سے' کچھ کروں تیرے خلاف؟'' سیوک رام نے کہا اور میں اس کی طرف ... اور قدم بڑھا تب اس نے اچانک ہی دونوں ہاتھ ... بڑھائے اور اس کی انگلیوں سے شعلوں کی لکیریں نکل کر میری جانب بڑھیں' میں ایک دم زمین پر بیٹھ ... تھا' پھر میں نے کہا۔

''سیوک رام تُو بالکل خاموشی سے کھڑا ہوجا' ایک قدم آگے نہیں بڑھے گا تو میں تجھے حکم دیتا ہوں ...'' میں نے کہا اور اچانک ہی سیوک رام کے ہاتھ اُٹھے کے اُٹھے رہ گئے۔ میں اپنے الفاظ کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا ورنہ زندگی کی بازی تو لگ ہی چکی تھی' سیوک رام پتھر کا بن گیا تھا' میں اس کے قریب پہنچا اور میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کردیا۔ میرے ... سے وہ زمین پر گر پڑا' تب میں نے اسے اپنی جگہ ...

اُٹھایا اور کہا۔

''میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا سیوک رام' لیکن خبردار تُو نے میرا پیچھا کیا' کبھی بھی میرا پیچھا مت کرنا مجھے اپنے ذہن سے نکال دینا۔''

سیوک رام پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا' اس کے جسم میں اب بھی کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی گویا میرے دو قول پورے ہوگئے تھے اور اب چار باقی بچے تھے' لیکن یہ دیکھ کر مجھے دلی خوشی کا احساس ہوا تھا کہ بھیروں کا دیا ہوا وچن بالکل ٹھیک تھا اور پورا ہوگیا تھا' میرے دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھی' اب اس کے بعد کوئی تیسری بات سیوک رام سے کہنا بالکل بے مقصد تھا۔ نجانے کیوں میرے دل کو یقین تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا سیوک رام اس سے ذرا بھی انحراف نہیں کرے گا۔

تب میں اس عورت کی طرف متوجہ ہوا جس کی سسکیاں اب رُک گئی تھیں' اس نے گردن اُٹھا کر مجھے دیکھا تب میں نے اس کے مدہم سے نقوش دیکھے' کوئی نوجوان لڑکی تھی اس کے چہرے مہرے اور بالوں سے پتہ چل رہا تھا' لیکن جس عالم میں تھی اس میں وہ شاید کھڑی نہیں ہوسکتی تھی کسی اجنبی کے سامنے' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بھیا میری ساڑھی اندر جھونپڑی میں پڑی ہے بھگوان تمہیں جیون کا ہر سکھ دے' تم نے مجھے ماں کہا ہے یا بہن' میری ساڑھی لادو تمہاری مہربانی ہوگی۔''

میرے قدم جھونپڑی کی جانب بڑھ گئے' جھونپڑی میں اچھی خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی' سیوک رام اب بھی اسی جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں پہلے کھڑا تھا' غالباً اس کے بدن میں جنبش کرنے کی صلاحیت نہیں تھی' اب وہ جائے جہنم میں' اس پر جو بیتی وہ جانے' میرا کام تو ہوچکا تھا چنانچہ میں جھونپڑی میں پہنچا وہاں ایک ساڑھی پڑی ہوئی تھی سادہ سی ساڑھی اس کے ساتھ ہی چپلیں بھی تھیں' میں نے دونوں چیزیں اٹھائیں اور باہر نکل آیا' تب میں نے اس سے کہا۔

''لو اپنا لباس پہن لو بہن...... بھائی کہا ہے تم نے مجھے...... بھائی تمہارا ساتھ دے گا۔''

یہ کہہ کر میں دوسری طرف رُخ کرکے کھڑا ہوگیا' پہلے اس نے جائزہ لیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ پورا کروں گا یا نہیں اور جب اسے اطمینان ہوگیا کہ اس سے یہ الفاظ کہنے والا شخص ایماندار ہے تو اس نے اپنا لباس پہنا اور چند لمحوں کے بعد اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں نے ساڑھی پہن لی ہے بھیا جی۔''

''ہوں...... آؤ۔'' میں نے کہا اور اسے ساتھ لے کر چل پڑا۔

سیوک رام اب بھی اسی طرح کھڑا ہوا تھا' پتہ نہیں اس کے اندر اب بھی جنبش کرنے کی صلاحیت تھی یا نہیں' لیکن میں تیسری خواہش نہیں کرسکتا تھا' اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ جانے' ویسے بھی اس نے غلط ہی کیا تھا' اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے' فوری طور پر کوئی بات ذہن میں نہیں آرہی تھی' پھر اچانک ہی میرے ذہن میں چاچی کا خیال آیا جس نے مجھے یہاں تک بھیجا تھا' بہرحال اس سے میرا واسطہ تو تھا' کیوں نہ اس معصوم سی لڑکی کو لے کر چاچی کی طرف ہی چلوں۔ چنانچہ میں چاچی کی طرف چل پڑا۔

(باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ)

⌘

عروس آزادی

زرین قمر

کشمیری حریت پسندوں کی جدوجہد سے ایک زمانہ واقف ہے' کشمیر کی آزادی کے حق میں جہاں دنیا بھر میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں وہاں اس خلق خدا پر بھارتی حکومت کے مظالم اب معمول بن چکے ہیں۔ یہ کہانی بھی ان جیالے لوگوں پر مشتمل ہے' جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ اپنے وطن کو آزاد کرانے میں گزر رہا ہے۔ بوڑھے ہوں یا جوان' عورت ہو یا بچہ سب کے سب اپنی مقبوضہ زمین کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ زمین کی محبت کیا ہوتی ہے اور زمین کو آزاد کرانے کا خواب کس طرح آنکھوں میں جگمگاتا ہے یہ بات اس کہانی کی سطر سطر میں پیوست ہے۔

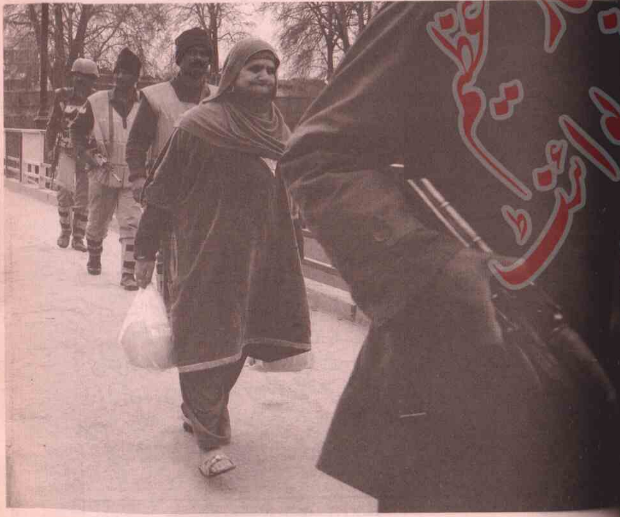

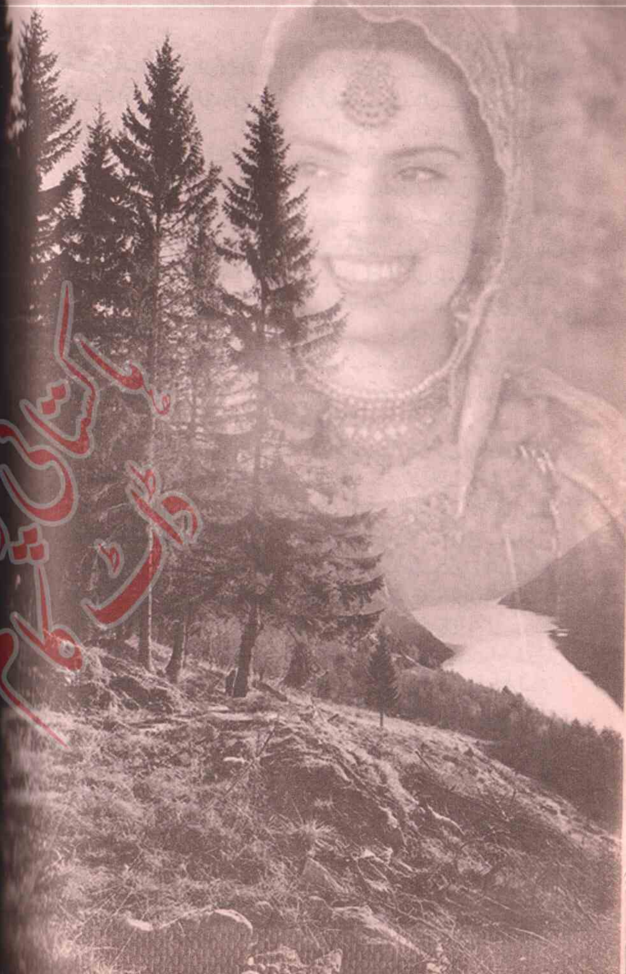

فرناز ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی اور بڑے انہماک سے آج کی بریکنگ نیوز دیکھ رہی تھی۔

''سری نگر' آج کشمیری حریت رہنما شبیر شاہ نے اپنی حریت ریلی میں ایک بار پھر پاکستانی پرچم لہرایا اور موقع پر موجود بھارتی فوجیوں نے مشتعل ہوکر ریلی کے متعدد شرکا کو گرفتار کرلیا۔''

فرناز کی ساری توجہ اس خبر کی طرف تھی وہ سوچ رہی تھی کہ آج انتیس مئی ہے اور اس ماہ میں یہ تیسری بار ہے کہ پاکستانی پرچم لہرانے پر کشمیریوں کو بھارتی تشدد کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کئی لوگ گرفتار بھی ہوئے ہیں اسے اچانک ہی احمد کمال کا خیال آیا تھا جو کشمیر کی اس جدوجہد آزادی کا حصہ تھا اور بڑی باقاعدگی سے حریت کی ان ریلیوں میں شرکت کرتا تھا۔ اسے وہ بے انتہا پسند کرتی تھی وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا لیکن اس کی منگنی اس کی بڑی بہن فریال سے ہوگئی تھی اور ایک ماہ بعد ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی اور فرناز اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ وہ اداس رہنے لگی تھی۔ احمد کمال بھی کافی دن سے ان کے گھر نہیں آیا تھا وہ اداسی سے اٹھ کر باہر لان میں آبیٹھی جہاں سے اسے گھر کے باہر کشمیر کی دلفریب وادیاں دور دور تک بکھری نظر آرہی تھیں۔ ان کا گھر ہندوواڑہ کے علاقے میں ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا گھر کے باہر بنے لان میں بیٹھنے سے اردگرد کی پہاڑیوں کا دلفریب منظر نظر آتا تھا ان پہاڑیوں میں چکر کاٹتی سیاہ ناگن جیسی سڑک کا منظر تو بہت دلکش تھا اس پر آنے والی کوئی بھی گاڑی دور سے چکر کھاتی آگے بڑھتی پہاڑیوں کے دامن میں کبھی کسی موڑ پر چھپتی کبھی ظاہر ہوتی عجیب نظارہ پیش کرتی تھیں اس وقت بھی ایک موٹر سائیکل سوار بڑی تیز رفتاری سے اس سڑک پر آگے بڑھتا چلا آرہا تھا اور فرناز خالی الذہنی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

• پھر چکراتی بل کھاتی سڑک پر سفر کرتی وہ موٹر سائیکل فرناز کے گھر کے گیٹ پر ہی آکر رکی تھی اور فرناز کا اداس چہرہ کھل اٹھا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی محبوب ہستی احمد کمال کھڑا تھا۔

''احمد...... احمد کمال۔'' اس نے بے خودی میں سرگوشی کی اور احمد کمال کے استقبال کے لیے گیٹ کی طرف لپکی احمد کمال بائیک کھڑی کر کے اس کی طرف ہی آرہا تھا۔ اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ فرناز کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ احمد کمال سے کیا بات کرے گی...... اسے پیار سے پکارے گی...... کسی اچھے سے خوب صورت نام سے مخاطب کرے گی دل ہی دل میں تعریفی جملے سوچنے لگی لیکن جب احمد کمال اس کے نزدیک آیا تو اس کے منہ سے ادا ہونے والا جملہ نہایت سادہ اور رسمی سا تھا۔

''آؤ احمد کمال، کیسے ہو، کافی دنوں بعد آئے'' اس نے پوچھا۔

''ہاں کچھ مصروفیت تھی۔'' احمد کمال نے بے پروائی سے کہا اس سے بے خبر کہ فرناز کس بے قراری سے اس کا انتظار کررہی تھی۔

''کیسی مصروفیت، تمہاری مصروفیت اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ شبیر شاہ کے جلسوں میں شرکت کرو۔'' فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جب جانتی ہوتو پوچھتی کیوں ہو؟'' احمد کمال نے بھی اسی کے انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اور یہ تم نے کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں۔'' فرناز نے احمد کمال کے میلے سادہ اور سستے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اب سے پہلے وہ ہمیشہ ہمیشہ عمدہ لباس زیب تن کرتا رہا تھا فرناز کو جھنجلاہٹ بھی محسوس ہورہی تھی کہ اس نے اپنے دل میں سوچے ہوئے کئی محبت آفرین جملوں میں سے ایک بھی کمال کے سامنے ادا نہیں کیا تھا کیونکہ وہ مجبور تھی اس کا محبوب کمال احمد اس کی بہن فریال کا منگیتر تھا۔

''میں ایک ضروری کام سے سرینگر گیا ہوا تھا۔'' احمد کمال نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے تم یقیناً حریت ریلی میں شرکت کرنے گئے ہوگے میں ابھی ٹی وی پر خبریں دیکھ رہی تھی۔'' فرناز نے کہا۔

''ہاں...... یہی بات ہے...... انڈین فوج نے تو ظلم کی انتہا کردی وہ تو برداشت ہی نہیں کرسکتے کہ یہاں کوئی پاکستان کا نام بھی لے ہمارا خواب پاکستان ہے ہماری جان پاکستان ہے۔'' احمد کمال نے جوشیلے انداز میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے احمد کمال، میرے بھی یہی جذبات ہیں لیکن 1947ء سے لے کر اب تک ہم نے کتنی قربانیاں دی ہیں کتنی جدوجہد کی ہے کہ پاکستان کے ساتھ الحاق ہوجائے لیکن بھارتی حکومت ہمیشہ ہمارے ارادوں کو خاک میں ملادیتی ہے۔''

''لیکن میرا ایمان ہے کہ کبھی نہ کبھی ہماری جدوجہد ضرور رنگ لائے گی۔'' احمد کمال نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''ان شاء اللہ۔'' فرناز نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''ہاں یہ تو بتاؤ کہ آج یہ پھٹیچر لباس کیوں پہنا ہوا ہے؟'' فرناز نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ سرینگر میں میری ملاقات مجاہد شیر دل سے ہوئی وہ ایسا ہی موٹا کھدر کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتا ہے جب میں اس سے پہلی بار ملا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے لباس کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کئی بار مجھے سمجھایا کہ ہمیں سادہ اور سستا لباس پہننا چاہیے اور خاص طور پر اپنا مقامی لباس جو ہماری پہچان ہے اگر واقعی ہم اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے پیار کرتے ہیں تو ہمیں اپنی ثقافت اور اپنے لباس کو نہیں بھولنا چاہیے اور دوسروں کی تقلید نہیں کرنا چاہیے۔ میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔''

''یہ شیر دل کون ہے؟'' فرناز نے پوچھا۔

''شیر دل بھی ایک حریت لیڈر ہے لیکن وہ بہت سادہ مزاج اور اپنے وطن پر مر مٹنے والا ہے۔''

''ہوں تو تم اس سے متاثر ہوگئے ہو؟'' فرناز نے پوچھا۔

''ہاں وہ چند ہی دنوں میں میرا آئیڈیل بن گیا ہے اس کا کہنا ہے کہ انسان کے دل ودماغ میں جو چیز رہتی ہے وہی اہمیت رکھتی ہے وہ لباس اہمیت نہیں رکھتا جو ظاہری شان وشوکت عطا کرتا ہے ہم آزادی کی جدوجہد کررہے ہیں ہمیں اپنی نئی نسل کو سوچنے کا نیا انداز دینا ہے ایسا انداز جس کو اپنا کر ہمارے ہم وطن عزت سے زندہ رہ سکیں اور ایک ظاہری ٹھاٹ باٹ والا لباس ہمارے لیے مناسب نہیں ہمارا نصب العین ایک آزاد مملکت کا قیام ہے جسے ہم سادگی سے رہ کر ہی پاسکتے ہیں' سادگی سے زندگی گزاریں اور وطن کے لیے جدوجہد کریں اس کے لیے ہمیں امیری کے ٹھاٹ باٹ چھوڑنا ہوں گے۔ جو امیر خاندانوں میں پیدا ہونے والوں کی میراث ہے۔''

احمد کمال بول رہا تھا اور فرناز سن رہی تھی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کیونکہ وہ تو بس والہانہ انداز میں احمد کمال کے سراپا میں کھوئی ہوئی تھی اس کا

چوڑا چکلا سینہ، روشن آنکھیں، سانولی رنگت اور مردانہ وجاہت وہ مسحور سی کھڑی تھی اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس نے کبھی احمد کمال کی کوئی بات غور سے نہیں سنی تھی شاید اس لیے کہ اس نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی احمد کمال جو کچھ بھی کہتا تھا وہ بلا کسی تنقید یا اعتراض کے اس کے لیے بالکل درست ہوتا تھا اور وہ اپنی طبیعت کے برخلاف بغیر حیل و حجت اس کی ہر بات تسلیم کر لیتی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ سرینگر میں ہونے والی ریلی میں تمہارا کیا کردار تھا۔'' فرناز نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یہ میں تمہیں پھر بتاؤں گا تم یہ بتاؤ کہ فریال کہاں ہے۔'' احمد کمال نے برآمدے کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا اور فرناز کے چہرے پر سرد سی لہر چھا گئی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اٹھا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اٹھایا ہو۔

''اپنے کمرے میں۔'' اس نے فریال کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ احمد کمال اس کے الفاظ سن نہ سکا تھا بس اس کے اشارے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''اور تمہاری امی۔'' احمد کمال نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ خالہ جان کے گھر گئی ہیں۔'' فرناز نے جواب دیا۔

''اچھا، میں فریال سے مل لوں۔'' احمد کمال نے کہا اور فریال کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

فرناز لان میں پڑی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''ہونہہ میں نہیں روؤں گی، ہرگز نہیں روؤں گی۔'' فرناز نے خود سے کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سانولے رخساروں پر بہنے لگے تھے اس نے انہیں جلدی سے صاف کر لیا کیونکہ احمد کمال فریال کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

''فرناز ہم ذرا بازار تک جا رہے ہیں۔ میں فریال کو اس کی پسند کا جوڑا دلوانا چاہتا ہوں۔'' احمد کمال نے مسکراتے ہوئے کہا اور فرناز کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا اسے یاد آ گیا کہ فریال اور احمد کمال کی ایک مہینے بعد شادی ہونے والی تھی۔

''ضرور جائیں۔'' اس نے تلخی سے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔

''ارے، اسے کیا ہو گیا، ابھی تو اچھی بھلی تھی۔'' احمد کمال نے حیرت سے کہا۔

''یہ احساس کمتری کا شکار ہے اپنی سانولی رنگت، معمولی نقوش کی وجہ سے مجھ سے بھی جلتی ہے۔'' فریال نے اپنی مخروطی انگلیوں سے سیاہ زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا اس کی گلابی رنگت احمد کمال کے قرب سے اور زیادہ نکھر گئی تھی۔

''لیکن کون کہتا ہے کہ وہ بدصورت ہے۔'' احمد کمال نے کہا ''وہ خوب صورت ہے۔'' اس نے فریال کی طرف دیکھا جو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''وہ خوب صورت ہے اور......!''

''اور......اور کیا؟'' فریال نے پوچھا۔

''اور تم......بہت زیادہ خوب صورت۔'' احمد کمال نے اسے خوش کرنے والے انداز میں کہا۔

''اوہ...... شکریہ جناب عالی۔'' فریال سیدھے ہاتھ سے آداب کرتے ہوئے ہنس کر کہا اور پھر اٹھلاتی ہوئی احمد کمال کی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے سے نکل کر بازار کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد فرناز اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر لیٹ گئی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی اس کی نظروں کے سامنے اپنا ماضی گھوم رہا تھا۔

اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی بڑی بہن فریال کو اپنے مد مقابل پایا تھا فریال بہت خوب صورت تھی سفیدی مائل، گلابی رنگت، بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں سیاہ بال اور اس پر چلبلی طبیعت کی مالک ہر کسی کی آنکھوں کا تارا فریال، اسے سب ہی چاہتے تھے جبکہ فرناز صرف قبول صورت تھی اس کی رنگت سانولی تھی اور وہ بہت خاموش طبع تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کی محبت بھی فریال سے کم ملی تھی گھر کے کام کاج میں بھی وہی اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتی تھی کہ فریال کسی بھی کام کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتی تھی اسے اپنے بناؤ سنگھار سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔

فرناز کا دل رو رہا تھا۔ اوہ احمد کمال میں کتنی بد نصیب ہوں، قدرت نے خوب صورتی کی طرح نصیب بھی فریال کی جھولی میں ڈال دیا ہے اور میں...... میں کتنی بے بس ہوں میں کسی سے اپنے دل کا حال بھی نہیں کہہ سکتی......تم سے بھی نہیں۔ فرناز نے ایک سسکی لی اور بستر سے اٹھ گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے والد سلیمان داؤد جب دفتر سے گھر آئیں یا والدہ واپس گھر آئیں گی تو اسے اس حالت میں دیکھیں چنانچہ منہ دھونے کے بعد وہ اپنے والد کے اسٹڈی روم میں جا بیٹھی اور دیر تک ان کی کتابوں کی ورق گردانی کرتی رہی۔ اس کے والد کشمیر میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اس کے باوجود انہوں نے اپنا پرانا خاندانی گھر نہیں بدلا تھا فرناز کئی بار اپنی والدہ سے فرمائش کر چکی تھی کہ اپنے دوسرے رشتے داروں کی طرح انہیں بھی کسی اچھے سے گھر میں شفٹ ہو جانا چاہیے لیکن انہوں نے کبھی اس کی بات نہیں سنی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کے والد سلمان داؤد آ گئے تھے اور آتے ہی انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس کی والدہ کو آواز دی تھی۔

''جی...... جی ابو......!'' وہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آ گئی تھی۔

''یہ تمہاری امی کہاں ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی وہ تو خالہ جان کے ہاں گئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آئیں گی۔'' فرناز نے جواب دیا۔

''اچھا، اچھا تم ایسا کرو کہ میرے لیے ایک کپ گرما گرم سبز چائے بنا لاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''جی بہتر۔'' فرناز نے جواب دیا اور تیزی سے باورچی خانہ کی طرف بڑھ گئی۔

پھر جب وہ چائے کا کپ لیے اپنے والد کے اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھی تو ان کی تیوریوں پر بل پڑے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

''یہ تمہاری بہن کہاں ہے؟'' انہوں نے قدرے غصے سے پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

''جی......وہ......وہ احمد کمال کے ساتھ بازار گئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''حد ہو گئی، خیر غلطی میری ہی ہے۔'' سلمان داؤد نے غصے سے کہا۔

''مجھے ہمیشہ ہی شک رہا تھا کہ وہ نامعقول ضرور کوئی حماقت کرے گا لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ!'' سلمان داؤد نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا ابو؟ آپ کیا نہیں سوچ سکتے تھے؟'' فرناز نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹی، کچھ نہیں، تمہارا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم یہ کرنا کہ جب وہ احمقوں کا جوڑا

واپس آئے تو انہیں میرے پاس بھیج دینا۔'' سلمان داؤد نے کہا۔

''جی اچھا ابو۔'' فرناز نے سعادتمندی سے کہا لیکن اس کا دل بے چین ہوگیا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ احمد کمال سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہوگئی ہے جسے اس کے والد نے برہم کردیا ہے اور ممکن ہے کہ ان کا غصہ اتنا شدید ہو کہ فریال اور احمد کمال کا ہونے والا رشتہ بھی خطرے میں پڑ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا اور احمد کمال کا خاندان ایک ہی حیثیت کے حامل تھے اور ان خاندانوں کے درمیان شادی ہونا کوئی مشکل بات نہیں تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے والد طبیعت کے بہت سخت اور غصہ والے تھے اگر انہیں احمد کمال کی کوئی بات ناگوار گزری تو یہ شادی ناممکن ہوجائے گی۔

اپنے والد کے اسٹڈی روم سے نکلنے کے بعد وہ برآمدے میں آ بیٹھی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور اندھیرے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں وسوسے سر اٹھا رہے تھے اس کے اندازے کے مطابق فریال اور احمد کمال کو اب تک واپس آجانا چاہیے تھا اگر انہیں دیر ہوگئی تو اس کے والد کا غصہ مزید بڑھ سکتا ہے وہ اس خیال سے پریشان ہو ہی رہی تھی کہ اچانک احمد کمال کی موٹر سائیکل مکان کے احاطے میں داخل ہوئی اور اس سے پہلے کہ احمد کمال فریال کو اتار کر واپس جاتا فرناز دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔

''تم دونوں کو ابو اسٹڈی میں بلا رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور اس کی بات پر احمد کمال کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا لیکن اس نے اپنی کیفیت کو چھپا لیا تھا۔

''شکریہ فرناز۔'' احمد کمال نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے کہا پھر وہ فریال کے ساتھ مکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ فرناز بھی ان کے پیچھے تھی لیکن اس نے پھر ایک تاریک گوشے ہی میں کھڑے رہنے پر اکتفا کیا تھا وہ جگہ اس کے والد کے کمرے کے قریب ہی تھی اور وہاں سے وہ ان کی گفتگو با آسانی سن سکتی تھی۔ اس وقت اس کے والد اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے اور ٹیبل لیمپ روشن تھا کمرے کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن فرناز با آسانی اندازہ کرسکتی تھی کہ اس وقت اس کے والد بہت غصے میں تھے۔

''صاحب زادے کیا تم بھی حکومت کے غداروں میں شامل ہو؟'' سلمان داؤد نے احمد کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے جناب؟'' احمد کمال نے پرسکون انداز میں پوچھا۔

''تم میرا مطلب اچھی طرح جانتے ہو آج ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے والد اسحاق احمد ذہین اور قابل انسان ہیں اور جنہیں اپنا دوست میں فخر محسوس کرتا ہوں۔''

''میں اس کے لیے آپ کا مشکور ہوں جناب'' احمد کمال نے سلمان داؤد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میری بات مت کاٹو۔'' سلمان داؤد نے غصے سے کہا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ آج صبح مجھے بتایا گیا ہے تمہارے والد اگلے ماہ اننت ناگ میں ہونے والی ''تحریک آزادی کشمیر'' کی ایک خفیہ میٹنگ میں تحریک کے ایک نمائندے کی حیثیت سے شرکت کرنے والے ہیں، کیا یہ درست ہے۔''

''جی ہاں اور مجھے یہ کہنے میں فخر ہے کہ وہ تحریک آزادی کشمیر کے ایک پروانے ہیں۔'' احمد کمال مسکراتے ہوئے کہا اس کا جواب سنتے ہی سلمان داؤد کھڑے ہوگئے۔

''تمہیں فخر ہے؟'' انہوں نے تیز آواز میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہارے والد کے جو نظریات ہیں تم ان سے متفق ہو؟''

''جی ہاں جناب اور میں بھی کانفرنس میں ان کے ساتھ شرکت کررہا ہوں۔''

''تو پھر بات ہی ختم سمجھو، اب کہنے اور سننے کو کچھ نہیں رہ گیا۔'' سلمان داؤد نے فریال کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

''فریال ان صاحبزادے کو ان کی انگوٹھی واپس کردو۔'' انہوں نے غصے سے کہا اور جیسے فریال پر بجلی گر پڑی۔

''اوہ ابو۔'' فریال نے بھونچکی ہو کر گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔'' سلمان داؤد نے غصے سے کہا۔ فریال پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی وہ تذبذب میں تھی کہ کیا کرے اور فرناز حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت اگر وہ فریال کی جگہ ہوتی تو اپنے والد کا یہ حکم ماننے سے انکار کردیتی چاہے وہ اسے جان سے ہی کیوں نہ مار دیتے لیکن وہ جانتی تھی کہ فریال اس کی طرح نہیں ہے پھر وہ مسکراتی آنکھوں سے فریال کو منگنی کی انگوٹھی اتارتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ فریال نے انگوٹھی اتار کر احمد کمال کے ہاتھ میں تھمادی۔ فریال کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ احمد کمال کچھ دیر تک انگوٹھی کو دیکھتا رہا تھا اور پھر اس نے اسے زمین پر گرادیا تھا۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، شب بخیر سلمان صاحب...... خدا حافظ فریال۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

فرناز دوڑتی ہوئی اس کے پیچھے باہر آئی تھی اندھیرے کے باعث اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

''احمد۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''کیا بات ہے فرناز؟'' احمد کمال نے رکتے ہوئے پوچھا۔

''میں...... میں تمہارے ساتھ ہوں احمد کمال۔'' فرناز نے ہمدردی سے کہا۔

''کیا مطلب۔'' احمد کمال نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں...... میں کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ تحریک آزادی کشمیر میں کام کرنے والے صحیح راستے پر ہیں تو پھر یہ ٹھیک ہی ہوگا میرا اس پر یقین ہے۔'' فرناز نے کہا تو احمد کمال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میں اس یقین پر تمہارا مشکور ہوں ننھی فرناز۔''

''مجھے ننھی مت کہو۔'' فرناز نے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

''میں بڑی ہوگئی ہوں، میں پندرہ سال کی ہوں اور اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہوں۔'' فرناز نے کہا۔

''تم بڑی ہوگئی ہو؟'' احمد کمال نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''اچھا ٹھیک ہے میں آئندہ خیال رکھوں گا۔'' احمد کمال نے مسکراتے ہوئے کہا اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا فرناز بھی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ منگنی کی انگوٹھی واپس کرنے کے باوجود احمد کمال کا موڈ خراب نہیں ہوا تھا وہ اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کررہا تھا۔

فریال کی منگنی ٹوٹے تیسرا دن تھا۔ فرناز اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی احمد کمال کی دی ہوئی ایک کتاب کی ورق گردانی کررہی تھی اس کے کمرے میں روشنی ناکافی تھی کھڑکیاں بند تھیں جنہیں اس نے اٹھ کر کھولنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی جو کتاب وہ پڑھ

رہی تھی وہ بہت سستی سی کتاب تھی وہ اتنی مختصر تھی کہ اسے اگر کتابچہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی چھپائی کے لیے نہایت گھٹیا سا کاغذ استعمال کیا گیا تھا اس کا عنوان تھا ''بھارت کی ہٹ دھرمیاں اور کشمیر کا جواب'' اس کتاب پر مصنف کا نام نہیں دیا گیا تھا اور اس کی اشاعت نومبر 1947ء میں عمل میں آئی تھی حکومت وقت نے اس پر پابندی عائد کردی تھی اور اس کے پڑھنے کو جرم قرار دیا جا چکا تھا اس کی خاطر بہت سے نوجوان جیلوں میں بند کردیے گئے تھے لیکن یہ کتاب کشمیری نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ احمد کمال نے فرناز کو بتایا تھا اب تک اس کتاب کی پانچ لاکھ سے بھی زیادہ کاپیاں فروخت ہوچکی ہیں۔

فرناز اس کتاب کو تقریباً پورا پڑھ چکی تھی اور یہ بات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ گئی تھی کہ لوگ اسے کیوں پسند کرتے ہیں اس میں یہ نکتہ اٹھایا گیا تھا کہ اگر ریاستی حکومت میں عوام کی نمائندگی نہیں ہے اور اس کی شنوائی نہیں ہوتی ہے تو پھر حکومت کے عائد کیے ہوئے ٹیکس کیوں ادا کریں؟ وہ مسلمان ہیں اور اپنے مذہب کے ناتے اپنے ملک میں اپنی حکومت چاہتے ہیں بھارت کو کیا حق ہے کہ ان پر مسلط رہے اور ان کو اپنا قانون ماننے پر مجبور کرے اب وقت آ گیا ہے کہ بھارت کو اس کا کریہہ چہرہ دکھایا جائے اور اپنے لیے آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

اس کتاب میں کشمیری عوام کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر مختلف سمتوں سے اپنی جدوجہد کا آغاز کریں اور بھارتی حکمرانوں کے قدم کشمیر سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔

فرناز نے کتابچہ پڑھتے پڑھتے صفحات سے نظریں ہٹائیں اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا اس کتابچے کے مطالعے سے وہ خود کو احمد کمال سے اور زیادہ قریب محسوس کرنے لگی تھی یہ کتابچہ اس کے جذبات کی بھی ترجمانی کرتا تھا وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کی حسین وادی بھارتی درندوں کے قبضے سے آزاد ہوجائے یہ کتابچہ احمد کمال اننت ناگ سے لایا تھا جو تحریک آزادی کشمیر کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جو احمد کمال کی طرف سے فرناز کو ایسا بیش قیمت تحفہ ملا تھا یہ اس کے لیے تحفہ محبت بھی تھا اور تحفہ نجات بھی۔

فریال کے مقابلے میں اس نے فرناز کو زیادہ بہتر تحفہ دیا تھا اس نے فریال کو دو تحفے دیے تھے ایک تحفہ تو وہ تین گڑیاں تھیں جو جدید فیشن کا لباس پہنے ہوئے تھیں اور جنہیں دیکھ کر لباس تیار کیے جاسکتے تھے دوسرا تحفہ ایک بنڈل تھا جس میں رنگین دھاگے اور ہاتھ سے کڑھائی کرنے کی سوئیاں تھیں فرناز کا اندازہ تھا کہ فریال کے تحائف گو کہ قیمت کے لحاظ سے برتر ہوں گے لیکن احمد کمال نے یہ تحفے دے کر ثابت کردیا تھا کہ وہ فریال کو محض ایک معمولی اور فیشن پسند لڑکی سمجھتا تھا جبکہ فرناز اس کی نظر میں ایک ذہین اور سنجیدہ لڑکی تھی اس خیال ہی نے فرناز کو مسحور کردیا تھا احمد کمال نے فریال کے تحفے بھی فرناز ہی کو دیے تھے اور انہیں فریال تک پہنچانے کی تاکید کی تھی کیونکہ ان دنوں کی منگنی ٹوٹ جانے کے بعد ان کے ملنے پر پابندی تھی۔

''فرناز تم نے اپنی کتابیں پورے کمرے میں کیوں بکھیری ہوئی ہیں؟'' اچانک اس کے والد اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی وہ کمرے میں فرش پر بکھری ہوئی کتابوں کو دیکھ رہے تھے والد کے اس طرح اچانک اپنے کمرے میں آجانے پر وہ بوکھلا گئی تھی اس نے جلدی سے کتابچہ بستر پر ڈال دیا تھا۔ جسے سلمان داؤد نے فوراً ہی اٹھالیا تھا اور جیب سے چشمہ نکال کر آنکھوں پر

لگاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس کی نظریں کتابچے کے عنوان پر تھیں اور ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''تمہیں یہ کس نے دیا؟'' انہوں نے سختی سے پوچھا۔

''یہ...... یہ مجھے ملا ہے......!'' فرناز نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کہاں سے، کہاں سے ملا ہے؟'' انہوں نے غصے سے پوچھا۔

''یہ...... یہ گھر کے سامنے دروازے کے قریب پڑا تھا۔'' اس نے جھوٹ بولا اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''ہوں، کسی مکار نے اسے خاص مقصد سے یہاں پھینکا ہوگا۔'' سلمان داؤد نے کہا۔

''بھلا کوئی ایسا کیوں کرے گا۔'' فرناز نے بلا سوچے سمجھے سوال داغ دیا۔

''تمہیں نہیں معلوم کوئی دشمن ہوگا جو یہ چاہتا ہوگا کہ میرے گھر کا کوئی فرد اسے اٹھالے لیکن میں تمہیں حکم دیتا ہوں فرناز کہ اس جھوٹ کے پلندے کو فوراً باہر پھینک دو۔''

''ک...... کیا...... یہ سب جھوٹ ہے ابو؟'' فرناز نے پوچھا۔ ''اس میں جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ یہ سچ ہے۔'' فرناز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''نہیں یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے فرناز۔ یہ درست ہے کہ ہماری حکومت سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم انہیں جواز بنا کر ملک میں انتشار پھیلائیں اور ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کریں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ابو؟''

''دیکھو فرناز میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔'' احمد کمال نے کمرے میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ فرناز بھی اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی اسے حیرت تھی کہ اس کے والد غصے میں ہونے کے باوجود بھی اسے سمجھانے والے انداز میں بات کررہے تھے۔

''فرناز احمد کمال جس کھیل میں شریک ہوگیا ہے اور کبھی سرینگر، کبھی اننت ناگ اور مختلف جگہوں پر جلسے جلوسوں میں شرکت کررہا ہے۔ کھیل بہت پرانا ہے اور بہت عرصے سے ہماری سرزمین پر کھیلا جارہا ہے اس کی ابتدا چند عاقبت نااندیشوں نے کی تھی وادی میں سکون اور خوش حالی تھی کہ چند لوگوں کے سر میں آزادی کا سودا سما گیا یہ تیرہ جولائی انیس سو اکتیس کی بات ہے جب حکومت نے ایک نوجوان عبدالقدیر پر بغاوت کا مقدمہ چلایا اور چند سرپھرے نوجوان اس کی حمایت میں جلوس نکال بیٹھے اس جلوس میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور حکام کو گولی چلانا پڑی اس موقع پر کچھ مسلمان شہید ہوئے اور کچھ زخمی پھر شہر میں مارشل لا لگا دیا تھا یہاں سے ریاست میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور اب ہر سال تیرہ جولائی کو یوم شہدا کشمیر منایا جاتا ہے۔''

سلمان داؤد بیٹی کو تحریک آزادی کی کہانی اپنے انداز میں توڑ مروڑ کر سنا رہے تھے اسے بتا رہے تھے کہ کشمیر کی حکومت چند جذباتی مسلمانوں کے ہاتھوں تباہی کے دوراہے پر کس طرح پہنچ گئی۔

فرناز خاموشی سے سن رہی تھی اتنا تو اسے بھی پتا تھا کہ 1947ء میں جب پاکستان وجود میں آیا جو کہ صرف اور صرف مسلمانوں کی جدوجہد کے سلسلے میں مسلمانوں کے لیے معرض وجود میں آیا تھا اور جس کی جدوجہد میں ہندوستان کے ہر علاقہ کے مسلمانوں نے حصہ لیا تھا اور اپنی جانوں کی قربانیاں دی تھیں تب کشمیر میں ہندو راجہ کی حکومت تھی بٹوارے میں کشمیر

پاکستان کے حصے میں آیا تھا لیکن اس ہندو راجہ نے اس تقسیم کو ماننے سے انکار کر دیا تھا بھارتی حکومت نے اس کا ساتھ دیا تھا اور تب سے ہی کشمیری اپنے حق آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں فرناز اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اس کے والد نے اپنی ادھوری بات دوبارہ شروع کی۔

''تمہیں تو یاد ہوگا یہ ابھی چند ماہ پہلے ہی کی بات ہے کہ آزادی کے متوالوں نے مسلمان سرکاری افسران کو بھی نہ بخشا انہیں تشدد کا نشانہ بنایا۔ بھلا یہ کیسی آزادی کی تحریک ہے جو اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو اپنے ہاتھوں مار دینے میں عار نہیں سمجھتی، اس تحریک ہی کی وجہ سے آج کشمیر میں کسی کی جان محفوظ نہیں ہے اور لاقانونیت کا راج ہے۔''

سلمان داؤد آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے اور فرناز بغور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس سے برخلاف کہ وہ کیا بات کر رہے تھے۔ وہ خود کو ان سے بہت قریب محسوس کر رہی تھی کیونکہ اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے والد نے اس سے اتنی توجہ سے بات کی تھی۔

''لیکن ابو آپ کو ایک مسلمان ہونے کے ناتے اس بات سے بھی انکار نہیں ہوگا کہ کشمیر کی حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔''

''وہ تو ہے۔'' سلمان داؤد نے کہا۔

''کہاں ہے؟ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن سربراہ مسلمان نہیں ہے یہاں بھارتی ایجنٹ مسلط ہیں۔'' فرناز نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''آپ جانتے ہیں کہ بھارتی فوجی کتنے سفاک اور ظالم ہیں عورتوں کی عزتیں ان سے محفوظ نہیں ہیں اور وہ کشمیریوں کو بے دریغ گولی مار دیتے ہیں۔''

''لیکن ایسا وہ مجبوراً کرتے ہیں تم خود ہی دیکھو جہاں کہیں فائرنگ کے واقعات ہوتے ہیں وہاں تحریک آزادی کے متوالوں نے ضرور کوئی گڑبڑ کی ہوتی ہے جس کو کنٹرول کرنے کے لیے فائرنگ کرنا پڑتی ہے میری بات کا یقین کرو ہماری ریاست کا سکون برباد کرنے والے یہ آزادی کے متوالے ہی ہیں۔''

''لیکن میں ایسے بہت سے واقعات دیکھ چکی ہوں جہاں کوئی آزادی کا متوالا نہیں ہوتا لیکن بھارتی فوجی وہاں بھی ظلم کرنے آجاتے ہیں ابھی پچھلے دنوں ہمارے گھر سے قریب ہی جو شادی ہو رہی تھی وہاں بھارتی فوجی گھس گئے اور لوگوں کو مارا ان میں سے کئی کو پکڑ کر لے حد تو یہ کہ دولہا کو بھی لے گئے اور بعد میں اسے گولی مار دی۔'' فرناز نے کہا اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''تم کچھ نہیں جانتی ہو، تمہیں حقیقت کا علم نہیں مجھ سے بحث مت کرو۔'' سلمان داؤد نے کہا اور کمرے سے نکل گئے فرناز حیرت سے انہیں جاتے دیکھتی رہ گئی تھی لیکن اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں احمد کمال سے ضرور بات کرے گی۔

فرناز یوں تو پندرہ سال کی تھی لیکن وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ لڑائی میں جب دو فریق شامل ہوں تو دونوں سچے نہیں ہوتے ان میں سے کوئی ایک جھوٹا ہوتا ہے پھر وہ کئی دن موقع کی تلاش میں رہی ایک روز موقع اسے مل ہی گیا اس کے والد ایک دن کے لیے سرکاری کام سے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے اور والدہ بھی اچھے موڈ میں تھیں چنانچہ وہ ان کے پاس آبیٹھی۔

''امی ایک بات تو بتائیں۔'' اس نے پیار سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کی والدہ نے پوچھا

''ابو نے خود ہی احمد کمال کو فریال کے لیے پسند

کیا تھا اور پھر کسی سے مشورہ کیے بغیر ہی اچانک فریال کی منگنی توڑ دی۔ آپ سے بھی نہیں پوچھا۔'' فرناز نے کہا۔

''تم جانتی ہو فرناز تمہارے والد تمام فیصلے خود ہی کرتے ہیں کبھی کسی سے مشورہ نہیں کرتے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ نے ان سے پوچھا بھی نہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے پوچھا تھا انہیں احمد کمال کی سرگرمیوں پر اعتراض ہے۔''

''سرگرمیاں، کیا مطلب؟'' فرناز نے پوچھا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس بارے میں کچھ بھی نہ جانتی ہو۔

''ہاں دراصل وہ تحریک آزادی کشمیر کا کارکن ہے اور تمہارے والد کو یہ بات پسند نہیں۔'' اس کی والدہ نے افسردگی سے کہا۔

''انہوں نے فریال سے بھی کچھ نہیں پوچھا اور وہ بھی خاموش کھڑی رہی اور کچھ کہے بغیر انگوٹھی اتار کر احمد کمال کو دے دی۔'' فرناز نے حیرت سے کہا۔

''اس نے ٹھیک کیا، ہر فرمانبردار اولاد ایسا ہی کرتی ہے۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

''امی آپ نے اتنی زندگی ابو کے ساتھ کیسے گزار لی؟'' فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایسے ہی گزار لی تابعداری کے ساتھ ان کے سارے حکم مانتے ہوئے۔'' اس کی والدہ نے جواب دیا۔

''صحیح اور غلط...... سارے حکم۔'' فرناز نے اعتراض والے انداز میں کہا۔

''فرناز وہ تمہارے والد ہیں تمہیں ان کے بارے میں اچھا ہی سوچنا چاہیے وہ جو بھی فیصلہ کریں گے ہم لوگوں کے لیے بہتر ہی ہوگا۔''

''شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔'' اس نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھی کیونکہ ابھی اسے ان سے احمد کمال کے گھر جانے کی اجازت لینا تھی۔

''اچھا ایک بات بتائیں کیا میں آج کچھ دیر کے لیے احمد کمال کے گھر چلی جاؤں؟'' اس نے پوچھا تو اس کی والدہ کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔

''کیوں، کس لیے۔'' انہوں نے پوچھا۔

''یونہی آنٹی سے ملنے کے لیے۔'' اس کا اشارہ احمد کمال کی والدہ کی طرف تھا۔

''لیکن اگر تمہارے والد کو پتا چل گیا؟''

''نہیں پتا چلے گا میں جلدی آجاؤں گی پھر پتا نہیں کبھی ملنا نصیب ہو یا نہ ہو فریال کا رشتہ تو ٹوٹ گیا ہے۔ میں آنٹی کو دلاسہ ہی دے آؤں، وہ ہمیں کتنا پسند کرتی ہیں انہیں افسوس تو ہوا ہوگا۔'' فرناز نے کہا۔

''اچھا جاؤ لیکن جلدی آجانا۔'' اس کی والدہ نے تاکید کی۔

''ٹھیک ہے۔'' فرناز نے سعادت مندی سے کہا اور پھر وہ تیار ہو کر احمد کمال کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

جب وہ احمد کمال کے گھر پہنچی تو اس کی والدہ فرناز کو برآمدے میں مل گئیں۔

''آؤ فرناز بہت دنوں بعد آئیں۔'' انہوں نے فرناز کو برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ان کا انداز بہت مشفقانہ تھا۔

''آنٹی، میں بہت شرمندہ ہوں۔'' فرناز نے بات شروع کی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات مکمل کرے۔

''کیوں...... کیوں شرمندہ ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ...... دراصل...... ابو نے فریال کی منگنی توڑ دی۔ احمد کمال کو تو بہت دکھ ہوا ہوگا وہ اسے بہت پسند

کرتا ہے۔'' فرناز نے کہا۔

''ہاں...... یہ منگنی بھی ان دونوں کی پسند کو دیکھتے ہوئے ہی کی گئی تھی۔'' احمد کمال کی والدہ نے کہا۔

''وہ کیسا ہے؟'' فرناز نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔'' احمد کمال کی والدہ نے رسمی سا جواب دیا پھر فرناز کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ منگنی توڑتے ہوئے انہوں نے مجھ سے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''انہوں نے امی سے بھی بات نہیں کی اور نہ ہی فریال سے کچھ پوچھا۔'' فرناز نے دکھ سے کہا۔

''انہوں نے اچھا نہیں کیا، ہمیں اپنی اولادوں کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے والدین ہی تو ہوتے ہیں جو اولادوں کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔'' انہوں نے افسوس سے کہا۔

''جی...... وہ...... میں...... میں خود حیران ہوں۔'' فرناز نے رک رک کر کہا اس وقت احمد کمال بھی وہاں آ گیا۔

''آؤ احمد، دیکھو فرناز آئی ہے، تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' احمد کمال کی والدہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور احمد کمال فرناز کے سامنے رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔

''ہم غریبوں کو کیسے یاد کرلیا۔'' احمد کمال نے فرناز کو چھیڑا۔

''احمد میں تمہارا دیا ہوا لٹریچر پڑھ رہی تھی تو ابو اچانک میرے کمرے میں آ گئے اور یہ دیکھ کر بہت چراغ پا ہوئے کہ میں وہ لٹریچر پڑھ رہی ہوں اور انہوں نے غصے سے کہا کہ میں وہ کتابچہ باہر پھینک دوں کیونکہ وہ جھوٹ پر مبنی ہے ان کے خیال میں تحریک آزادی میں حصہ لینے والے غلطی پر ہیں اور انہوں نے کشمیر کا سکون برباد کردیا ہے۔'' فرناز نے احمد کمال کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال پیش کردیا۔

''میں جانتا ہوں فرناز تمہارے والد نے اور کیا کیا کہا ہوگا، دراصل قصور ان کا بھی نہیں ہے وہ ریاست میں ایک سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں ان کی وفاداریاں حکومت کے ساتھ ہیں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے والد فطری طور پر ایک اچھے انسان ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ ہمارے مخالفین کے ہم خیال ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔'' احمد کمال نے کہا تو فرناز تذبذب میں پڑ گئی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط۔''

''کیا مطلب؟'' احمد کمال نے پوچھا۔

''میرے والد کا کہنا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی کشمیر میں قتل و غارت گری کا کھیل کھیل کر خوش ہونے والوں میں سے ہو اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تیرہ جولائی انیس سو اکتیس کو جلوس میں ہلاک ہونے والے محض جذباتی نوجوان تھے۔''

''مجھے یہ مت بتاؤ فرناز کہ تمہارے والد نے کیا کہا یہ بتاؤ کہ تم اپنی کھلی آنکھوں سے کیا دیکھتی ہو؟'' احمد کمال نے پوچھا۔

''میں تو یہی دیکھتی ہوں کہ مسلمان بالکل بھی محفوظ نہیں ہیں ہر طرف قتل و غارت گری ہے۔'' فرناز نے دکھ سے کہا۔

''اور تمہارے اردگرد آج جو ماحول ہے اس کا ذمہ دار کون ہے ہماری مسلمان خواتین کی کس کس طرح بے عزتی کی جاتی ہے ہمارے مسلمان مردوں سے بیگار لی جاتی ہے ہمیں مذہبی آزادی نہیں ہے ہم پر غیر مسلم حکمران مسلط ہیں۔ آخر کیوں، تمہارے والد نے 13 جولائی کو عبدالقدیر کے لیے ہونے والے

پرسکون مظاہرے کو منچلے نوجوانوں کا واویلا قرار دیا ہے جبکہ عبدالقدیر ایک جانباز تھا جس پر حکمرانوں نے غداری کا مقدمہ چلایا تھا اور مسلمان اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کے لیے کہہ رہے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ عبدالقدیر کو بند کمروں میں حکمرانوں کی مرضی سے ہونے والے یکطرفہ فیصلوں پر سزا دے دی جائے اور پرسکون مظاہرین پر ظالموں نے گولیوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔'' احمد کمال کا خوشگوار موڈ یک لخت بدل گیا تھا۔

''ایک بات بتاؤ احمد کمال جب ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان معرض وجود میں آیا تو کشمیر پاکستان کے حصے میں کیوں نہیں کیا گیا جبکہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور تقسیم بھی اسی بنیاد پر کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔'' فرناز نے پوچھا۔

''یہ ایک طویل کہانی ہے جو اب تک ختم نہیں ہوئی۔'' احمد کمال نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''جس وقت ہندوستان و پاکستان وجود میں آئے اس وقت کشمیر میں ایک ہندو راجہ ہری سنگھ کی حکومت تھی جسے برطانیہ نے ہی یہاں اقتدار میں بٹھایا تھا جب پاکستان بنا تو اس ہندو راجہ نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا کہ اس کا علاقہ پاکستان میں شامل کیا جائے اس نے باقاعدہ مخالفت کی اور ہندوستان کی نئی حکومت جو ہندو تھی اس نے بھی اپنی فوج کی مدد سے اس کا ساتھ دیا۔''

''تو کیا ہندوستان کی فوج اور راجہ ہری سنگھ کی فوج کشمیریوں سے لڑتی رہی اور وہ اکیلے اس کا مقابلہ کرتے رہے؟'' فرناز نے پوچھا۔

''نہیں، اس وقت پاکستان کے سربراہ قائداعظم محمد علی جناح تھے انہوں نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ اس موقع پر کشمیریوں کا ساتھ دے اس کے علاوہ گلگت اسکاؤٹ اور چترال اسکاؤٹ نے بھی کشمیریوں کا ساتھ دیا۔ انہوں نے کشمیر کے دو تہائی حصہ پر قبضہ بھی کرلیا لیکن پھر برطانیہ بیچ میں کود پڑا اور اس نے اقوام متحدہ کی مدد سے جنگ بندی کرادی اور ایک قرارداد منظور کرادی کہ بہت جلد انتخاب کرائے جائیں گے اور کشمیر کا فیصلہ کشمیر کے عوام کی مرضی سے کیا جائے گا۔ لیکن اس پر آج تک عمل نہیں کرایا جاسکا اور ہندوستان کا جو رویہ ہے وہ تمہارے اور ساری دنیا کے سامنے ہے، ہم اتنے طویل عرصے سے آزادی کے لیے جدوجہد کررہے ہیں لیکن ہماری پکار سننے والا کوئی نہیں۔'' احمد کمال نے کہا۔

''یہ تو سراسر زیادتی ہے۔'' فرناز نے کہا۔

''ہاں اور آپ کے والد فرماتے ہیں کہ ہم لوگ غلطی پر ہیں۔'' احمد کمال نے کہا۔

اس شام احمد کمال نے فرناز کو تحریک آزادی کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔

''احمد، میری خواہش ہے کہ کاش میں تمہارا ساتھ دے سکتی لیکن اپنے والد کی وجہ سے میں مجبور ہوں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی شرمندگی نہیں کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں بلکہ تم سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتی ہوں۔'' فرناز نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

''فرناز میں تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن محبت تو فریال سے ہے ممکن ہے میں کبھی اس کے خیال سے آزاد ہوجاؤں۔'' احمد کمال نے کہا۔

''آخر ایسی لڑکی سے محبت کرنے کا کیا فائدہ جو کسی کے کہنے پر تم سے منگنی توڑ بیٹھی ہو۔''

''پیار بڑی عجیب چیز ہے تمہیں نہیں معلوم تم اسے موم بتی کی طرح بجھا کر دوبارہ روشن نہیں کرسکتیں یہ تو

بس جلتا رہنے والا جذبہ ہے چاہے تم چاہو یا نہ چاہو اس کے علاوہ تمہیں ایک بات اور بتاؤں میں تم پر اعتماد کرتا ہوں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس روز انگوٹھی اتارنے کے بعد سے فریال مجھ سے کئی بار مل چکی ہے ہمیں یقین ہے کہ تمہارے والد کا غصہ جلد اتر جائے گا۔“

”نہیں...... احمد کمال نہیں...... تم انہیں نہیں جانتے وہ بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں انہیں اپنے اصول بہت پیارے ہیں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تم فریال کو بھی نہیں جانتے بہر حال کوئی بات نہیں میں دعا کروں گی کہ تم دونوں خوش رہو۔“ فرناز نے سر جھکا کر کہا اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک کر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے جنہیں احمد کمال نے بھی دیکھ لیا تھا لیکن اس نے فرناز سے کچھ نہیں کہا تھا۔

اس وقت احمد کمال کی والدہ چائے لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں اور فرناز نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے وہ خود کو پر سکون ظاہر کر رہی تھی۔

”لو بھئی مجھے کچھ دیر لگ گئی۔“ احمد کمال کی والدہ نے میز پر چائے رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے خوامخواہ زحمت کی آنٹی اس کی کیا ضرورت تھی؟“ فرناز نے کہا۔

”کیوں بھئی آنٹی کے گھر سے بغیر چائے پیئے چلی جاؤ کیا یہ اچھا لگے گا؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر وہ لوگ چائے پی ہی رہے تھے کہ احمد کمال کے والد اسحاق احمد بھی آ گئے اور فرناز کو دیکھ کر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اچھا تو آج ہمارے گھر فرناز بیٹی آئی ہے۔“

”جی ہاں اور اب واپس بھی جا رہی ہے۔“ احمد کمال کی والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے فرناز نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

”ارے بھائی بیٹھو میں تو ابھی آیا ہوں۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”نہیں انکل اب میں چلوں گی پھر آؤں گی۔“ فرناز نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

”تو چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“ اسحاق احمد نے کہا تو فرناز نے انکار نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی گھر سے باہر آ گئی اور ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”فرناز تم بہت پیاری بچی ہو۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”پیاری اور میں، نہیں میں پیاری نہیں ہوں یہ بات کمال بھی خوب جانتا ہے۔“ فرناز نے تلخ لہجے میں کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”وہ تو احمق ہے۔“ انہوں نے گاڑی ایک موڑ سے موڑتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پتا ہے میں دھاتوں کا بیوپاری بھی ہوں اور دھاتوں کا ہنر مند بھی اور جس کا تعلق دھاتوں سے ہو وہی جانتا ہے کہ سونے کے ٹھوس سکے کی قیمت کیا ہوتی ہے تمہاری بہن خوب صورت ہے لیکن تم اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو، دھاتیں ٹھوس ہوتی ہیں اور اپنی اصلیت برقرار رکھتی ہیں تم میرے لیے خالص سونا ہو۔“

”شکریہ جناب۔“ فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آؤ، میں تمہیں اپنا شوروم دکھاؤں یہاں تمہارے لیے ایک تحفہ بھی ہے۔“ انہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے ایک بڑے سے دھاتی برتنوں کے شوروم کے سامنے کھڑی کر دی۔

”لیکن مجھے دیر ہو جائے گی۔“ فرناز نے کہا۔

”ارے نہیں ہو گی، اسحاق احمد نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا پھر وہ گھوم کر فرناز کی طرف والے دروازے پر آئے تھے اور اس کے اترنے کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

”ہم اس شوروم کے پچھلے حصے میں دھاتوں کے اعلیٰ نمونے بناتے ہیں۔“

”انکل آپ کو پتا ہے ابو بہت غصہ کریں گے۔“

”میں جانتا ہوں تمہارا باپ اپنے دقیانوسی خیالات پر بڑی سختی سے قائم ہے لیکن بس ذرا سی دیر لگے گی میں دراصل تمہارا تحفہ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔“

”جی۔“ فرناز نے آہستہ سے کہا اور گاڑی سے اتر گئی۔

اسحاق احمد کے ساتھ وہ جونہی ان کے شوروم میں داخل ہوئی تھی وہاں موجود ایک شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا شوروم میں مختلف دھاتوں کے برتن اور نمونے بڑے قرینے سے سجے ہوئے تھے ان میں بعض پیتل، تانبے، اسٹیل کے تھے اور بعض خالص سونے اور چاندی کے بھی تھے بعض میں دھاتوں کے ساتھ ساتھ مختلف قیمتی پتھر بھی استعمال کیے گئے تھے چنانچہ اسحاق احمد نے یہاں کل وقتی ایک چوکیدار رکھا ہوا تھا۔ ہندو واڑہ میں یہ سب سے بڑا شوروم تھا۔

”یہ تو بہت قیمتی ہیں۔“ فرناز نے کہا۔

”ہاں ان میں سے بعض کی قیمتیں تو کئی لاکھ تک جاتی ہیں۔“ اسحاق احمد نے فخر سے کہا۔

پھر انہوں نے فرناز کو شوروم میں ایک سمت بچھے ہوئے صوفے پر بٹھا دیا تھا اور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو اشارہ سے قریب بلایا تھا۔

”جی سر۔“ اس شخص نے قریب آ کر بڑے ہی مودبانہ انداز میں سلام بھی کیا تھا۔

”وہ کل جو پلیٹ والا آئٹم تیار کیا ہے وہ لاؤ اور چائے بھی لے آنا۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”انکل ابھی تو چائے پی ہے، چائے کی کیا ضرورت ہے۔“ فرناز نے کہا۔

”بھئی میرے شوروم پر تم پہلی بار آئی ہو چائے تو ضرور پینا پڑے گی۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں اسحاق احمد کا ملازم ایک خوب صورت ڈبہ لے کر آیا تھا اور اسحاق احمد کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

”یہ لیجیے سر چائے بھی آ رہی ہے۔“ اس نے کہا اور پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ اسحاق احمد نے وہ ڈبہ فرناز کی طرف بڑھا دیا تھا اور جب فرناز نے اسے کھول کر دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گئی تھی اس ڈبے میں چاندی کی ایک خوب صورت پلیٹ بڑے قرینے سے سجا کر رکھی گئی تھی جس پر فرناز کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔

”اوہ، یہ تو بہت خوب صورت اور قیمتی ہے۔“ فرناز نے خوش ہوتے ہوئے کہا لیکن اس نظریں پلیٹ کے ساتھ ساتھ شوروم میں بیٹھے چوکیدار کی طرف بار بار اٹھ رہی تھیں کیونکہ وہ اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا پھر فرناز نے اسے پہچان لیا تھا وہ ظفر حسین تھا اور کافی عرصہ پہلے اس کے والد کا ملازم رہ چکا تھا اور اس کے والد نے معمولی رقم چوری ہونے کے شبے میں اسے جیل میں ڈلوا دیا تھا فرناز کو یاد تھا کہ اس نے اپنے والد کی بہت منتیں کی تھیں کہ وہ ظفر کو معاف کر دیں لیکن انہوں نے اسے معاف نہیں کیا تھا کسی کو معاف کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا فرناز کی نگاہوں کے تعاقب میں اسحاق احمد کی نظر بھی ظفر حسین کے چہرے پر گئی تھی اور اس سے ٹپکتی نفرت کو انہوں نے پڑھ لیا۔

”ظفر تمہارے جیل جانے کا معاملہ اب پرانا ہو چکا ہے تم سن رہے ہو، اب اس بات کو تم بھول جاؤ۔“ اسحاق احمد نے کہا۔

”اسحاق صاحب یہ ٹھیک ہے کہ آپ ایک اچھے

انسان ہیں لیکن جب میں سلمان داؤد کی کسی بیٹی کو اعلیٰ ریشمی لباس پہنے خوش وخرم دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی بیٹی فرزانہ یاد آجاتی ہے جو فاقوں سے مرگئی تھی کیونکہ اس کا باپ جیل میں تھا اور اس کی ماں اسے روٹی فراہم نہیں کرسکی تھی۔'' ظفر نے حقارت سے کہا۔

''ظفر۔'' اسحاق احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

''نہیں انکل اسے بولنے دیں۔'' فرناز نے کہا اور ظفر کے نزدیک چلی گئی وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

''میرے والد نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی میں اس کے لیے تم سے معافی چاہتی ہوں میں نے اس وقت بھی ان سے التجائیں کی تھیں کہ وہ تمہیں معاف کردیں لیکن انہوں نے میری بات نہیں سنی بھی اس کے علاوہ غلطی پر تم بھی ہو کیونکہ تمہاری مجرم میں نہیں ہوں۔'' فرناز نے کہا اچانک وہ شوروم کا دروازہ کھلنے کی آواز پر مڑی تو اس کی نظر احمد کمال پر پڑیں۔

''خدا کا شکر ہے کہ آپ لوگ یہاں پر مل گئے میں تو پریشان ہوگیا تھا۔'' اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' اسحاق احمد نے پوچھا۔

''سارے شہر میں حالات خراب ہوگئے ہیں آپ کو یاد ہوگا آپ نے کہا تھا کہ کچھ عناصر ایسے ہیں جو ہمارے، ہم نوا بن کر سارے شہر میں تشدد کی وارداتیں کرتے ہیں ان کا نشانہ امیر لوگ اور اعلیٰ سرکاری افسران بنتے ہیں ایسے ہی ایک گروپ نے اعلیٰ سرکاری افسران کے رہائشی علاقوں میں کارروائیاں شروع کردی ہیں آج صبح انہوں نے امیر گھرانوں کی چند عورتوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔'' احمد کمال نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔

''ابو آپ جلدی کریں اور شوروم بند کردیں۔'' احمد کمال نے کہا۔

''بہت خوب۔'' ظفر حسین نے خوشی کا اظہار کیا۔

''کیوں بھئی تم کیوں خوشی کا اظہار کررہے ہو؟'' اسحاق احمد نے پوچھا۔

''صحیح ہے یہی ہونا چاہیے۔'' ظفر حسین نے پھر جوشیلے انداز میں کہا۔

''نہیں ظفر، ہمارے نظریات جدوجہد آزادی سے ضرور تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمارا طریقہ کار مختلف ہے۔'' اسحاق احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''پھر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے حکومت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے صرف مظاہرے کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں ہمارا مقصد کسی کو تکلیف پہنچانا ہرگز نہیں۔'' اسحاق احمد نے کہا اور پھر احمد کمال کی طرف مڑے۔

''تم جاؤ فوراً فرناز کو اس کے گھر تک پہنچادو۔''

''جی بہتر۔'' احمد کمال نے سعادت مندی سے کہا۔

''میں آپ سے گھر پر آکر ملتا ہوں میرا خیال ہے تنظیم کے دوسرے لوگوں سے فوراً رابطہ قائم کرنا چاہیے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اسحاق احمد نے کہا۔

فرناز احمد کمال کے ساتھ شوروم سے نکل گئی تھی اور عجلت میں وہ چاندی کی پلیٹ بھی ساتھ لے جانا بھول گئی جو اسحاق احمد نے اسے تحفے میں دی تھی اسے فکر تھی کہ جلدی گھر پہنچ جائے تاکہ اپنے والد کے گھر آنے سے پہلے وہ وہاں موجود ہو۔

''فرناز اپنے والد سے کہنا کہ ان دنوں سرکاری گاڑی میں سفر کرنے سے پرہیز کریں کیونکہ مظاہرین سرکاری گاڑیوں کو نشانہ بنا رہے ہیں اس کے علاوہ کوئی امیر شخص محفوظ نہیں ہے۔ اپنے والد سے یہ بھی کہہ دینا کہ وہ کسی بھی حالت میں تمہیں فریال کو ساتھ لے کر گھر سے نہ نکلیں۔'' احمد کمال نے

اسے تاکید کی۔

''میں کہہ دوں گی۔'' فرناز نے کہا۔

احمد کمال نے اسے اور اور بھی کچھ ہدایات کی تھیں اور پھر گھر کے باہر اسے ڈراپ کرکے واپس چلا گیا تھا جب فرناز گھر پہنچی تو اس کے والد واپس نہیں آئے تھے اس نے اپنی والدہ کو اسحاق احمد اور ان کی بیوی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور چاندی کی اس پلیٹ کے بارے میں بھی بتایا جو اسحاق احمد نے بڑی محنت سے خاص اس کے لیے تیار کی تھی۔

''یہ فیملی بہت اچھی ہے اسحاق احمد بچپن سے تمہارے والد کے دوست رہے ہیں اب نجانے دونوں میں کیا غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔'' فرناز نے والدہ نے اسے بتایا۔

پھر فرناز نے اپنی والدہ کو احمد کمال کی بتائی ہوئی ہدایات کے بارے میں بھی بتایا تھا جس پر انہوں نے کہا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے والد یہ پابندی نہیں مانیں گے لیکن تم انہیں بتادینا پھر جب یہ بات فرناز نے اپنے والد کو بتایا تو وہ حسب توقع چراغ پا ہوگئے تھے۔

''بہت خوب تو اب ہم ان تشدد پسندوں سے ڈر کر زندگی گزاریں گے؟'' اس کے والد نے حقارت بھرا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ابو احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے؟'' فرناز نے کہا۔

''ہاں تم بھی احمد کمال کی زبان میں بات کرنے لگیں تم سب احمق ہو، ان باتوں سے وہ ہمیں ڈراتے ہیں۔'' اس کے والد نے غصے سے کہا تو فرناز خاموش ہوگئی۔

دوسرے دن اسحاق احمد نے جان بوجھ کر پروگرام بنایا اور فرناز اور فریال کو ساتھ لے کر سرکاری گاڑی میں گھر سے نکل گئے دونوں بہنیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں اور سلمان داؤد ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے گاڑی گھر سے نکل کر اگلی سڑک تک آئی تھی کہ ایک سمت سے پتھر آیا اور گاڑی کا اگلا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا سامنے بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا جن کے تیور اچھے نہیں تھے اور وہ حکومت کے خلاف نعرے لگارہے تھے پھر تیزی سے دو پتھر اور آئے جن میں سے ایک گاڑی کا دوسرا شیشہ توڑتا ہوا سلمان داؤد کی پیشانی پر لگا اور خون بہنے لگا۔ فرناز نے باہر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ اس ہجوم کا لیڈر ظفر حسین تھا گھبراہٹ میں ڈرائیور نے گاڑی کے بریک پر پاؤں رکھ دیا گاڑی ایک دیوار سے ٹکرا کر رک تو گئی بپھرا ہوا ہجوم گاڑی کی طرف بڑھنے لگا کچھ لوگ بازار کی دکانوں میں توڑ پھوڑ کررہے تھے فرناز اور فریال خوف سے کانپ رہی تھیں کہ اچانک احمد کمال ہجوم سے نکل کر گاڑی کے سامنے آگیا اس کے ساتھ اس کے کچھ ساتھی تھے پھر وہ لوگ ہجوم کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے کی طرف دھکیلنے لگے۔

''رکو، رک جاؤ۔'' احمد کمال دہاڑ رہا تھا اس کے ساتھی بھی چیخ چیخ کر ہجوم کو رکنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

''احمد کمال، ہمارا خیال تھا کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔'' ظفر حسین نے غصے سے چیخ کر کہا۔

''ہاں...... لیکن بزرگوں اور عورتوں کو ظلم کا نشانہ بنانے کی میں اجازت نہیں دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی طاقت بھارتی غاصبوں کے لیے محفوظ رکھو تاکہ یہ ثابت کرسکو کہ تم بہادر جوان ہو اور غیرت اور انسانیت تمہارا طرۂ امتیاز ہے۔'' احمد کمال نے کہا۔

مجمع رک گیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تو احمد کمال گاڑی کے قریب آیا۔

"میں نے منع کیا تھا فرناز میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔" احمد کمال نے کہا اور فرناز اپنے والد کی طرف دیکھنے لگی جنہوں نے اس کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا تھا پھر احمد کمال گاڑی میں بیٹھ گیا اور اس کے ڈرائیور سے گاڑی واپس گھر کی طرف موڑنے کے لیے کہا۔

"حالات ٹھیک نہیں ہیں ابھی کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔" احمد کمال نے سنجیدگی سے کہا وہیں پر سلمان داؤد نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی سلمان داؤد کے گھر کے دروازے پر جا رکی تھی۔

"تم نے جو ہم سب کی مدد کی اس کے لیے میں تمہارا مشکور ہوں لیکن جب تک تم اپنے نظریات نہیں بدلو گے تب تک ہمارے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی۔" سلمان داؤد نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"میرے نظریات اپنی جگہ مستحکم ہیں جناب اور میرا خیال ہے آپ کو اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنا چاہیے کیونکہ وہ نہ صرف آپ کے بلکہ فریال کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔" احمد کمال نے کہا اور سلمان داؤد سے رخصتی مصافحہ کر کے روانہ ہو گیا۔

فرناز کے دل کو اچانک دھچکہ سا لگا کیونکہ احمد کمال نے صرف فریال کا نام لیا تھا کیونکہ فرناز کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

اس رات جب وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر لان کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں درختوں اور گھاس پر برف پڑی ہوئی تھی تو اس نے اچانک سرگوشی کی مدھم سی آواز سنی اس نے غور سے دیکھا تو اسے درختوں کے نیچے دو انسانی ہیولے دکھائی دیے وہ کمرے سے نکل کر خود کو چھپاتی ہوئی دبے قدموں سے اس طرف گئی اور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑی ہو گئی۔

"مت جاؤ احمد۔" فریال کہہ رہی تھی۔

"میں مجبور ہوں فریال ہمارے لیڈر نے مجھے اننت ناگ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ میں وہاں تنظیم کے دوسرے ارکان کے ساتھ رابطہ کر سکوں۔"

"یہ تمہیں تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے کاش وہ سب...... سب مر جائیں۔" فریال نے روتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو ان سب میں، میں بھی شامل ہوں گا فریال کیونکہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔" احمد کمال نے کہا۔

"کاش میں نے تم سے محبت نہ کی ہوتی تمہیں پتا ہے میں اکثر خواب دیکھتی ہوں کہ تمہیں پولیس والوں نے پکڑ لیا ہے اور وہ تمہیں پھانسی کے تختے کی طرف لے جا رہے ہیں کیا تم اس پاگل پن سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے، دیکھو سب امیر اور بڑے لوگ ہمارے ساتھ ہیں اور تمہاری طرف صرف غریب بھیک منگے، کنگال کلرک، ملازم پیشہ اور قیدی ہیں آخر تم ان کے ساتھ کھڑے ہونا بھی کیسے گوارا کرتے ہو۔؟" فریال نے جرح کی۔

"کچھ بھی سہی۔ ہمارے پاس کسی سے چھینی ہوئی ایسی دولت نہیں ہے جس کا حساب دینا ہمارے لیے مشکل ہو۔"

"واقعی تم پاگل ہو میرے والد نے اچھا کیا کہ تم سے میری منگنی توڑ دی۔" فریال نے کہا۔

"یہ بات ہے تو میرا خیال ہے کہ تمہارے والد کا فیصلہ درست ہے۔" احمد کمال نے افسردگی سے کہا اور جانے کے لیے مڑا لیکن فریال نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چاہے تم پاگل ہو یا غدار، میں تم سے محبت کرتی

ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے کہا اور احمد کمال نے اس کا چہرہ ہاتھ میں لے کر اوپر اٹھایا فرناز مزید وہاں کھڑی نہ رہ سکی اور تیزی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی وہ بستر پر لیٹی تو ایک بار پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

دوسرے روز سے فریال اپنے والد سے ضد کرنے لگی کہ انہیں اپنے خاندان کے ساتھ اننت ناگ منتقل ہو جانا چاہیے کیونکہ حریت پسندوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہاں انہیں حکومت کی زیادہ مدد حاصل ہو سکے گی۔ پھر وہاں ان کے کئی رشتہ دار بھی تھے۔ سلمان داؤد کے لیے اننت ناگ اپنا تبادلہ کرانا مشکل تھا شہر کے حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بیوی اور بیٹیوں کو اننت ناگ بھجوا دیا اور خود ہتھیاروں سے لیس ہو کر تنہا گھر پر رہ گئے۔

اننت ناگ میں فریال، فرناز اور ان کی والدہ سلمان داؤد کے رشتے کے بھائی نصیر الدین کے گھر ٹھہری تھیں۔ نصیر الدین خود حکومت کا زبردست حامی تھا اس کا بیٹا بصیر الدین فوج میں کیپٹن تھا بیٹی شاہانہ سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ فریال اور فرناز جلدی ہی اس سے بے تکلف ہو گئیں اور پہلی ہی ملاقات ہی میں فریال نے شاہانہ کو احمد کمال کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کیونکہ ان کے اننت ناگ پہنچنے سے پہلے ہی سلمان داؤد ٹیلی فون پر نصیر الدین کو فریال اور احمد کمال کی منگنی ٹوٹنے کے بارے میں بتا چکے تھے انہوں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اگر احمد کمال اننت ناگ میں دیکھا جائے تو اسے کسی حال میں بھی فریال سے ملنے نہ دیا جائے۔

اس تنبیہ کے باوجود احمد کمال فریال اور فرناز کے اننت ناگ پہنچنے کے دوسرے ہی دن نصیر الدین کے گھر جا پہنچا دروازے پر اسے فرناز مل گئی اس نے بتایا کہ اس کے والد نے اس کے لیے اتنے سخت احکامات صادر کیے ہیں۔

"نجانے کیوں تمہارے والد نے مجھ سے مخالفت پال لی ہے۔" احمد کمال نے کہا۔

"میں انہیں جانتی ہوں اپنی ضد کے پکے اور اپنے اصولوں پر کاربند رہنے والے آدمی ہیں۔" فرناز نے جواب دیا۔

"مجھے حیرت ہے اتنا اصول پسند شخص جو مسلمان بھی ہے اس غاصب حکومت کا حامی کیسے ہو گیا؟" احمد کمال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"دراصل ان کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔" فرناز نے آہ بھری۔

"فرناز تم دیکھنا ایک وقت آئے گا جب انہیں اپنا نقطہ نظر بدلنا ہو گا بھارتی غاصب برسوں سے جموں و کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں وہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ظلم و تشدد کے واقعات پہلے اتنے شدید نہیں تھے جتنے اب ہیں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اب کشمیری عوام نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ جموں و کشمیر کو غاصب بھارتی حکمرانوں اور فوجیوں سے آزاد کرا کر ہی رہیں گے کشمیر ایک آزاد مملکت ہو گا یا پھر اس کا الحاق پاکستان سے ہو گا اب جگہ جگہ جلسے جلوس ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں وادی میں کشیدگی کی کیفیت ہے بھارتی فوج اپنی پوری قوت کے ساتھ نہتے مسلمانوں کو کچلنے پر تل گئی ہے اور مسلمان محض اپنی چند تنظیموں کی مدد سے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

"احمد کمال مجھے تو ڈر لگتا ہے اب کیا ہو گا؟ اب اس وادی میں جو اپنے حسن اور دلفریب مناظر کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے کیا خون کی ہولی کھیلی

جائے گی۔" فرناز نے اداسی سے کہا۔

"وہ تو کھیلی جا رہی ہے۔ تم اداس مت ہو اب تو صبح ہو رہی ہے اب آزادی کا سورج طلوع ہو رہا ہے، بس چند گھڑیوں کی رات باقی رہ گئی ہے۔" احمد کمال نے پر امید لہجے میں کہا۔

"کل آؤ گے؟" فرناز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں کل اسی وقت آؤں گا فریال کو میرا اسلام کہنا۔" احمد کمال نے معنی خیز انداز میں کہا اور تیزی سے گھر کے باہر نکل کر سڑک کے اندھیرے میں آگے بڑھ گیا۔

وہ کئی بار اس طرح فرناز سے ملا۔ اننت ناگ آنے کے بعد سے اس نے فریال سے ملاقات نہیں کی تھی اور فریال کیپٹن بصیر الدین سے زیادہ متاثر نظر آتی تھی فرناز کا دل چاہتا تھا کہ احمد کمال کو اس تبدیلی کے بارے میں بتا دے لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ احمد کمال کو اداس کرے وہ نہیں چاہتی تھی کہ احمد کمال فریال کی طرف سے دلبرداشتہ ہو۔ کیونکہ اس طرح اس کا مشن متاثر ہو سکتا تھا۔ جو فرناز کو کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔

سلمان داؤد کے گھر والوں کو اننت ناگ آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ بھارتی فوجیوں اور تحریک آزادی کے رضا کاروں کے درمیان زبردست معرکہ آرائی شروع ہو گئی حریت پسندوں نے اپنے مطالبات کی حمایت میں ایک پرامن جلوس نکالا تھا جس پر بھارتی فوجیوں نے گولی چلا دی تھی اور جس کے نتیجے میں پینتیس مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ احمد کمال دوسرے رضا کاروں کے ساتھ گلی کوچوں میں چھپتا پھر رہا تھا اور سفاک بھارتی فوجی پاگل کتوں کی طرح اس کی اور اس کے ساتھیوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ان کے درمیان کچھ کچھ وقفوں کے بعد فائرنگ کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا اس کے نتیجے میں کسی سمت سے انسانی کراہ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ جو کسی مرنے یا زخمی ہونے والے کی نشاندہی کرتی تھی ان میں بھارتی فوجی بھی تھے اور حریت پسند جیالے نوجوان بھی۔

احمد کمال کافی دیر سے ایک گلی کے کونے پر دم سادھے کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی احمد کمال جہاں تھا وہاں سے بھارتی فوجی صرف سو گز کے فاصلے پر تھے اس نے خود کو اور بھی احتیاط سے دیوار کی آڑ میں چھپا لیا پھر جونہی اس نے گردن نکال کر باہر سڑک کی طرف جھانکا بھارتی فوجی کی طرف سے فائرنگ پھر شروع ہو گئی تھی احمد کمال مڑ کر گلی میں دوڑنے لگا معاً اسے اپنے سر کے پچھلے حصے میں درد کی شدید لہر محسوس ہوئی اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا اور فرناز اس کے قریب موجود تھی۔

"تم۔" احمد کمال نے حیرت سے کہا اور فرناز کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"خدا کا شکر ہے تم ٹھیک ہو۔" فرناز نے کہا۔

"لیکن...... میں...... میں تو......!"

"تم گلیوں میں بھارتی فوجیوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بے ہوش ہو گئے تھے۔" فرناز نے کہا۔

"ہاں شاید میرے سر میں گولی لگی تھی۔" احمد کمال نے اپنا ہاتھ سر کی جانب لے جاتے ہوئے کہا۔

"گولی لگی نہیں تھی صرف سر کے پچھلے حصے کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔" فرناز نے کہا اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص کمرے میں داخل ہوا اس کا قد قدرے پستہ تھا لیکن وہ صحت مند اور سرخ و سفید رنگت کا مالک تھا اس نے بھی احمد کمال جیسا خاصا بڑا سا چوغہ پہنا ہوا تھا جو جہادیوں کی خاص پہچان تھی۔

"نیاز احمد تم؟" احمد کمال نے کہا وہ اس کا جہادی ساتھی اور دوست تھا اور اس گھر میں احمد کمال کئی بار آ چکا تھا۔

"میں بھی کتنا احمق ہوں۔" احمد کمال نے کمرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں ہزار بار آیا ہوں لیکن اس وقت اس جگہ کو پہچان ہی نہیں سکا۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" نیاز احمد نے جواب دیا اور احمد کمال کے سر پر بندھی پٹی کو تھپتھپایا۔

"ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ خدا نے تمہیں بال بال بچا لیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن فرناز یہاں کیسے؟" احمد کمال نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، فائرنگ کی آواز نصیر الدین کے گھر کی طرف بھی آ رہی تھی جھگڑے کے بارے میں سن کر اور فائرنگ کی آواز سے پریشان ہو کر یہ تمہیں ڈھونڈنے نکل پڑی۔ جس وقت تم بے ہوش ہو کر زمین پر گرے یہ وہاں پہنچ گئی تھیں یہ اتفاق ہی تھا کہ اتنی جلدی تم تک پہنچ گئی پھر میں نے دیکھا کہ یہ تمہیں اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں جو ظاہر ہے اس کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ میں نے اس کی مدد کی۔ یہ تو تمہیں اپنے ساتھ نصیر الدین کے مکان پر لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا اور تمہیں اپنے گھر لے آیا انہیں بھی ایسے حالات میں، میں نے واپس بھیجنا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ تمہارے ساتھ انہیں بھی یہاں لے آیا۔" نیاز احمد نے بتایا۔

"تم نے بہت اچھا کیا۔" کمال نے کہا پھر وہ فرناز کی طرف مڑا۔

"لیکن تمہیں یہ کیا سوجھی یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں تمہیں وہاں مل جاتا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟" احمد کمال نے کہا۔

"تو کوئی فرق نہیں پڑتا احمد، میرا خاندان یہاں صدیوں سے آباد ہے میں اچھی طرح جان گئی ہوں کہ بھارتی فوجی مسلمانوں پر کس طرح ظلم ڈھاتے ہیں میں تمہارے ساتھ اس جدوجہد آزادی میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔" فرناز نے وہ کہہ دیا جس کی احمد کمال کو اس سے توقع نہیں تھی۔

"نہیں فرناز، یہ ممکن نہیں ہے، تم ہمارا ساتھ نہیں دے سکو گی۔" اس نے کہا۔

"اگر یہ بات تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ میں سلمان داؤد جیسے اعلیٰ افسر کی بیٹی ہوں تو تم غلطی پر ہو تم شاید یہ نہیں جانتے کہ میرے خیالات ان سے بہت مختلف ہیں۔" فرناز نے کہا۔

"لیکن میں جانتا ہوں کہ تم سلمان داؤد، نصیر الدین، کیپٹن بصیر، فریال اور اپنی والدہ سے الگ نہیں ہو سکتیں اور ان میں سے کوئی بھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ تم جدوجہد آزادی میں شریک ہو۔" احمد کمال نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"ان کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" فرناز نے کہا۔

"ایسا کرو کہ تم اب گھر جاؤ، تمہیں نیاز چھوڑ آئے گا۔" احمد کمال نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا فرناز خاموش ہو گئی تھی اور احمد کمال اس کے رخصت ہونے تک اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرناز اسے چاہتی ہے اور اگر وہ فریال کا تذکرہ کرے گا تو اسے دکھ ہو گا جب وہ اننت ناگ آیا تھا تو فریال نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی جبکہ فرناز گھر والوں کی ناراضگی مول لے کر بھی بہرحال اس سے ملنے آئی تھی۔

"فریال ٹھیک ہے اور خوشی بھی ہے۔" فرناز نے جیسے احمد کمال کے دل کی بات پڑھ لی اور احمد کمال نے آہستگی سے اثبات میں گردن ہلادی پھر فرناز نیاز کے ساتھ چلی گئی تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو نصیرالدین غصے میں تھے اور اس کی ماں پر گرج رہے تھے کہ انہوں نے فرناز کو گھر سے باہر کیوں جانے دیا۔

"انکل میں آگئی ہوں۔" اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کہا اور نصیرالدین تیزی سے اس کی طرف مڑے۔

"میں معافی چاہتی ہوں کہ میرے اس عمل سے آپ کو تکلیف پہنچی لیکن میں مجبور ہوں آپ کو صرف یہ اطمینان دلاسکتی ہوں کہ نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا، آپ کی پوزیشن محفوظ ہے۔ میں احمد کمال سے محبت کرتی ہوں اور اس سے ہی ملنے گئی تھی۔" فرناز نے کہہ تو دیا لیکن وہ خود حیران تھی کہ اس میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی۔

"کیا کہا؟" گویا اس کمینے نے یہاں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا۔" نصیرالدین دہاڑے۔

"تم جانتی ہوں کہ وہ فریال کا منگیتر تھا اور تمہارے والد نے اس سے فریال کی منگنی توڑ دی تھی اس سے بچانے کے لیے ہی تمہارے والد نے تم لوگوں کو یہاں میرے پاس بھیجا تھا اس کے باوجود......!" نصیرالدین غصے سے پاگل ہورہے تھے۔

"امی، میں جانتی ہوں کہ ہم جیسے امیر گھرانے میں میرا یہ فعل اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا لیکن احمد کمال کو چاہنے کا آپ کو بتانے میں میں نے دھوکے فریب کا سہارا نہیں لیا۔" فرناز نے کمرے میں موجود اپنی والدہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم یہ بات آسانی سے سمجھ سکتی ہو کہ یہ معاملہ میرے بس سے باہر ہے۔" نصیرالدین نے فرناز کی والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اور میرا فیصلہ ہے کہ دونوں بیٹیوں کو اپنے باپ کی نگرانی میں ہی رہنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے انکل میں اپنا سامان پیک کرتی ہوں۔" فرناز نے کہا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

ان کے واپس ہندوواڑ جانے کا فیصلہ تین دن بعد کردیا گیا جانے سے پہلے فرناز ایک بار پھر رات کی تاریکی میں احمد کمال سے ملی وہ نیاز احمد کے گھر پر اس سے ملنے چلی گئی تھی احمد کمال دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"فرناز تم یوں گھر سے تنہا مت نکلا کرو حالات اچھے نہیں ہیں خاص طور پر تمہارے لیے کیونکہ لوگ تمہارے خاندان کو مسلمانوں کا غدار اور حکومت کا وفادار سمجھتے ہیں۔" احمد کمال نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور فرناز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"یہ سب میں بھی جانتی ہوں لیکن میں مجبور ہوں میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔" فرناز نے جواب دیا۔

"فرناز احمقوں والی بات مت کرو، تم کیا سمجھتی ہو کیا محبت کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے احمد، میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ اب میں تم سے ملنے نہ آسکوں گی کیونکہ انکل مجھے واپس ابو کے پاس بھیج رہے ہیں۔" فرناز نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تمہارے لیے شاید بہتر بھی یہی ہے کیونکہ کل رات بھارتی فوجیوں نے مسلمانوں کے جو گھر جلائے تھے اس کے جواب میں کل ہی رات کو سرینگر میں حریت پسندوں نے سینٹرل ریزرو پولیس فورس کے مواصلاتی اسٹیشن پر راکٹوں سے حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں ایک فوجی ہلاک اور چھ زخمی ہوئے ہیں۔ اب

سرینگر، اننت ناگ اور کئی دوسرے علاقوں میں فوجی دستوں اور حریت پسندوں میں جھڑپیں ہورہی ہیں۔ ایسی صورت میں میں تم سے ویسے بھی نہیں مل سکوں گا کیونکہ میرے سپرد بھی ایک اہم مشن کیا گیا ہے۔"

دوسرے ہی روز نصیرالدین نے فرناز، فریال اور ان کی والدہ کو واپس روانہ کردیا تھا جس وقت وہ روانہ ہوئیں کیپٹن بصیرالدین گھر پر موجود نہیں تھا کیونکہ اننت ناگ میں ہونے والی گڑبڑ کے سلسلے میں اسے مختلف ذمہ داریاں سونپ دی گئی تھیں۔

اپنے گھر پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنے والد سلمان داؤد کی جو حالت دیکھی وہ انہیں حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھی ان پر نجانے کیا مصیبت آپڑی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں سے بھی خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹ گئے تھے۔

"کیا بات ہے سلمان تم ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟" فرناز کی والدہ شوہر کی طرف بڑھیں تو وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"جاؤ...... جاؤ...... یہاں سے چلی جاؤ۔" انہوں نے خوفزدہ انداز میں چیخ کر کہا اور فرناز کی والدہ کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔

"ابو کیا بات ہے، آپ کو کیا ہوگیا ہے۔" فریال نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو فریال۔" فرناز موقع کی نزاکت کو کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بولی پھر وہ آگے بڑھی اور دھیمے لہجے میں اپنے والد کو مخاطب کیا۔

"ابو میں آپ کی بیٹی فرناز ہوں، ہم لوگ اننت ناگ سے واپس آگئے ہیں ابو وہاں آپ کے بغیر ہمارا دل نہیں لگ رہا تھا۔ آئیے ابو...... میں آپ کو آپ کے کمرے میں لے چلوں۔" وہ آہستہ آہستہ ان سے قریب ہوتی جارہی تھی اور سلمان داؤد خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ فرناز نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور سلمان داؤد کو سہارا دیتے ہوئے ان کو ان کے کمرے میں لے گئی۔

کئی روز گزرنے کے بعد ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ سلمان داؤد کے جانی دشمن ظفر حسین نے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا تھا یہ وہی ظفر حسین تھا جس کو ایک بار چوری کے الزام میں سلمان داؤد نے جیل بھجوایا تھا وہ تحریک آزادی کشمیر کا رکن ضرور تھا لیکن اس کا تعلق ایک ایسے ٹولے سے تھا جو صرف اور صرف تشدد پر یقین رکھتا تھا اور آزادی کی جنگ لڑنے کے بجائے اپنی ذاتی دشمنی نمٹا رہا تھا۔ سلمان داؤد نے کئی دن کی مشقت کے بعد ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بس اتنا ہی بتایا تھا کہ ظفر حسین اور اس کے ساتھ انہیں گھر سے رات کی تاریکی میں اٹھا کر ہندوواڑہ کے علاقے کی آبادی سے دور کسی ویران جگہ لے گئے تھے وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ اب ان میں اپنے نظریات کا پرچار کرنے یا کسی پر تنقید کرنے کی سکت نہیں تھی یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کی ساری بصیرت اور سوجھ بوجھ دم توڑ چکی ہو۔

اب سلمان داؤد صرف اپنے خاندان والوں کے رحم وکرم پر تھا اور خاندان بھی وہ جو صرف دو لڑکیوں اور ایک بیوی پر مشتمل تھا۔

انہیں گھر آئے ہوئے تیسرا روز تھا کہ رات کو دروازے پر دستک ہوئی دروازہ فرناز نے کھولا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے سامنے احمد کمال کھڑا تھا۔

"تم۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میری بات سنو وقت بہت کم ہے۔" احمد کمال نے سرگوشی سے کہا۔ "میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ حریت پسندوں نے ہندوواڑہ میں ان مکانات کو جلانے کا فیصلہ کیا ہے جہاں ہندو یا

حکمرانوں کے وفادار رہتے ہیں تمہارا مکان بھی اس فہرست میں شامل ہے تمہیں یہ اطلاع پہنچانا گو کہ تنظیم کے مفاد کے خلاف ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ تم حریت پسندوں کی حامی ہو اور خود بھی ہمارا ساتھ دینا چاہتی ہو تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ۔“

”کیا ابھی، اسی وقت؟“ فرناز نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”لیکن اس وقت ہم لوگ کہاں جائیں گے۔“ فرناز نے کہا اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”یہ سب میں تمہیں تفصیل سے نہیں بتا سکتا میں جلدی میں ہوں اس وقت تم اپنی عقل استعمال کرو۔“ کمال نے عجلت سے کہا اور فوراً دروازے سے ہٹ گیا۔

فرناز نے جھانک کر گلی میں دیکھا تو تیزی سے آگے گلی کا کونا مڑ گیا تھا فرناز نے دروازہ بند کرلیا اور بھاگی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اس نے ساری صورت حال فریال کو بتائی اور فریال آپے سے باہر ہوگئی۔

”دیکھا تم نے...... تم نے دیکھا وہ میری محبت کا دم بھرتا ہے وہ...... وہ ہمیں یوں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا اسے اس وقت ہماری مدد نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

”دیکھو فریال جذباتی مت بنو یقیناً اس کے سپرد کوئی اہم ذمہ داری ہوگی ورنہ وہ ہرگز ہمیں چھوڑ کر نہیں جاتا۔“

”ہونہہ اس کی اہم ذمہ داریاں میں خوب سمجھتی ہوں اس نے اس وقت بھی ہماری مدد کرنے کے بجائے کسی غریب مسکین کی مدد کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔ خیر کوئی بات نہیں میں بصیر سے بات کرتی ہوں۔“ فریال تیزی سے اٹھی اور ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔

”نہیں فریال ایسا مت کرو احمد کمال نے یہ اطلاع ہمیں راز داری سے دی ہے اگر تم نے کیپٹن بصیر کو بتا دیا تو اچھا نہیں ہوگا فوج ہوشیار ہوجائے گی اور پھر نہ جانے کتنے حریت پسند مارے جائیں ایسا مت کرو۔“ فرناز نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں آخر تم کیا چاہتی ہو، کیا ہم اپنے بچنے کا انتظام نہ کریں خاموشی سے مرجائیں، ہمارے پاس کیپٹن بصیر سے رابطہ کرنے کے کوئی راستہ نہ رہے تب مدد مانگیں تم پاگل ہو۔“ فریال نے غصے سے کہا پھر اس نے فرناز کے منع کرنے کے باوجود کیپٹن بصیر کو حریت پسندوں کے نئے آپریشن کیا طلاع دے دی بصیر نے جلد ہی موقع پر پہنچنے کا وعدہ کیا لیکن جب ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ بھاری فوجی کمک کے ساتھ وہاں پہنچا تو ہندوواڑہ کے متعدد مکانات نذر آتش ہوچکے تھے جن میں سلمان داؤد کا مکان بھی شامل تھا فریال، فرناز، ان کی والدہ اور سلمان داؤد پڑوس کے ایک مکان میں تھے۔ سلمان داؤد کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”ختم ہوگیا،...... سب کچھ ختم ہوگیا...... اف میں نے یہ سب کچھ کتنی محنت سے کمایا تھا یہ میری ساری عمر کی کمائی تھی مجھے چھوڑ دو جانے دو میں مرجانا چاہتا ہوں اپنے جلتے ہوئے مکان میں جل کر مرجانا چاہتا ہوں۔ مجھے جانے دو، میں تباہ ہوگیا ہوں۔“ سلمان داؤد چیخ رہے تھے فریال اور فرناز انہیں دونوں طرف سے پکڑے ہوئے تھیں اور فرناز کی والدہ ایک طرف کھڑی آنسو بہا رہی تھیں۔

”ابو چپ ہوجائیں۔“ فرناز نے سلمان داؤد کو دلاسہ دیا فریال خاموش تھی۔

”مجھے افسوس ہے فریال کہ تمہارا گھر جل گیا۔“

کیپٹن بصیر نے رسمی جملہ کہا اور فریال یکا یک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”یہ سب تو یہاں کا معمول بن گیا ہے۔“ بصیر نے کہا۔

”اوہ، اب ہم لوگ کیا کریں گے۔“ فریال نے بلکتے ہوئے کہا۔

”تم فکر مت کرو میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔“ بصیر نے اسے تسلی دی اور وہ اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔

”کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو سلمان داؤد کے خاندان کے لیے رہائش کا انتظام اس طرح کر کے آیا کہ وہ لوگ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے ایک فیملی نے سلمان داؤد اور ان کی بیوی کو اپنے ہاں پناہ دی تھی فرناز کے رہنے کے لیے ایک ڈاکٹر کی فیملی کے ہاں انتظام ہوا تھا اور فریال کے لیے ایک بیوہ فاروق جہاں کے ہاں انتظام ہوا تھا۔ بصیر حسین جس طرح سلمان داؤد کو بتاتا رہا وہ اسے اسی طرح مانتے رہے شاید اب ان میں مخالفت کرنے کی سکت نہیں تھی۔ انہیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا کہ ان کی دونوں بیٹیوں کو بھی ایک جگہ نہیں رکھا گیا تھا اس کے برعکس فرناز کو تشویش تھی اور اس کے ذہن میں فاروق جہاں کا نام سن کر کھچڑی سی پکنے لگی تھی اسے یہ نام جانا پہچانا سا لگا تھا لیکن اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے یہ نام کہاں سنا تھا جب اسے یاد آیا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔

بصیر اسے اس ڈاکٹر کے گھر چھوڑ گیا تھا جس نے فرناز کو اپنے گھر والوں کے ساتھ رکھنا قبول کیا تھا جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اسے یاد آیا کہ فاروق جہاں وہ بیوہ ہے جس کا بڑا اور عالیشان گھر ہے اس میں بہت سے کمرے ہیں جن میں بھاتی فوجیوں کے رہنے کا انتظام ہے ساتھ ساتھ حکومت کے کچھ اعلیٰ فوجی افسر بھی وہاں رہائش پذیر ہیں بصیر یقیناً وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور اس نے فریال کو اپنے ساتھ رکھنے کا انتظام کیا تھا۔

دوسرے روز ہندوواڑہ میں پھر فوجی دستوں اور حریت پسندوں میں جھڑپیں ہوئیں کڑا بل کے علاقے میں ایک پل اڑا دیا گیا۔ ہنگاموں کے بعد بڑے پیمانے پر گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ اگلے روز ان گرفتار شدہ حریت پسندوں کو ہندوواڑہ کی مرکزی شاہراہ سے گزارا گیا اس جلوس کو فرناز نے بھی دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی کہ ان لوگوں میں احمد کمال بھی تھا۔

وہ رات فرناز نے جیسے کانٹوں پر بسر کی۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی تھی اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی تھی دوسرے دن وہ ہر کام چھوڑ کر کیپٹن بصیر سے ملی اور فریال کو ساری صورت حال سمجھا کر اس سے بھی اپنی سفارش کرائی تب بڑی مشکل سے بصیر اس بات پر رضا مند ہوا کہ وہ فرناز کو احمد کمال سے ملوانے کا انتظام کردے گا جب تک یہ انتظام نہیں ہوا۔ وہ بار بار کیپٹن بصیر سے ملتی رہی اور جب اس کے احمد کمال سے ملنے کی گھڑی آئی تو وہ جیل میں اس کے لیے کھانا اور چند رسالے لے کر پہنچی بصیر نے فرناز کے لیے احمد کمال سے ملنے کا جیل پاس بنوا دیا تھا اب وہ آزادی سے اس سے ملنے جاسکتی تھی۔ احمد کمال اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”فرناز تم یہاں؟“ وہ اپنی حیرت چھپا نہ سکا، فرناز نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا وہ اپنا لایا ہوا کھانا احمد کمال کے سامنے رکھ کر خاموش بیٹھ گئی احمد کمال حیرت سے کبھی اسے اور کبھی اس کی لائی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

"فرناز تم...... تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں اپنے دوستوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔" فرناز نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تو تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو۔"

"ہاں اگر میں ایسا سمجھنے کی غلطی کر رہی ہوں تو میری حماقت کے ذمہ دار تم نہیں ہو تم نے کبھی مجھ پر یہ بھی تو ظاہر نہیں کیا کہ تم میرے متعلق کیا سوچتے ہو پھر میں تم سے نفرت کیسے کر سکتی ہوں جبکہ تم میرے وطن کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہو۔" فرناز نے کہا۔

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میرے رویے کے باوجود تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔"

"خدا حافظ احمد، میں پھر آؤں گی۔" فرناز نے کہا اور واپسی کے لیے مڑی۔

"شکریہ فرناز، میں تمہارا انتظار کروں گا۔" احمد کمال نے بھی اس کے انداز میں جواب دیا۔

وہ کئی بار احمد کمال سے ملنے جیل گئی اور ہر بار اسے احساس ہوا کہ احمد کمال کے وجود میں رچے ہوئے جذبۂ آزادی میں مزید اضافہ ہی ہوا ہے۔ دشمن کی قید و بند نے اس کے حوصلے پست نہیں کیے تھے۔

پھر ایک روز احمد کمال نے اسے ایک ایسی خبر سنائی کہ خوشی سے اس کا انگ انگ جھوم اٹھا۔

"فرناز تمہیں پتا ہے مجھے آزاد کیا جا رہا ہے۔" احمد کمال کی یہ بات سن کر فرناز چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گئی۔

"تم نے سنا مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو آزاد کیا جا رہا ہے۔" احمد کمال نے اس کے شانے پکڑ کر اس کو جھنجھوڑا۔

"لل...... لیکن...... کیسے...... ان بھارتیوں سے ہم کسی قسم کی رعایت کی امید نہیں رکھتے۔" فرناز نے دھیمے لہجے میں کہا

"وہ ہمیں کوئی رعایت نہیں دے رہے ہیں بلکہ ہمارے مجاہدین نے ایک معرکے میں ان کے چند اعلیٰ افسران کو گرفتار کر لیا ہے جنہیں وہ آزاد کرانا چاہتے ہیں اور ہمارے ایریا کمانڈر دوراب بٹ نے یہ شرط رکھی ہے کہ اگر وہ ہمارے چند اہم رہنماؤں کو چھوڑ دیں تو اس کے بدلے میں ان کے بھی اعلیٰ افسر چھوڑ دیے جائیں گے یہاں کی انتظامیہ نے یہ بات مان لی ہے اور کل مجھ سمیت یہاں سے آٹھ حریت پسند آزاد کیے جا رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے یہاں تم سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔" فرناز نے پوچھا اور احمد کمال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"فرناز تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے میں بد نصیب ہوں کہ میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔" احمد کمال نے تاسف سے کہا۔

"نہیں احمد، میں کسی ذاتی جذبے کے تحت تمہاری مدد نہیں کر رہی ہوں بلکہ میں تو اپنے وطن کی آزادی کی خاطر حریت پسندوں کے کام آنا چاہتی ہوں۔" فرناز نے دل پر جبر کر کے کہا اور احمد کمال کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

دوسرے روز احمد کمال اور اس کے ساتھیوں کو آزاد کر دیا گیا تھا اور پھر کافی عرصے فرناز کی اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ بس اتنا سنا تھا کہ حریت پسند تنظیم کی طرف سے احمد کمال کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑی علاقوں کی طرف کسی مشن پر بھیج دیا گیا تھا اس کے لبوں پر ہر دم احمد کمال کی کامیابی کے لیے دعائیں تھیں اسی عالم میں دو ماہ گزر گئے اور پھر ایک دن فریال اس سے ملنے آ گئی۔

"فرناز مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" فریال

نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ فرناز نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں تم میرے متعلق کیا سوچتی ہوگی؟"

"میں خود تنگ آ چکی ہوں اگر میں نے بصیر سے وعدہ نہ کر لیا ہوتا تو......!"

"کیا...... تم نے اس سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ تم بلا سوچے سمجھے اپنے خاندان کی عزت و ناموس اس کے ہاتھوں برباد کرتی رہو گی تمہیں پتا ہے کہ جس گھر میں تم بصیر کے ساتھ رہتی ہو وہاں بھارتی فوجیوں کے علاوہ صرف تم واحد عورت ہو یا پھر وہ بیوی جو اس گھر کی مالک ہے تمہیں احساس ہے کہ لوگ کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں کیا میں ان لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر دوں۔"

"نہیں فرناز یہ بات نہیں ہے میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ تم مجھ سے نفرت کرو۔"

"اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔"

"دیکھو فرناز بصیر کو پہاڑی علاقوں میں بھیجا جا رہا ہے وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے میں بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"گویا میرا اندیشہ درست تھا لیکن فریال تم یہ سوچو اس کے ساتھ بغیر کسی رشتے کے تم کیسے جا سکتی ہو؟"

"بہت آسانی سے اسی طرح جیسے کوئی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ جا سکتی ہے۔" فریال نے کہا اور فرناز حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"بیوی۔" تمہارا مطلب ہے تم اور بصیر شادی کر چکے ہو۔"

"ہاں دیکھو فرناز یہ بات خفیہ ہے بصیر نے مجھے سختی سے منع کیا ہے کہ میں ابھی کسی کو اس کے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔"

"اوہ فریال تمہیں اندازہ ہے کہ جب امی اور ابو کو یہ پتا چلے گا تو انہیں کتنا دکھ ہوگا؟"

"مجھے پتا ہے لیکن بصیر بھی مجبور ہے کیونکہ انکل نصیر الدین بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں انہوں نے بصیر کے لیے ایک مال دار لڑکی کا انتخاب کر رکھا ہے اور اگر ان کے کانوں تک یہ خبر پہنچ گئی تو بصیر ان کی تمام جائیداد سے محروم ہو جائے گا۔"

"گویا تم ابھی امی کو اور پریشان رکھو گی۔"

"مجبوری ہے فرناز، لیکن جب وقت آنے پر امی کو معلوم ہوگا اور یہ بھی پتا چلے گا کہ میں نے یہ قربانی اس لیے دی کہ میں اور بصیر جائیداد سے محروم نہ ہو جائیں تو ہمیں ضرور معاف کر دیں گی۔ اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے میرے پاس ہماری شادی کا نکاح نامہ موجود ہے۔" فریال نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا اور فرناز نے بے پروائی سے شانے اچکا دیے۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا مدد چاہتی ہو؟" فرناز نے پوچھا۔

"تم میرے ساتھ چلو بصیر ہمارے ٹھہرنے کا وہاں انتظام کر دے گا میں تنہا کیسے رہوں گی میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں کہ مجھے تنہائی سے بچا لو۔" فریال نے اپنا حق جتایا۔

فرناز چاہتی تھی کہ جانے سے منع کر دے لیکن پھر اسے احمد کمال کا خیال آ گیا جو انہی پہاڑی وادیوں میں سخت سردی اور بھوک کا مقابلہ کر رہا تھا اس کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" فرناز نے ہامی بھر لی اور فریال کا چہرہ کھل اٹھا۔

اگلے روز فرناز، فریال کے ساتھ پہاڑی وادیوں

کی طرف روانہ ہوگئی تھی ان کے ساتھ ضرورت کی چند اشیا کھانے پینے کا کچھ سامان اور اس جیپ کا ڈرائیور تھا جس میں وہ سفر کر رہی تھیں۔ یہ سارا انتظام کیپٹن بصیر نے کیا تھا وہ دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد پہاڑی وادیوں کے برفانی علاقوں میں پہنچ گئی تھیں حد نگاہ تک برف ہی برف تھی معاً اسے ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور جسم پر گئی جوڑے کپڑے پہنے ہوئے تھا شاید سردی سے بچنے کے لیے اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا جیپ کو دیکھ کر اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا فرناز نے ڈرائیور کو جب رکنے کا اشارہ کیا اور اس شخص کی طرف متوجہ ہوئی اس نے پھر بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز محض ایک خرخراہٹ کی طرح سنائی دی پھر اسے بے تحاشہ کھانسی آئی جس کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے وہ برف پر گر گیا فرناز نے اس کے لباس سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کشمیری مجاہد تھا۔

"احمد کمال کہاں ہے؟" فرناز نے اس شخص سے پوچھا تو اس نے انگلی سے دور نظر آنے والی چند خیمہ جیسی جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ۔" اس نے کہا اور پھر ڈرائیور یا فریال سے کچھ کہے بغیر ہی جیپ سے اتر کر ان خیمہ نما جھونپڑیوں کی طرف بڑھ گئی۔

قریب پہنچ کر وہ ہر جھونپڑی میں جھانکنے لگی کہ ایک جھونپڑی میں اسے احمد کمال نظر آیا جو ایک کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا اس نے فرناز کو دیکھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھ نہ سکا اس کے پیروں میں جوتوں کی جگہ کالے کپڑوں کی دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے جسم پر صرف کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔

"احمد کمال، تمہارے گرم کپڑے۔" اس نے پوچھا۔

"وہ ہم نے باہر پہرا دینے والوں کو دے دیے ہیں انہیں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔" احمد کمال نے جواب دیا۔

"ہمیں آزادی کے لیے کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔" فرناز نے روہانسی ہو کر کہا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"رونا مت فرناز، یقین کرو...... اگر یہ شدید سردیاں ہم نے گزار لیں تو ان شاء اللہ فتح ہمارا مقدر ہوگی۔"

"میرے پاس کچھ راشن ہے میں لاتی ہوں۔" فرناز نے کہا اور جھونپڑی سے نکل گئی وہ واپس آئی تو اس کے پاس کھانے کو جو کچھ تھا وہ ساتھ لے آئی تھی راشن لاتے ہوئے اس نے فریال کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ مجاہدین آزادی کے لیے یہ چیزیں لے جا رہی ہے اس نے احمد کمال کا ذکر نہیں کیا تھا اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ فریال کو اس مقام پر پہنچا کر واپس آ جائے جہاں بصیر نے ان کی رہائش کا انتظام کیا تھا اس نے احمد کمال کو بھی فریال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

جھونپڑی میں روشن آگ پر اس نے ایک برتن میں انڈے تلے اور ڈبل روٹی کے ساتھ احمد کمال کو کھلانے لگی اس نے اپنے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ وہ قریبی بستی میں آئی تھی تو مجاہدین کی موجودگی کے بارے میں سن کر اس تک پہنچ گئی کھانا کھانے کے بعد احمد کمال میں کچھ طاقت آ گئی تھی۔

"فرناز، کیا میں نے تم کو کبھی بتایا ہے کہ تم فرشتہ ہو۔" اس نے فرناز سے کہا۔

"نہیں تم نے کبھی نہیں بتایا۔"

"تم یہاں تک کیسے پہنچی، چار دن سے شدید برفباری ہو رہی ہے۔ تمہیں کھانے کا سامان کہاں سے ملا اور رقم کہاں سے آئی۔" احمد کمال نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔

"تم کچھ دیر خاموش بیٹھو۔" فرناز نے اس کی بات ٹالتے ہوئے کہا وہ جانتی تھی کہ احمد کمال کو یہ بتانا کہ وہ رقم جس سے راشن خریدا گیا ہے بصیر الدین کی ہے اسے افسردہ کر دے گا۔

"فرناز۔"

"ہاں۔"

"کیا میں تمہارا ماتھا چوم سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے اب محبت نہیں کرتی لیکن تم نے یہاں تک آ کر اور میری مدد کر کے جس بہادری کا ثبوت دیا ہے میرے دل میں تمہاری قدر اور بڑھ گئی ہے۔"

"تم میرا ماتھا چوم سکتے ہو۔" فرناز نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن جب احمد کمال کھڑا ہو کر اس کے قریب آیا تو فرناز کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"نہیں فرناز...... رونا مت۔"

"یہ میرے بس میں نہیں ہے۔" فرناز نے بے بسی سے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

"کھانے پینے کا یہ سامان بہت کافی تو نہیں لیکن اس سے بہت سے کمزور اور لاغر مجاہدین کو ڈھارس مل جائے گی۔" احمد کمال نے کہا۔

"نہیں احمد، تم اس راشن کو دوسروں میں نہیں بانٹو گے تمہارے لیے تمام سردیوں میں کافی ہوگا لیکن اگر تم نے اسے تقسیم کر دیا تو یہ ایک ہفتے میں ختم ہو جائے گا اور تم کیا کرو گے۔" فرناز نے کہا۔

"فرناز یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اگر ہم کچھ کھا رہے ہوں اور کوئی بھوکا جانور بھی ہمارے نزدیک آ کر کھڑا ہو تو ہم اسے کچھ نہ کچھ دیتے ہیں کیونکہ ہمیں اس کی بھوک کا اندازہ ہوتا ہے پھر میرے دوسرے ساتھی تو انسان ہیں اور میرے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں شریک ہیں وہ بھی نامساعد حالات کا میری طرح مقابلہ کر رہے ہیں۔"

"لیکن میرے پاس جتنی رقم تھی میں نے خرچ کر دی اب شاید میں مزید راشن نہ لا سکوں۔"

"کوئی بات نہیں فرناز تم نے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"لیکن راشن نہ ملا تو، تو تم مر جاؤ گے میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی احمد، تمہیں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے جو خوراک سے ملتی ہے بھوکے رہ کر تم دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"اگر اس کائنات میں انصاف نام کی کوئی چیز ہے تو میں نہیں مروں گا۔ میں سمجھتا ہوں ہم اس امتحان سے کامیابی سے گزر جائیں گے۔ خدا ضرور ہماری مدد کرے گا جیسے اس نے ابھی کی۔" احمد کمال

جواہر پارے

بقائے صحت کے لیے جسمانی صفائی اور پاکیزگی نہایت ضروری ہے اور یہ غسل سے ہی حاصل ہو سکتی ہے، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے سے غسل کو بہت اہم سمجھا گیا ہے، قدیم اہل روم و اہل یونان غسل کو مذہباً فرض سمجھتے تھے اور یہودی و اہل ہنود بھی اسے عبادت کے برابر درجہ دیتے ہیں۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد کبھی غسل نہیں کرنا چاہیے اور محنت یا تکان کے بعد یا صحبت سے پہلے یا اس کے فوراً بعد بھی غسل کرنا بہت مضر ہے اور حاملہ مستورات کو بھی کم نہانا چاہیے، بہتر یہ ہے کہ موسم سرما میں ہفتے میں دو، تین مرتبہ اور موسم گرما میں روزانہ غسل کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے اور زیادہ دیر حمام یا گرم پانی کے ٹب یا حوض میں بیٹھنا بہت مضر ہے، اس سے بدن بہت کمزور ہو جاتا ہے۔

سیدامجد علی...... لاڑکانہ

کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ فرناز بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی واقعی خدا نے ان کی مدد کی تھی جب فرناز اس علاقے کی طرف آنے کے لیے روانہ ہوئی تھی تو اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جو رقم اور کھانے پینے کا سامان لے کر جارہی ہے وہ احمد کمال کے کام آئے گا اسے تو احمد کمال کے اتنی جلدی ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو احمد، خدا ضرور ہماری مدد کرے گا۔'' اس نے بھی یقین سے کہا تھا۔

''آؤ فرناز میں تمہیں اپنے لیڈر سے ملواؤں جو ہمارا ایریا کمانڈر ہے۔'' احمد کمال نے کہا۔

جب فرناز ایریا کمانڈر کے پاس پہنچی تو وہ اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا فرناز کے وہاں پہنچنے اور راشن فراہم کرنے کی اطلاع اس تک پہنچ گئی تھی۔

''خدا تمہاری حفاظت کرے بہادر لڑکی۔'' ایریا کمانڈر دوراب بٹ نے کہا۔

''تم نے ہماری مدد کر کے اس وقت ہم پر احسان کیا ہے کاش ہم میں تم جیسے چند اور ہوجائیں تو ہمارا کام بہت آسان ہوجائے گا۔''

فرناز کی نظریں دوراب بٹ کے چہرے پر جمی تھیں اس نے اتنا اداس چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے سامنے وہ حریت پسند کھڑا تھا جس کا مقابلہ دشمن ملک کی طاقتور فوج سے تھا اور جس کے پاس نہ کھانے کو کچھ تھا نہ اس کے مجاہدین کے لیے گرم کپڑے تھے مناسب اسلحہ تھا نہ رقم تھی سپلائی کے کوئی بھی ذرائع نہیں تھے۔ وہ چند سو ایسے مجاہدین کا کمانڈر تھا جو بھوک اور سردی کی وجہ سے موت کے دوراہے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

''جناب کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فتح آپ کی ہوگی؟'' فرناز نے پوچھا۔

''ہاں۔'' دوراب بٹ نے کافی دیر بعد جواب دیا۔ وہ اس کے چہرے پر بغور دیکھتا رہا تھا۔

''فتح ہماری ہوگی کیونکہ یہ بہت ضروری ہے ہمیں ہر حال میں جیتنا ہے۔''

فرناز اس کی بات سن کر مبہوت سی ہوگئی تھی۔

''آؤ فرناز میں تمہیں کیمپ کے باقی مجاہدین سے ملواؤں میں جانتا ہوں تم بہادر ہو، زخمی اور بھوک سے بلکتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بے ہوش نہیں ہوجاؤ گی آؤ میرے ساتھ آؤ۔'' دوراب بٹ نے کہا۔

''لیکن آپ مجھے ان لوگوں سے کیوں ملوانا چاہتے ہیں کمانڈر۔'' فرناز نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں تمہیں ایک مشن پر بھیجنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔'' دوراب بٹ نے کہا اور فرناز حیرت سے کبھی اسے اور کبھی احمد کمال کو دیکھنے لگی اسے یاد تھا کہ اس نے ایک بار احمد کمال سے کہا تھا کہ وہ بھی اس کی تحریک آزادی میں شریک ہونا چاہتی ہے تو احمد کمال نے اسے ٹال دیا تھا اور آج اسے یہ اعزاز بن مانگے مل رہا تھا۔

''میں تمہیں اپنی ہائی کمان کے پاس بھیجوں گا تاکہ تم ان کے لیے امداد کی بات کرسکو اور ہماری حالت کے بارے میں انہیں بتا سکو ہمارا رابطہ ان سے ٹوٹ گیا ہے اور ہم میں سے کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا کیا تم یہ کام کروگی؟''

''یس سر! میں آپ کی کمانڈ میں ہوں۔'' فرناز نے جوشیلے لہجے میں کہا اور دوراب بٹ کے ساتھ اس کے خیمے سے نکلی۔

اس نے کیمپ میں موجود مجاہدین کی جو حالت دیکھی اس سے اسے بے حد تکلیف ہوئی بہت سے مجاہدین زخمی تھے جن کے لیے دواؤں یا ڈاکٹر کا انتظام نہیں تھا سردی سے بچنے کے لیے ان کے پاس گرم کپڑے نہیں تھے وہ پانچ پانچ اور چھ چھ کی ٹولیوں میں ایک دوسرے سے چمٹے بیٹھتے تھے تاکہ ان کے جسموں کی گرمی انہیں زندہ رکھ سکے وہ بھوکے تھے اور کمزور ہوچکے تھے یہ سب دیکھ کر فرناز کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اس کے بعد وہ واپس ایریا کمانڈر کے خیمے میں آگئے تھے جہاں دوراب بٹ نے فرناز کو ہدایت کی کہ وہ ہندوواڑہ جائے اور وہاں اسحاق احمد سے ملے جو احمد کمال کے والد ہیں دوراب بٹ نے اسے ایک پرچے پر اپنا پیغام لکھ کر دیا اور فرناز نے وہ پرچہ سنبھال کر رکھ لیا۔

''فرناز اب ہمارا سارا انحصار تم پر ہے۔'' دوراب بٹ نے کہا۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔'' فرناز نے جواب دیا تو دوراب بٹ نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی پھر وہ اسے رخصت کرنے اس کی جیپ تک آیا تھا جو کچھ دیر پہلے وہاں پہنچی تھی۔

''احمد کمال خدا حافظ۔'' فرناز نے جیپ میں بیٹھنے کے بعد بے ساختہ احمد کمال کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

''فرناز میں نے تمہیں بہت نظر انداز کیا لیکن اب میں اس کا تدارک کروں گا۔'' احمد کمال نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

''ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے احمد کمال یہ باتیں اس وقت کے لیے اٹھا رکھو جب تم فتح مند ہوکر واپس آؤ گے تب مجھے بتانا کہ میرے لیے تمہارے جذبات کیا ہیں؟'' فرناز نے کہا پھر اس نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا اور جیپ آگے بڑھ گئی۔

اسحاق احمد کے گھر میں جب اس نے قدم رکھا تو سہ پہر ہوچکی تھی۔

''ارے فرناز تم، تمہیں تو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔'' احمد کمال کی والدہ نے اسے دیکھتے ہی گلے سے لگالیا اور شوہر کو آواز دی۔

''احمد کے ابو، دیکھیں کون آیا ہے۔''

ان کی آواز سن کر اسحاق احمد فوراً ہی برآمدے میں آگئے تھے۔

''ارے فرناز آؤ آؤ۔'' انہوں نے اسے برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''میں تمہارے کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔'' احمد کمال کی والدہ نے اسے تخت پر بٹھاتے ہوئے کہا اور وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

''میں خاص طور سے آپ سے ملنے آئی ہوں۔'' فرناز نے اسحاق احمد سے کہا۔

''میری خوش قسمتی ہے ورنہ تمہارا باپ تو مجھے بات کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔'' اسحاق احمد نے ہنستے ہوئے کہا پھر وہ سنجیدہ ہوگئے۔

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے گھر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اس روز ہمارے علاقے میں بھی خاصا ہنگامہ تھا۔ احمد کمال بھی گھر پر موجود نہیں تھا چنانچہ میں تمہاری طرف نہ جا سکا بعد میں گیا تو پتا چلا کہ تمہارے کزن کیپٹن بصیر الدین تم لوگوں کو یہاں سے لے گئے ہیں میں یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ تم اپنوں میں ہو۔''

''جی انکل۔'' فرناز نے کہا وہ اسحاق احمد کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''انکل آپ کو معلوم ہے احمد کمال کہاں ہے۔''

''میں اس کے لیے خود پریشان ہوں۔'' اسحاق احمد نے کہا ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''میں احمد کمال سے مل کر آئی ہوں۔'' فرناز نے کہا تو اسحاق احمد حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔

"کیا، کیا تم وہاں گئی تھیں۔"
"جی لیکن میں خاص طور سے اس سے ملنے نہیں گئی تھی بلکہ فریال کے ساتھ تھی۔"
"فریال کے ساتھ کیا وہ اب بھی احمد کمال سے اتنی محبت......!"
"نہیں انکل یہ بات نہیں ہے۔" فرناز نے اسحاق احمد کی بات کاٹ دی۔ "اس نے احمد کمال کو کبھی بھی اتنی شدت سے نہیں چاہا اس نے حالات کا رخ دیکھتے ہوئے کیپٹن بصیر سے خفیہ طور پر شادی کرلی ہے کیپٹن بصیر کو اس علاقے میں خاص مشن پر بھیجا گیا ہے جہاں احمد کمال بھی ہے اور فریال بصیر کے بغیر نہیں رہ سکتی چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئی۔ مجھے سن گن ملی تھی کہ احمد کمال ان وادیوں میں ہے اور میں نے اسے ڈھونڈ ھ نکالا۔ انکل اس کی اور اس کے ساتھی مجاہدوں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے یہ اس کے ایریا کمانڈر دوراب بٹ نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے۔" اس نے اپنے لباس میں سے پرچہ نکال کر اسحاق احمد کو دیا اور وہ اسے فوراً پڑھنے لگی۔
"اوہ، فرناز تم واقعی سونا ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ صحیح سمجھا ہے تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ تمہاری بدولت احمد کمال اور اس کے ساتھی پھر ان شاءاللہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے۔ تم بیٹھو میں ہائی کمان سے مشورہ کر کے سب کچھ سنبھال لوں گا۔" اسحاق احمد نے کہا اور بغیر کسی تاخیر کے گھر سے نکل گئے۔
"ارے تم اکیلی بیٹھی ہو احمد کے ابو کہاں ہیں؟" احمد کمال کی والدہ نے پوچھا جو ٹرے اٹھائے برآمدے میں آئی تھیں۔
"آپ یہاں بیٹھیں میں آپ کو بتاتی ہوں۔" فرناز نے کہا پھر اس نے احمد کمال کی والدہ کو ساری بات بتادی۔
"فرناز تم لڑکی نہیں ہمارا بیٹا ہو احمد کمال نے کتنی غلطی کی کہ فریال کو چاہا کاش وہ تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بناتا۔" احمد کمال کی والدہ نے کہا اور فرناز کی نظریں جھک گئیں۔
"اب تم کہاں جاؤ گی؟"
میں فریال کے پاس واپس جاؤں گی۔"
"لیکن موسم خراب ہے ایک دو روز یہیں رک جاؤ۔"
"نہیں مجھے جانا ہے وہ اکیلی ہوگی۔" فرناز نے جواب دیا۔
پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رکی چائے پیئے بنا واپسی کے لیے روانہ ہوگئی تھی۔
دو دن کی مسافت طے کر کے جب وہ فریال کے پاس پہنچی تو ایک نئی مصیبت اس کے لیے منہ کھولے کھڑی تھی۔ فریال کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور وہ بہت کمزور نظر آرہی تھی۔
"فریال کیا بات ہے؟" فرناز نے پوچھا۔
"فرناز بصیر نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔" فریال نے مری ہوئی آواز میں کہا۔
"کیا تمہیں چھوڑ دیا ہے؟" فرناز نے حیرت سے کہا۔
"ہاں فرناز کل اطلاع آئی کہ انکل نصیر کا انتقال ہوگیا میں نے جب اس سے کہا کہ اب ہم واپس اننت ناگ جائیں گے اور سب کو بتادیں گے کہ ہم شادی کر چکے ہیں تو اس نے کہا کہ وہ مجھ جیسی عورت کو اپنی بیوی کہنا بھی باعث شرم سمجھتا ہے اور...... اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اس کی بیوی اور دو بچے ہیں یہ شادی بھی اس نے انکل سے چھپ کر کی تھی لیکن اسے اپنی پہلی بیوی سے محبت ہے وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔ فرناز وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔" فریال

نے روتے ہوئے کہا۔
"چپ ہو جاؤ فریال، تم نے بھی تو اپنی قدر کھودی تھی تم کسی ایک ڈال پر آشیانہ نہیں بنا سکیں۔ احمد کمال تم سے سچی محبت کرتا تھا لیکن تم نے دولت اور مرتبے کے لیے اسے ٹھکرا دیا اور آج بصیر الدین نے تمہیں آسمان سے زمین پر پھینک دیا۔ چپ ہو جاؤ رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صبح ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے میں تمہیں انکل اسحاق احمد کے گھر لے چلوں گی پھر وہاں سے ہم اپنے امی ابو کے پاس جائیں گے۔ اللہ بہت بڑا ہے تم مایوس مت ہو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" فرناز دیر تک اسے دھیرے دھیرے سمجھاتی رہی اور فرناز سسکیاں لیتے ہوئے سوگئی۔
فرناز کی بھی آنکھ لگ گئی تھی لیکن کچھ ہی دیر بعد دھماکے سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن دوسرے ہی لمحے فریال کا جسم فرش پر پڑا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی فریال کے ایک ہاتھ میں بصیر کا پستول تھا اس کی کنپٹی سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی فرناز سر پکڑ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی بہن بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔
"میں تمہارا بدلہ لوں گی فریال میں بصیر کو چین سے نہیں بیٹھنے دوں گی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تو بہت کم ہے یہاں نجانے کتنے فدائین کشمیر بھارتی فوجیوں اور پٹھوؤں کے ظلم کا نشانہ بنے بے یار و مددگار پڑے ہیں۔ میں نے جو جدوجہد آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ہے" فرناز کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بے خودی کے عالم میں بولے جارہی تھی۔
تقریباً ایک ہفتے بعد جب وہ دوبارہ پہاڑی وادیوں میں احمد کمال سے ملی تو وہاں کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی رضا کار امداد مل جانے کے بعد بہت پر جوش تھے ان کے پاس گرم لباس، جوتے، راشن اور اسلحہ سب کچھ تھا اسحاق احمد نے ہائی کمان سے امداد ملنے کے بعد تمام سامان پہنچوا دیا تھا ایریا کمانڈر، فرناز کا بہت مشکور تھا کہ اس کی کوششوں کی بدولت اس کے بہادروں کو نئی زندگی ملی تھی اس نے فرناز کی درخواست پر اسے اپنے ساتھیوں میں شامل کرلیا تھا۔
"اب ہم دیکھیں گے کہ ہمیں آزادی حاصل کرنے سے کون روک سکتا ہے بھارتیوں نے ہندواڑہ، اننت ناگ اور دوسرے قصبوں میں ظلم کی انتہا کر دی ہے لیکن وہ ہماری تحریک کچلنے میں ناکام رہے ہیں انہوں نے بہت سے کشمیریوں کو بے گھر کردیا ہے اور ہزاروں کو ہلاک کیا ہے۔" فرناز سے دوراب بٹ نے کہا۔
"اس بے سروسامانی کے عالم میں جب آپ کی سپلائی رکی ہوئی تھی آپ تک حالیہ اطلاعات نہیں پہنچ رہی تھیں۔" فرناز نے دوراب سے پوچھا۔
"ہاں تمہاری مدد کے بعد جب سپلائی پہلی بار بحال ہوئی تو اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ اب بھارتی فوجی کشمیریوں کے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگا رہے ہیں۔
27 اکتوبر کو انہوں نے ایک گھناؤنا ڈرامہ کھیلا اننت ناگ میں فائر بریگیڈ کے سربراہ شہید عباسی کو اطلاع ملی کہ کپڑا چوک پر آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ اپنی ٹیم کے ہمراہ موقع پر پہنچے مگر بھارتی فوجیوں نے ان کا استقبال گولیوں سے کیا دو گولیاں فائر بریگیڈ کے اہلکار غلام محسن کو لگیں جب فائر بریگیڈ کی گاڑی وہاں پہنچی تو بھارتیوں نے اس پر قبضہ کر کے اسے تباہ کردیا بھارتی فوجی کشمیر کے گلی کوچوں میں آزادانہ گھومتے ہیں وہ پیٹرول ساتھ رکھتے ہیں اور جو مکان جلنے سے بچ جائیں ان پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دیتے ہیں

عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ وہ کہتے ہیں ''دیکھو...... آزادی دیکھو...... یہ تمہاری آزادی ہے۔''

ایریا کمانڈر دوراب بٹ کی کمان میں فرناز بھی شامل ہوگئی تھی اور اکثر موقعوں پر حریت پسندوں کے ساتھ ہوتی تھی ایسے ہی ایک موقع پر کیپٹن بصیر بھی اس کے ہاتھ لگ گیا تھا اس روز حریت پسندوں نے ایک سرکاری عمارت کو نشانہ بنایا تھا اور اس حملے کے بعد جب وہ واپس جارہے تھے تو اس عمارت ہی کی راہداری میں فرناز اور کیپٹن بصیر کی مڈبھیڑ ہوگئی بصیر اس وقت نہتا تھا اور فرناز کے ہاتھ میں رائفل تھی جو اس نے بصیر پر تان لی بصیر کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

''اوہ فرناز...... تم...... تم تو میری کزن ہو...... ہے نا تم...... تم تو بہت اچھی ہو...... میں...... دراصل...... میں تمہیں......!''

''بکواس بند کرو۔'' فرناز اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چیخی۔

''میں فریال نہیں ہوں جو تمہاری بکواس پر یقین کرلوں تم نے اس کا دل توڑ دیا اور اس نے خودکشی کرلی کیا میں تمہیں معاف کروں گی۔'' فرناز نے غصے سے کہا۔

''دیکھو فرناز میری بات سنو، میرا ارادہ اس سے اس طرح علیحدہ ہونے کا نہیں تھا یقین کرو میں نے سوچا تھا کہ میں اسے آہستہ آہستہ علیحدگی کے بارے میں بتاؤں گا۔'' بصیر نے کراہتے ہوئے کہا اس نے سیدھے ہاتھ سے اپنا بایاں بازو پکڑا ہوا تھا۔

''وہ تمہاری قانونی بیوی تھی۔ اسے یوں بلاوجہ چھوڑنے کا تمہیں حق نہیں تھا۔'' فرناز نے کہا۔

''تو اس نے تمہیں شادی کے بارے میں بتا دیا؟'' بصیر نے کہا۔

''تمہارا خیال ہے کہ اسے نہیں بتانا چاہیے تھا؟''

''اس ذکر کو چھوڑو فرناز، تمہیں پتا ہے کہ تم کتنی اچھی ہو۔'' بصیر نے نئی چال چلی۔

''بکومت مجھ سے چالاکی نہیں چلے گی میں جانتی ہوں تم کیا ہو، ایک فریال ہی کیا تمہارے ہاتھوں بہت سی عورتیں موت کے گھاٹ اتری ہیں تمہارے جیسے کئی فوجیوں نے میری بہنوں اور میری دھرتی کی بہنوں کی عصمت دری کرکے انہیں دریائے جہلم میں پھینک دیا ہے میں تم جیسے شخص کو معاف نہیں کرسکتی۔'' فرناز نے کہا اور بصیر پر فائر کردیا اسی لمحے وہ زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا کچھ ہی دیر بعد اس کا جسم بے جان ہوگیا تھا۔ فرناز چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر اسے حقارت سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی ابھی چند قدم ہی آگے گئی تھی کہ چند فوجی اسے راہداری کی طرف آتے دکھائی دیے ان کی نظریں فرناز اور بصیر کی لاش پر تھیں انہوں نے شاید فرناز کی رائفل کے فائر کی آواز سن لی تھی ان میں سے ایک فوجی نے اپنی رائفل فرناز پر گولی چلادی گولی فرناز کے بازو پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی فرناز کے عقب سے کسی نے مشین گن سے ان فوجیوں پر فائر کھول دیا لیکن فرناز اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک تاریک کمرے میں ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اس کے بازو کے علاوہ سر پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی اس کے قریب ایک کرسی پر احمد کمال بیٹھا ہوا تھا۔

''احمد کمال میں...... میں تو...... میں تو میرا خیال ہے مجھ پر بھارتی فوجیوں نے گولی چلائی تھی پھر...... پھر کیا ہوا......؟'' فرناز نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''پھر میں وہاں پہنچ گیا تھا میں نے مشین گن

سے ایک ہی برسٹ مارا اور ان فوجیوں کو ٹھکانے لگادیا پھر میں تمہیں یہاں لے آیا اب تم محفوظ ہو۔'' احمد کمال نے اسے بتایا۔

''محفوظ'' فرناز کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''بے سروسامانی کے عالم میں اپنی ہمت سے زیادہ کام کررہے ہیں لیکن آخر کب تک اس طرح لڑیں گے ہماری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہم تنہا ہیں۔'' فرناز نے اداسی سے کہا۔

''نہیں فرناز یہ بات نہیں ہے حالات بدل رہے ہیں۔ اب ہم اکیلے نہیں ہیں اب بہت سے بھارتی عوام بھی ہمارے ساتھ ہیں۔''

''بھارتی عوام؟'' فرناز نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھارت میں رہنے والے سکھ خاص طور پر وہ بھی ہماری طرح اپنی آزادی کی جنگ لڑرہے ہیں بھارتی حکومت نے ان کا بھی جینا حرام کیا ہوا ہے اور انہوں نے بھی ایک علیحدہ آزاد ملک کا مطالبہ کردیا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' فرناز نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، اس کے علاوہ میں نے خبریں سنی ہیں پاکستان میں بھی عوام کی طرف سے ہمارے حق میں مظاہرے ہورہے ہیں اور پاکستانی عوام مطالبہ کر رہے ہیں کہ اقوام متحدہ بھارت کو مجبور کرے کہ وہ اس قرارداد پر عمل کریں جس میں کشمیریوں کو ان کا حق رائے دہی دینے کا کہا گیا ہے۔'' احمد کمال نے بتایا۔

''اوہ احمد...... کیا یہ سب کچھ سچ ہے۔'' فرناز نے کہا۔

''ہاں فرناز یہ سب کچھ سچ ہے۔ بھارت کے شہروں علی گڑھ اور حیدرآباد میں کرفیو کے باوجود فرقہ وارانہ فسادات جاری ہیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی مسجدوں کو شہید کرنا شروع کردیا ہے اور مسلمان ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں دوسری طرف آزاد کشمیر میں بھی بھارت کا جارحانہ رویہ سنگدلانہ ہے اور اب ہماری جدوجہد آزادی ہمارے لیے آسان ہوجائے گی۔ اب ہم اکیلے نہیں ہیں۔''

احمد کمال کی آواز میں جوش تھا۔

''واقعی تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں تم خود دیکھ لینا ابھی کچھ دیر میں ریڈیو سے آزاد کشمیر کی ایک اہم شخصیت کی تقریر نشر ہونے والی ہے تم خود ہی سن لینا۔'' احمد کمال نے کہا پھر اس کے قریب رکھا ہوا ریڈیو آن کردیا اور کچھ دیر بعد تحریک آزادی کے رہنما کی تقریر نشر ہونے لگی جس کے دوران فرناز کے چہرے پر سکون پھیلتا گیا اور ہونٹوں پر پراطمینان مسکراہٹ کھیلنے لگی تقریر ختم ہوئی تو اس کے کانوں میں احمد کمال کی میٹھی آواز اتری۔

''فرناز......!'' احمد کمال کے لہجے میں وہ پیار تھا جس کی آرزو فرناز ہمیشہ سے کرتی تھی۔

''ہوں۔''

''عروس آزادی اب ہم سے زیادہ دور نہیں اس سے ہمکنار ہونے پر تم میری بن جاؤ گی فرناز، یہ ہمارے لیے عروس آزادی کی سوغات ہوگی۔'' احمد کمال نے کہا اور فرناز نے شرما کر نظریں جھکا دیں اسے اپنے ارمانوں کی منزل مل گئی تھی۔

ذوقِ آگہی

سباس گل

(اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس)

کچھ باتیں یاد رکھنے کی

☆ماں سے بہترین کوئی دوست نہیں۔ ماں ماں بھی ہوتی ہے اور اولاد کی بہترین دوست بھی۔

☆اپنے آنسوؤں کو سنبھال کر رکھنا یہ تنہائی کے ساتھی ہوتے ہیں۔

☆کسی کو بھی رُلانا مت کیونکہ اگر تم نے کسی کو رلایا تو کل کو تم کو بھی کوئی ضرور رلائے گا۔

☆جسم پر لگے ہوئے زخموں کا علاج تو ہوسکتا ہے لیکن دل کے زخموں کا علاج ناممکن ہے۔

☆دنیا کے اس بازار میں سب چیزیں تو خریدی جاسکتی ہیں لیکن ماں باپ، بہن بھائی، دوستی اور محبت ایسا رشتہ ہے جو بازار سے نہیں خریدا جاسکتا۔

☆زندگی بہت کم ہے، دوسروں سے نفرت کی بجائے محبت کرنا سیکھو۔

☆اگر کسی کو خوشیاں نہیں دے سکتے تو اسے دکھ بھی مت دو۔

☆دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے اندر اچھائیاں پیدا کرے تاکہ وہ بھی دوسروں کی نظروں میں معتبر بن جائے۔

☆دوستی بہت پاکیزہ رشتہ ہے اس پر کیچڑ مت اچھالو۔

☆رات کو سونے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیا کرو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں موت آجائے کیونکہ موت کسی کا انتظار نہیں کرتی۔

عبید ایوب...... میرپور خاص

اللہ کی شان

میں بھی کتنا "عجیب" ہوں!
صحت یاب ہوں تو "اللہ پاک" کو بھول جاتا ہوں۔
مصروف ہوں تو "نماز" بھول جاتا ہوں۔
برائی کروں تو "انجام" بھول جاتا ہوں۔
دیکھوں تو "حیا" بھول جاتا ہوں۔
کھاتا ہوں تو "بسم اللہ" بھول جاتا ہوں۔
کھالوں تو "الحمدللہ" کہنا بھول جاتا ہوں۔
کسی سے ملوں تو "سلام" بھول جاتا ہوں۔
سوتے ہوئے "توبہ" بھول جاتا ہوں۔
غصے میں ہوں تو "برداشت" بھول جاتا ہوں۔
سفر پر جاؤں تو "دعا" بھول جاتا ہوں۔
کیا شان ہے میرے "اللہ پاک" کی وہ پھر بھی مجھے نوازتا ہے اور مجھے نہیں بھولتا۔ سبحان اللہ۔

فائقہ سکندر حیات...... لنگڑیال

سنہرے بول

☆بے وجہ دعائیں دینے والی ہستی صرف ایک ہے اور وہ ہے ماں۔

☆جب دوست مانگنے تو کل کا سوال ہی نہیں (ہربرٹ)

☆جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔ (پلوٹارچ)

☆پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہے۔ (پیری کارنیل)

☆سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے۔ (علامہ اقبال)

☆لہجے کا اثر الفاظ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ (الغزالی)

انتخاب: اکبر چوہدری...... گجرات

معلومات

+انسانی بدن میں پسلیوں کے 12 جوڑ ہوتے ہیں۔

+انسانی ہاتھ میں 27 ہڈیاں ہوتی ہیں۔

+انسانی جسم میں تقریباً پچیس لاکھ مساموں کی تعداد ہے۔

+انسانی سر میں تقریباً پندرہ ہزار بال ہوتے ہیں۔

+انسان کے مرنے کے بعد اس کا دماغ 2 سے 4 گھنٹے تک کام کرتا ہے۔

+انسانی جسم میں 61 فیصد حصہ پانی ہے۔

+انسانی آنکھ ایک منٹ میں 25 بار پلک جھپکتی ہے۔

سیدہ زینب...... ملتان

جدید اقوال

+ گھنٹہ ساٹھ منٹ کا ہوتا ہے لیکن لوڈشیڈنگ کا گھنٹہ ایک سو ساٹھ منٹ کا ہوتا ہے۔

+ پاکستان میں عوام حکمران پالتے ہیں۔

+ لیڈر شیڈنگ شروع ہوگی تو لوڈشیڈنگ ختم ہوگی۔

+ ہم نے پینسٹھ سال سے خیالی پلاؤ کی دیگیں چڑھا رکھی ہیں اور احمقوں کی جنت میں دسترخوان بچھائے ہوئے ہیں۔

+ ہمارے اعضاء ہمارے خلاف وعدہ معاف گواہ ثابت ہوں گے اس لیے اپنے اعضاء سے چھپ کر گناہ کرو۔

+ سرگوشی سسکی اور چیخ سگی بہنیں ہیں۔

+ بدبو کی رنج خوشبو سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

+ کوئلہ صابر نہ ہوتا تو کبھی ہیرا نہ بنتا۔

مشاہیر: حسن نثار

انتخاب: حماد خان...... ضلع لیاقت پور

انمول موتی

+ تیرا نفس تجھ سے وہی کام کرائے گا جس کے ساتھ تو نے اسے مانوس بنایا ہے۔ (حضرت علیؓ)

+ تمہاری عمر روزانہ مسلسل کم ہوتی جارہی ہے تو پھر نیکیوں میں کیوں سستی کرتے ہو۔ (حضرت عمر بن العزیز)

+ انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنا دل اور زبان کو قابو میں رکھے۔ (امام محمد غزالیؒ)

+ علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت ہی رحمت برستی ہے۔ (حضرت بابا فرید شکر گنج)

+ اے آدمی تو ایام ہی کا مجموعہ ہے جب ایک روز گزر جائے تو یوں سمجھ تیری زندگی کا ایک حصہ بھی گزر گیا۔ (حضرت حسن بصری)

کشور شاہین...... جھنگ صدر

سنہری اقوال

● جو لوگ صبح کو فیصلے کرتے اور شام کو بھول جاتے ہیں وہ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

● زندگی کو سادہ مگر خیالات سے بلند رکھو۔

● بے وقوف کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ خود کو واحد عقل مند سمجھتے ہیں۔

● تنہائی میں اپنے خیالات پر اور محفل میں اپنی زبان پر کنٹرول رکھو۔

شاہ ویز...... راولپنڈی

قیمتی موتی

☆دوست سو بھی تھوڑے ہوتے ہیں دشمن ایک بھی بہت ہوتا ہے۔

☆ایک اچھا دوست اگر سو بار بھی روٹھے تو ہر بار مناؤ کیونکہ قیمتی موتیوں کی مالا جتنی بار بھی ٹوٹے اسے ہر بار پرونا پڑتا ہے۔

☆دوستی کا رشتہ نازک کچے دھاگے کی طرح ہوتا ہے دھاگا ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں گرہ آجاتی ہے۔

☆ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے لیکن سچا دوست بننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

ماہ نور...... لاہور

جمعہ کی سنتیں

اچھا لباس......
غسل......
خوشبو......
مسواک......
سرمہ......
سورۃ کہف کی تلاوت۔

گل فاطمہ...... گوجرانوالہ

خوشبوسخن

نوشین اقبال نوشی

(اس ماہ کا انعام یافتہ کلام)

غزل

بجھ گئی تھی شمع جو اسے پھر سے جلاؤں گا
امید خدا پر ہے کہ کچھ کر کے ہی جاؤں گا
دو رخ ہیں تمہیں میرے کچھ خوف نہ کرنا تم
یک طرفہ آئینہ ہوں ہر عکس دکھاؤں گا
بے نیازی طبیعت میں حد درجہ ہے لیکن دوست
گر قول دیا ہے تو مر کے بھی نبھاؤں گا
جرم اپنا خود ہی تم تسلیم کرو ورنہ
میں بولا تو پھر سارے جگ کو سناؤں گا
اجازت ہے تمہیں پوری من مرضی کرو اپنی
جتنا مجھے بھولو گے یاد اتنا ہی آؤں گا
وہ حامی تو بھرے فاروق کہ آئے گا میرے گھر
میں خود کو بیچ کر اپنا گھر سجاؤں گا

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس

بے سبب باتیں

بہت سی بے سبب باتیں
یونہی آغاز ہوتی ہیں
جو اکثر تم سے کہتا ہوں
کھانا کھالیا تم نے
باہر نہ جانا آج گرمی بہت
سنو آج موسم کیسا ہے
خدا حافظ کچھ کہنا تو نہیں

اور
بارش میں بھیگنا مت
تمہیں بیمار کردے گی

اور
اس تمہید میں جاناں
کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا
گزر جاتے ہیں جب لمحے
بیت جاتے ہیں سب لمحے
میری سوچوں میں ایک جملہ محفوظ رہتا ہے
جانے کب کہوں گا میں
انہی بے سبب باتوں میں
مجھے تم سے محبت ہے
بہت زیادہ محبت ہے

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

غزل

میرے دل کی بستی اجاڑ کر جانے والے
کبھی نہ بھلا سکوں گا تجھے مجھ کو بھلانے والے
دن کو تڑپتا ہوں راتوں کو نیند نہیں آتی
تو بھی نہ سکوں پائے گا مجھ کو ستانے والے
ایسا جلایا دل کہ جلتا ہی رہتا ہے
تیرا دل رہے سلامت میرا دل جلانے والے
میں بھاگتا ہوں تیرے پیچھے تو کرتا ہے بہانے
خوش رہے تو ہمیشہ مجھ سے جان چھڑانے والے
کبھی کھیلتا ہے کبھی توڑ دیتا ہے میرا دل
بنے تو رحمدل مجھ پر ستم ڈھانے والے
میں ہوں وفا کا پیکر کروں گا وفا عمر بھر
بنے تو وفا دار مجھ کو بے وفا کہنے والے

ڈاکٹر خادم حسین کھوکھر

غزل

ظلم کی تمثیل باقی ہے ابھی
درد کی تشکیل باقی ہے ابھی
مجھ کو رسوائی ملی ہر موڑ پر
کیا میری تذلیل باقی ہے ابھی
عصمت انسانیت لٹتی رہی
کیا کوئی کھیل باقی ہے ابھی
ہم جہاں ملتے رہے ہیں عمر بھر
گاؤں میں جھیل باقی ہے ابھی
ایک ہی رخ سے مجھے رانا پڑھا
ٹھہریے! تفصیل باقی ہے ابھی

قدیر رانا...... راولپنڈی

غزل

لب پہ جو آرزو نہیں آتی
گھر پہ فوج عدو نہیں آتی
احتراماً خموش ہیں ہم لوگ
ورنہ کیا گفتگو نہیں آتی
لاکھ کھنچوائے تصویر مگر
ہاں کبھی ہو بہو نہیں آتی
بے ادب لاکھ کاوشیں کر لے
پر بزرگوں کی خو نہیں آتی
چھیڑنے میرے دل کے تاروں کو
کیوں نظر روز تو نہیں آتی
اپنی ناکامیاں یہ کہتی ہیں
کہ ہمیں جستجو نہیں آتی
سچ تو ہر بات ہے مگر نیر
دل سے جلنے کی بو نہیں آتی

نیر رضوی...... لیاقت آباد، کراچی

سپنوں کا چاند

تم جو مجھ سے مسکرا کر الوداع کرتے
ہم زندگی کی اس کتاب سے محروم نہ ہوتے
تھا سرمئی بادلوں کا پہرہ آسماں پر
شام سندر نرالی تھی
مغرب کنارے سورج کی کرنیں
جیسے تمہارے لبوں کی لالی تھی
مدہوش جوانی، چاندنی بدن
سرخ لباس، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ
محبت کی تلاش
نئی دنیا، نئی کائنات
کہاں اوجھل ہیں تم سے حالات
میرے دل کا سورج تم سے اجازت لے کر طلوع ہوتا
سپنوں کا چاند بچے کی طرح مجھ سے چھپتا ہے
ہر پھول، ہر کلی تجھے دیکھ کر خوشبوؤں کی مہک بکھیرے
بھنورے قطار در قطار تیرے چہرے کا طواف کرتے
اماوس کی راتوں میں
ملاقات کی خواہش کو زندہ کیا
تمہاری طبیعت پر شاعری کی کتاب لکھنے کو من چاہا
لیکن، ہاں مگر
میں بھول گیا میرے نصیب میں تو ازل سے گردش ہے
من کے تاج محل میں دائمی لرزش ہے
اچانک کوئی اجنبی تجھے اپنے ساتھ لیے
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا
اور میں
وہیں کا وہیں رہ گیا

ساحل ابڑو...... بلوچستان

لمحہ......!

اک لمحہ جو
گزرے تو پل میں گزر جائے ہے
اور جو رُکے تو
طویل صدیوں پر محیط ہو جائے ہے
اس اک لمحے میں کچھ بھی ممکن ہے
کبھی خوشی کے بے کراں سمندر ملتے ہیں
تو کبھی دکھ کے طویل سلسلے
کبھی ملن رت کی خوشیاں
تو کبھی جدائی کے حائل طویل فاصلے
بس اک "لمحہ" پر منحصر ہے
زندگی انساں کی
وہ اک لمحہ جو
یوں بھی گزرتا ہے
کہ خوشی ملے تو جلدی
اور غم ملے تو طویل

مینا سید...... قصور

فلسطین

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول' وہ شہر جہاں ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے۔ وہ شہر جسے سیکڑوں نبیوں نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر چنا۔ وہ شہر جو تین مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس ترین ہے۔

اسی تاریخی شہر کے پس منظر میں لکھا جانے والا ایک ایسا ناول جسے آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

الماس ایم اے کے قلم سے تاریخی کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے بطور خاص۔

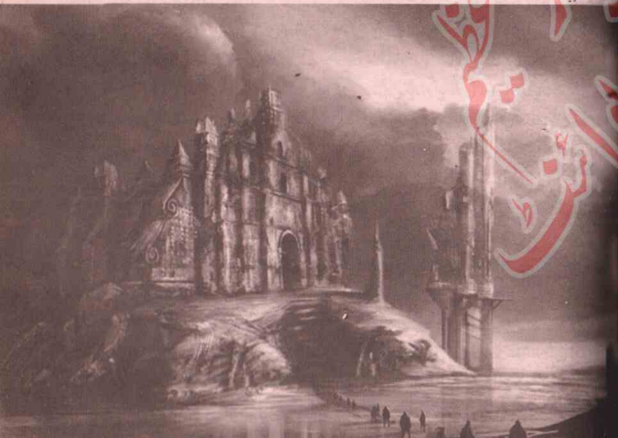

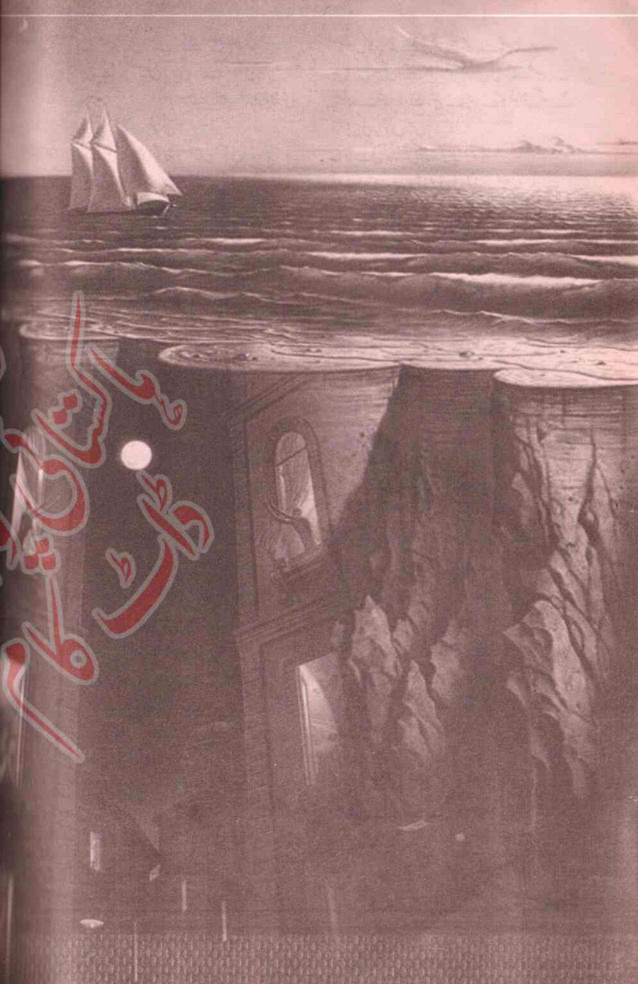

پھر ۱۲۴۰ء میں ڈیوک آف کارلائل ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا اور فرانسیسی لشکر کے ساتھ یافا کی طرف بڑھا۔ اس وقت مصر اور دمشق میں ایک بار پھر ٹھن گئی تھی۔ یہاں تک کہ اہل دمشق نے صلیبیوں کے ساتھ مل کر مصر پر حملے کا فیصلہ کیا۔ سلطان نے طبریہ، عقلان اور بیت المقدس صلیبیوں کو دے کر صلح کر لی لیکن یہ قبضہ صرف دو سال رہا اور خوارزمیوں نے بیت المقدس کو بحال کرالیا۔

یہاں ''خوارزمی'' کی وضاحت ضروری ہے۔ پس جاننا چاہیے کہ خوارزمی وہ لوگ تھے جو چنگیز خان کے خوف سے خوارزم سے مصر بھاگ آئے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح ادھر ادھر پھرتے تھے۔ سلطان مصر نے انہیں پیش کش کی کہ اگر وہ صلیبیوں اور شامیوں کے خلاف اسے مدد دیں تو وہ انہیں آباد ہونے میں مدد دے گا۔ چنانچہ جب تاتاری غول بلاد فلسطین اور شام سے لوٹ گئے تو خوارزمی، ملک مصر کی فوجوں کے تعاون سے بیت المقدس پر قابض ہو گئے۔

اس سلسلے میں جو جنگ ہوئی اس میں سلطان دمشق اسماعیل نے عیسائیوں کا ساتھ دیا لیکن غزہ کے میدان میں ملک المصر کے سالار رکن الدین بیبرس کی قیادت میں رومی اور شامی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی اور خوارزمی آگے بڑھ کر بیت المقدس پر قابض ہو گئے اور بیت المقدس سلطان مصر کے تابع ہو گیا۔ اس بار پھر یورپ میں کہرام برپا ہو گیا۔

ادھر پاپائے روم نے فرانس پہنچ کر صلیبی جہاد کی تبلیغ شروع کر دی اور القدس کے نام پر یورپ کے مختلف ممالک میں ''عشر'' وصول کیا جانے لگا۔ پس ۱۲۴۹ء میں صلیبی لشکر شاہ فرانس لوئیس کی زیر کمان ساحل عکہ پر اترا۔ مسلمان اس وقت باہمی جنگوں میں مشغول تھے۔ شاہ لوئیس کی آمد سے مسلمان اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے لڑے بغیر شہر خالی کر دیا۔ شاہ فرانس دمیاط پر قبضہ کر کے آگے بڑھا مگر مصری لشکر ابھی صلیبیوں سے نبرد آزما تھا لیکن سلطان مصر کا انتقال ہو گیا۔ ملک الصالح کا بیٹا توران شاہ دار السلطنت سے باہر تھا لیکن ملک الصالح کی بیوی شجرۃ الدر نے دانائی سے کام لیتے ہوئے ملک الصالح کی موت کو پوشیدہ رکھا۔ اہم اہم عہدے داروں کو اعتماد میں لیا اور ملک الصالح کے نام سے احکام جاری ہوتے رہے۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ملکہ کو سلطانی افواج کے دریائے نیل کے کنارے پسپا ہونے کی خبر ملی۔ اُس نے فوراً ملک بیبرس کو ایک لشکر کے ساتھ میدان میں بھیجا۔ اس لشکر نے میدان میں پہنچتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ پندرہ سو صلیبی گرفتار ہوئے۔ ہزاروں مارے گئے۔ صرف چند لوگ جانیں بچا کر دمیاط واپس پہنچ سکے۔ اس شکست نے صلیبیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ شاہ لوئیس مسلمانوں کے حسب منشاء شرائط پر صلح کرنے پر تیار ہو گیا اور صلح نامہ تیار ہو گیا۔

اس معاہدہ کے بعد شاہ چار سال تک ساحل عکہ پر رہ کر یروشلم کو آزاد کرانے کے لیے تڑپتا رہا اور آخر ۱۲۵۴ء میں نامراد واپس ہو گیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ اس کے ۳۲ جہاز مسلمانوں نے پکڑے۔ خود شاہ لوئیس معہ اپنے بھائی اور امرائے لشکر کے مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا اور دس ہزار زر سرخ ادا کر کے رہائی حاصل کی۔

تاتاری اور فرنگی گٹھ جوڑ

ہلاکو خان کا تاتاری سیلاب ۱۲۵۷ء میں بغداد پہنچا۔ ظالم ہلاکو خان نے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو قالینوں میں لپیٹ دیا۔ اس طرح اس کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گیا۔ دار الخلافہ کا سر ننگا ہو گیا اور عظمت کا جھومر ماتھے سے گر گیا۔

ہیر الڈلیم لکھتا ہے۔

''ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے صلیبیوں نے مملوک مصر کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اس کا بدلہ انہوں نے اس طرح لیا کہ شاہ آرمینیا اور شاہ انطاکیہ نے ہلاکو خان کو اکسایا کہ وہ مصر پر حملہ کرے اور خود بھی اپنا لشکر لے کر عکہ پہنچے۔ ہلاکو خان نے اسی تعاون اور دوستی کے تحت دمشق کی کئی مسجدوں کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے ان مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ ۱۲۵۹ء کا زمانہ تھا۔ ابھی ہلاکو خان فلسطین کی سرحد تک پہنچ پایا تھا کہ اسے منگو خان خاقان اعظم کے مرنے کی اطلاع ملی۔ ہلاکو خان واپس ہو گیا مگر دس ہزار تاتاری عیسائیوں کی مدد کے لیے چھوڑ گیا۔ پس ہلاکو خان کی اس مدد کے زور پر عیسائی لشکر اور تیزی سے یروشلم کی طرف بڑھا مگر غزہ کے میدان میں الملک الظاہر بیبرس بندقدار نے عیسائیوں اور تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو وہ مار ماری کہ وہ بلاد فلسطین اور شام سے نکل بھاگے۔ بیبرس بندقدار نے آگے بڑھ کر دمشق پر قبضہ کر لیا اس سے اس کا ستارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ یہ واقعہ ۱۲۶۰ء کا ہے۔

مملوک مصر:

ملک الظاہر بیبرس بندقدار، ملک العادت کے پوتے ملک الصالح کا غلام تھا۔ جس وقت ملک الصالح کا انتقال ہوا اس وقت صلیبی قاہرہ کے قریب منصورہ میں مصری فوجوں سے دست و گریباں تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ملک الصالح کی بیوی ملکہ شجرۃ الدر نے اپنی دانائی اور جرأت سے صورت حال کو سنبھالے رکھا اور اس نے ملک الصالح کی موت کو اس وقت تک پوشیدہ رکھا جب تک اس نے ملک الصالح کے بیٹے کی امیروں سے بیعت نہ لے لی۔

لیکن توران شاہ نالائق نکلا۔ اس نے ماں کی توہین کی۔ بحریہ کو ذلیل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء نے توران شاہ کو ٹھکانے لگا دیا اور ملکہ شجر کو تخت پر بٹھا دیا۔ ملکہ شجر نے اپنے سپہ سالار معز الدین سے شادی کر لی مگر معز الدین کو بھی جلد ہی قتل کر دیا گیا اور اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس تمام عرصہ میں سردار بیبرس بندقدار نے جو ایک جرنیل تھا۔ سب حاکموں کی اطاعت اور فرماں برداری کی پھر جب نورالدین کے بعد سیف الدین قطز تخت نشین ہوا تو بیبرس بندقدار نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر اس نے ۱۲۶۳ء میں بامر اللہ کو خلیفہ قرار دے کر مصر میں عباسی خلافت کو زندہ کر دیا۔

غزہ میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے پاس ساحل سمندر پر صرف تیس قلعے بچ گئے تھے۔ ملک الظاہر نے جب اندرونی حالات پر قابو پا لیا تو اس نے صلیبیوں پر کاری زخم لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار بیبرس بندقدار کو بھی صلاح الدین کی طرح ہر وقت جہاد کا خیال ستایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۲۶۵ء میں صلیبیوں سے قیصریہ، حیفہ اور ارسوف کے قلعے چھین لیے اور دوسرے سال یافا، مالفورٹ، انطاکیہ اور بعض دوسرے قلعوں پر بھی قابض ہو گیا۔ جب یہ اطلاع یورپ والوں تک پہنچی تو شاہ فرانس لوئیس نہم نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور وہ ۱۲۷۰ء میں ٹیونس کے ساحل پر اترا مگر قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے لشکر کو طاعون نے آ گھیرا اور شاہ فرانس اس مرض سے مر گیا۔ اس مہم میں شاہ انگلستان بھی شریک تھا اور وہ عکہ پہنچ چکا تھا۔ جہاں اسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی اور وہ بددل ہو کر واپس چلا گیا۔

ادھر بیبرس بندقدار نے ۱۲۷۱ء میں حصن الاکراد اور عکہ کے سامنے نائٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر

لیے۔ پھر بیبرس، عیسائیوں کے غرور کو توڑنے کے لیے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کر اس نے جنگ چھیڑ دی۔ وہ اس جنگ میں مصروف تھا کہ ۱۲۷۵ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اس پار سے حملہ آور ہوئے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور انہیں بیبرس بندقدار کے ہاتھوں دوسری شکست اٹھانا پڑی۔ مگر افسوس کہ ایک مجاہد یعنی بیبرس بندقدار اس جنگ میں ایسا زخمی ہوا کہ اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس عظیم سردار اور مجاہد کا ۱۲۷۷ء میں انتقال ہو گیا۔ بیبرس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا مگر سلطان قلاؤن نے اسے الگ کر کے تخت سلطنت پر خود قبضہ کر لیا۔

عثمانی ترک

مسلمانوں اور منگولوں کی جنگ بلکہ جنگوں میں عثمانی ترکوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ پس قدرت نے ”ترکان عثمان“ کو ایشیائے کوچک کی سلطنت بخش دی۔ دوسری طرف ایران میں ایل خانی سردار ابا قاخان نے حکومت بنالی۔ سلطان قلاؤن کے عہد میں ابا قاخان نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ آرمینیا اور جارجیا کے تیس ہزار عیسائی اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ شام کے عیسائی بھی اس کے ساتھ ہو گئے اور یہ مشترکہ لشکر ۱۲۸۱ء میں حمص میں نمودار ہوا۔ حمص کے قریب سلطان قلاؤن کی فوجوں سے معرکہ آرائی ہوئی لیکن خون ریز جنگ میں ابا قاخان شکست کھا کر بھاگ گیا۔

اس موقع پر سلطان قلاؤن نے کہا۔ ”اگر فرشتے مدد نہ کرتے تو فتح ممکن نہ تھی۔“

ابا قاخان کی واپسی پر صلیبیوں کی شامت آ گئی اور ۱۲۸۵ء میں سلطان نے المرقب اور طرابلس کے عیسائی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر عکہ کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا ملک الجلیل جانشین ہوا۔ اس نے باپ کی مہم کو زور و شور سے جاری رکھا اور عکہ پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ صلیبیوں نے پہلے تو مقابلہ کیا مگر جب انہیں اپنی شکست نظر آنے لگی تو جہازوں میں سوار ہو کر بھاگنے لگے۔ ان میں کئی جہاز ساحل کے قریب ہی غرق ہو گئے۔ کئی جہازوں کو مسلمانوں نے پکڑ لیا اور عکہ فتح ہو گیا۔

اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ ادھر عکہ صلیبیوں سے خالی ہوا اور اس کے ساتھ ہی پورا فلسطین عیسائیوں سے خالی ہونے لگا۔

اس کے چھ سال بعد یعنی ۱۲۹۱ء میں پوپ نکولس نے اٹلی کا بحری بیڑا بھیجا اور قبرص سے شاہ ہنری نے فلسطین کی طرف قدم بڑھائے مگر دونوں ہی ناکام و نامراد واپس لوٹے، یہی نہیں بلکہ ان کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ وہ ساحل فلسطین پر عثلیث اور طرطوس کے قلعے بھی مسلمانوں کے حوالے کر گئے۔

اس کے بعد ۱۲۹۹ء میں منگول تیسری مرتبہ ایل خانوں کی قیادت میں فرات کو عبور کر کے حملہ آور ہوئے اور مملوکوں کو شکست دے کر دمشق پہنچ گئے۔ ایل خانیوں کو بھی صلیبیوں نے بلایا تھا لیکن صلیبی نہ پہنچ سکے اور وہ مایوس ہو کر فروری ۱۳۰۱ء میں مفتوحہ علاقے خالی کر کے لوٹ گیا۔ ۱۳۰۳ء میں ایل خان غزن مر گیا اور یوں بیت المقدس کو منگولوں کے خطرے سے مستقل طور پر نجات مل گئی۔

صلیبیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے مگر وہ کوشش کرتے رہے۔ شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اس کے بعد بھی اپنی کوشش میں لگے رہے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران ترکوں نے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنا دفاع

مضبوط کر لیا۔

پس ہیر الڈلیم مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے۔

”ہم یروشلم کی صلیبی ریاست بحال نہ کر سکے جس کے لیے صدیوں تک ہمارے آباؤ اجداد برسرِ پیکار رہے اور آج بھی وہ مزارِ مسیح کے سائے تلے محو خواب ہیں۔“

۱۳۶۵ء سے ۱۳۶۷ء تک پیٹر آف سائپرس وغیرہ مجاہد بن کر مصر و شام میں لڑتے رہے مگر ناکام رہے۔ ۱۴۵۳ء میں محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا تو پوپ ثانی نے قسطنطنیہ کی واپسی کے لیے جنگ کو مذہبی رنگ دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۵۱۶ء میں ترکان عثمان نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکوں کے زیر کمان آ گیا۔

ترک دورِ حکومت میں بیت المقدس اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے عروج پر پہنچ گیا۔ ۱۵۳۶ء میں سلطان سلیم اعظم نے شہر کی فصیل کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ سات سال میں مکمل ہوئی۔ فصیل کا گھیراؤ ڈھائی میل ہے اور وقتی پیمائش کے لحاظ سے فصیل ۱۲۳۵۰ فٹ لمبی ہے۔

جولائی ۱۸۱۷ء میں ترکی نے ایک فرمان کے ذریعہ مزارِ مقدس شاہ فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ ۱۸۰۸ء میں گرجا میں آتش زنی کی واردات ہوئی جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ یہودیوں کی سازش تھی۔

۱۸۳۱ء میں برطانوی وزیر اعظم بیت المقدس آیا۔ اس کے دورہ کے بعد اس علاقے میں فتنے جنم لینے لگے جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئے۔

۱۸۳۲ء میں مصر کے محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ مئی ۱۸۳۳ء میں ایک صلح نامہ کے ذریعہ محمد علی پاشا نے شام و فلسطین اور مصر کی گورنری کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا منظور کیا۔

۱۸۳۹ء میں پہلا برطانوی قونصل بیت المقدس آیا۔ اس کے ایک سال بعد فرانس کی شہ پر محمد علی نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر دی۔ مگر شکست کھا کر شام و فلسطین سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

۱۸۵۶ء میں سلطان ترکی نے اپنی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔ اسی سن میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر قرار دیے گئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت دی گئی لیکن وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

چالاک یہودی

یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت ملی تو انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہی وہ قدم ہے جس کے زور پر یہودیوں نے سازشیں کرنا شروع کیں۔ عالمی صیہونیت نے انہیں شہ دی اور انہوں نے وہاں اپنی نوآبادیاں بنانا شروع کر دیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے دور اقتدار میں نصرانیوں اور یہودیوں سے انتہائی فراخدلانہ سلوک روا رکھا مگر اس کا احسان ماننے کی بجائے ان دونوں اقوام نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

سلطان محمود ثانی ۱۸۵۹ء میں بیت المقدس آئے اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی۔ اس وقت سلطان نے یہودیوں کی ان شکایات کی چھان بین کی جو وہ سلطانی عمال کے خلاف کرتے تھے مگر تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تمام شکایات جھوٹی اور بالکل بے بنیاد تھیں۔ اسی طرح ۱۸۶۲ء میں ایڈورڈ ہفتم بیت المقدس کی زیارت کو آیا تو اس نے بیت المقدس میں نابیناؤں کے لیے ایک اسکول جاری کیا۔ یہ پہلا غیر ملکی ادارہ تھا۔ اسی وقت یہودیوں کو پیش کش کی کہ اگر

یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دی جائے تو وہ نہ صرف ترکی کے تمام قرضے ادا کردیں گے بلکہ آئندہ ضرورت پڑنے پر ان کی حسب ضرورت مدد بھی کریں گے۔ اس پیش کش کا سلطان عبدالحمید نے برا منایا اور یہودی رہنما کرزل کو سختی سے جواب بھجوایا کہ وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ کیونکہ عثمانی سلطنت کا ہر فرد وبشر اس طرح کی پیش کش کو اپنی توہین سمجھتا ہے اور اگر یہودی اپنی ساری دولت بھی پیش کریں تو بھی انہیں فلسطین میں ایک انچ زمین بھی نہیں دی جاسکتی۔

ادھر سے مایوس ہوکر یہودیوں نے قیصر جرمنی کا دامن پکڑنے کی کوشش کی کیونکہ وہ سلطان مرحوم کا ذاتی دوست تھا۔ پس قیصر نے یہودیوں کے لیے کوشش بھی کی لیکن سلطان نے اس کی بات رد کردی۔

آخری جنگ

تاریخ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ جب سلطان نے یہودیوں کا مطالبہ یکسر رد کردیا تو قیصر جرمنی کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے سلطان کو انجام بد کی دھمکی دی۔ پھر وہ وقت بھی آگیا کہ ترکی کی انجمن ”اتحاد و ترقی“ نے سلطان کو معزول کرکے محمد ارشاد کو خلیفہ بنا دیا۔ اسی دور میں خلافت ترکی نے نیا آئین بنا کر شام اور فلسطین کی خودمختاری تسلیم کرلی۔ لیکن اس وقت تک برطانیہ نے لارنس آف عربیہ کے ذریعے ترکوں کے زیر اقتدار عرب علاقوں پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرلیا تھا۔ لارنس نے یہودیوں کو بھی ملالیا اور پھر عربوں نے ہر جگہ ترکوں کے خلاف بغاوت کردی۔ اس صورت حال کے پیش نظر آٹھ اور نو دسمبر ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب ترکوں نے بیت المقدس خالی کردیا۔ پھر دس دسمبر ۱۹۱۷ء کی صبح جنرل شیا بیت المقدس پہنچا۔ ترکوں نے دوپہر کے وقت چابیاں اس کے حوالے کردیں اور گیارہ دسمبر کو جنرل ایلن بائی، مصری اور فلسطینی افواج کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔

اس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کا مقدس شہر ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں تلے آگیا۔ اس مرتبہ مصری اور فلسطینی ان کی مدد کررہے تھے۔ برطانیہ کے انگریز اسے آخری صلیبی جنگ قرار دیتے ہیں جسے تیرہویں صلیبی جنگ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایلن بائی کے یروشلم میں داخلے سے پہلے سات سو پچیس سال تک یروشلم نے کبھی کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کی صورت نہ دیکھی تھی۔

برطانیہ کے وزیراعظم چرچل نے اپنی تاریخ ”جنگ عظیم“ میں لکھا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترک بیت المقدس سے دست بردار ہوگئے۔ ان کے چار سو سالہ منحوس دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف باشندگانِ بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا۔

اسی طرح مسٹر نلسن تاریخ جنگ جلد ۲۴ میں پرمسرت الفاظ میں یوں رقم طراز ہے۔

”آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور اگر سینٹ لوئیس اور رچرڈ شاہ انگلستان اس جرات افزا افواج کو دیکھتے تو ان کی روحیں حیران رہ جاتیں۔ کیونکہ بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجزیری اور ہندی مسلمان، عرب قبائل، ہندوستان کے ہزارہا فرقوں کے ماننے والے افریقی، حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھی جنہوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔“

افسوس کہ وہ مسلمان جنہیں بیت المقدس کی حفاظت کرنی تھی وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ مل گئے تھے۔ جنگ عظیم اول میں شام، عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا

۲/۵ حصہ تھے۔

جارج ٹاؤن، گرانڈ ورک آف برٹش ہسٹری میں لکھتا ہے۔

”بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ اور تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بائی بڑے دن سے پندرہ دن پہلے بیت المقدس میں داخل ہوا۔“

یہی مصنف آگے جاکر لکھتا ہے۔

”قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بائی نے فلسطین میں شان دار پیش قدمی کی اور اس پیش قدمی کا سہرا خاص طور پر ہندوستانی افواج کے سر ہے۔“

اسی طرح ٹامسن نے اپنی کتاب ”عرب میں لارنس کے ساتھ“ میں لکھا ہے۔

”ایلن بائی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لاکھوں مسلمانوں کی متبرک زمین ہے۔“

اسی طرح برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے چیخ کر پارلیمنٹ میں اعلان کیا۔

”آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے۔“

فتح بیت المقدس کے بعد جنرل ایلن بائی کو حکومت برطانیہ نے دیگر اعزازات کے علاوہ پچاس ہزار پونڈ کا نقد انعام دیا اور جارج پنجم نے اس کی خدمات کا خاص طور پر اعلان کیا۔

جلال الدین سیوطی ایک مستند حوالے سے لکھتا ہے کہ:۔

”بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے ۴۹۱ھ تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات دن تک مسلمانوں کی بڑی تعداد کو بے دریغ تہہ تیغ کرکے جام شہادت پلایا۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ میں ۷۰ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا اور صخرہ سے سونے چاندی کے برتن اور بے شمار دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھی، نکال کرلے گئے۔ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کو خدائے تعالیٰ نے بیت المقدس کی آزادی کے لیے مامور کیا۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ شیر دل اور دہکتی ہوئی آگ کا پتلا تھا..... مگر آہ! بیت المقدس پھر غلام ہوگیا اور اس کے سقوط نے ترکی کے زوال کو سہارا دیا۔“

تاریخ شاہد ہے کہ بیت المقدس نے ترکوں کے عہد میں زبردست ترقی کی اور اس مقدس شہر میں مکروہات پر مکمل پابندی عائد رہی تھی۔

مقدس یروشلم کا امریکی مصنف اس دور کے بیت المقدس کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

”قدیم شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ شہر کا محل وقوع ہیرود اور اس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ بعض مقامات پر قدیم محراب اور عمارتیں اب تک قائم ہیں لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک داؤد اسٹریٹ، یافہ گیٹ سے مشرقی جانب چلتی ہوئی شہر کے دوسری طرف سینٹ اسٹیفن گیٹ سے جا ملتی ہے۔ کرسچین اسٹریٹ، داؤد اسٹریٹ سے کلیسائے نشور تک جاتی ہے اور ایک تیسری گلی شمال کے باب دمشق کو جنوب کے صہیون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم زمین خالی نظر آئے گی۔ گو یہ شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے لیکن ۱۳۵ ایکڑ رقبہ مسجد اقصیٰ میں گھرا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں میں گھری ہوئی ہے اور اس سے دوگنی زمین مختلف مذاہب کی

عبادت گاہوں مساجد، گرجا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ یہ بطور رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتیں اس لیے بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ ۵۵ ہزار آدمی ایک سوا ایکڑ زمین پر آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان و مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔"

بیت المقدس کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس شہر میں ہر طرف مینار ہی مینار دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی گلی یا کوچہ ایسا نہیں جہاں مسجد یا گرجا نہ ہو۔ مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۳۷ مساجد اور ہیں اور چھوٹے بڑے گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد ۲۰ کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گھنٹہ بعد شہر کی فضا عبادت کے لیے بلاتی ہوئی گھنٹیوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اللہ اکبر کی صدا مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔"

شہر کے انتظام کے لیے سلطان ترکی نے "پاشا" کو مقرر کر رکھا ہے جس کی انتظامی کونسل ۹ مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رکن پر مشتمل ہے۔ اس شہر میں ہر ملک کے قونصلیٹ موجود ہیں اور وہ تمام امور جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت اسی ملک کا قونصلیٹ کرتا ہے لیکن اگر فریق مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔

پورے شہر میں نہ کوئی اوپیرا ہے اور نہ کسی کھیل یا کنسرٹ کی اجازت ملتی ہے۔ تمام بازار آفتاب غروب ہوتے ہی بند کردیے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ جلد سو جاتے ہیں اور صبح کو جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ زمانہ کی تہذیبی ترقیوں کا ابھی اس شہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ قدیم شہر کی دیواروں سے باہر شمال و مغرب میں پچھلے کئی برسوں سے ایک نیا یروشلم عالم وجود میں آ گیا ہے۔ اس نئے یروشلم نے مختصر عرصہ میں بہت ترقی کرلی ہے۔ اس نئے شہر یروشلم میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت یہودیوں کی آبادکاری پر پابندی ہے اس کے باوجود وہ مسلسل چلے آرہے ہیں۔

ڈاکٹر رابنسن کے مطابق ۱۸۳۸ء میں شہر کی آبادی گیارہ ہزار تھی۔ ان میں تین ہزار یہودی تھے۔ ۱۸۴۹ء میں ولیم کے مطابق یہودیوں کی تعداد تین ہزار سے بڑھ کر سات ہزار ہوگئی تھی۔ پھر ۴۵ سال بعد اس کی آبادی میں دس گنا اضافہ ہوا۔ یہودی اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے کی فکر میں رات دن کوشاں رہتے تھے۔ یہودی ہاتھ پیر پھیلاتے رہے تھے مگر عربوں نے حالات کا رخ نہ پہچانا اور اپنی سادہ لوحی میں لارنس کا شکار ہوگئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ برطانیہ نے عربوں کو اس جنگ میں فریب دے کر اپنے ساتھ ملایا تھا اور ان سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان پر ان کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی مگر ۱۹۲۰ء کی صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کے زیر اثر کردیا گیا اور سر رابرٹ فلسطین کا پہلا ہائی کمشنر بن کر بیت المقدس پہنچا۔ رابرٹ خود یہودی تھا اور اس نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔

برطانیہ کے اس مصنف نے لکھا ہے۔

"اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا رابرٹ کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس کے لیے جو سازش پس منظر میں پوشیدہ ہے۔ اس سے بے خبر ہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رابرٹ کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنادیا ہے۔"

رابرٹ کے آتے ہی بیت المقدس میں یہودیوں کے آنے کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور وہ

برطانیہ کی شہ پر اور کھل کھیلے۔ آخر ۱۹۳۶ء میں "عرب ہائی کمیٹی" قائم ہوئی جس کی اپیل پر برطانیہ کے "مسلم کش" رویہ اور یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومت برطانیہ نے مفتی صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کردیے۔ آپ مسجد اقصیٰ میں اعتکاف میں بیٹھ گئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کرلیا لیکن مفتی اعظم بھیس بدل کر اس محاصرے سے نکلے اور شام سے ہوتے ہوئے لبنان پہنچ گئے۔ یہ وہی سال تھا جب یہودیوں نے حکومت برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ یہودی فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ پس ملک گیر فسادات شروع ہوگئے اس طرح بیت المقدس کی گلیاں بار بار انسانی خون سے رنگین ہوئیں۔ یہودی برطانیہ کے تعاون سے روز بروز طاقت پکڑ رہے تھے۔

الحاج الیاس برنی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں۔

"القدس میں یہودیوں کے نئے نئے محلے بن رہے ہیں۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی بن رہی ہے۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو بہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان قرار دیا ہے اور ریلوے ٹائم بھی عبرانی زبان میں شائع ہونے لگے ہیں۔"

محمد عاشق میرٹھی لکھتے ہیں۔

"قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اندرون شہر فصیل سے محصور ہے جس کے سات دروازے ہیں۔ باب داؤد اور باب المغاربہ، مشرق میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب الساحرہ، باب النصرہ اور باب الجدید ہیں۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد ابا صیری، شیخ قرمی، شیخ محمد المثبت، شیخ بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین رومی، شیخ فرید اور شیخ حسن کے مزارات ہیں۔ جو زیارت گاہ عوام ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شداد بن اویس انصاری اور عبادہ بن ثامت کے مزارات ہیں۔ کوہ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار ہے۔ اس کے متصل قبہ شہداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب حضرت سلمان فارسی دفن ہیں۔ شہر کے شمالی جانب سیدنا عکانہ، سیدنا قیم اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا سلطان ابرہیم ادھم اور شیخ حسن راعی کے مزارات ہیں۔"

اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن نے "راہِ وفا" میں جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی اس طرح لکھا ہے۔

"ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے زمینوں کے ٹکڑے وقف کردیے تھے جن پر ان ملکوں کے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لیے مسافر خانے تعمیر ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناظر حسن انصاری نے "زاویہ ہندی" کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستان شہداء میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہید ساتھی دفن ہیں۔ صحن حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومت برطانیہ کا اثر ہے جس کی وجہ سے اس سرزمین قدس پر ہنگامہ دار و گیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق ان کی معبد گاہیں، جائیدادیں اور جان و مال خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا ہے یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ حالانکہ آج سے ستر

برس قبل الخلیل (حبرون) کو جاتے ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ماء شورم (یعنی سو گھر) تھی۔ قدیم شہر میں بیس نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور شہر میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۳۸ مساجد ہیں لیکن جو عظمت اور حرمت مسجد اقصیٰ کو حاصل ہے اس کے مرتبہ کو کوئی اور مسجد نہیں پہنچتی۔''

خلیفہ ثانی:

خلیفہ ثانی یعنی حضرت عمرؓ کا زمانہ اسلامی تاریخ کا بہترین دور ہے۔ چند برس کے اندر مسلمانوں نے عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر کے علاقے فتح کر لیے۔ ان تمام جنگوں کا احوال اس جگہ تفصیل سے تو بیان نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب، یہ ناول، یہ تاریخی صحیفہ صرف فلسطین اور بیت المقدس تک محدود ہے لیکن اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے تا کہ بیت المقدس کی تمام و کمال عظمت کا نقشہ آپ کی نظروں کے سامنے آ جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ خلافت ۶۳۴ء سے ۶۴۵ء تک بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ستائیسویں برس میں اسلام قبول کیا۔ آپ قریش کے قبیلہ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کو جوانی میں شہسواری، پہلوانی، خطابت اور فنونِ سپہ گری میں کمال حاصل تھا اور آپ کی اس غیر معمولی قابلیت کی بناء پر قریش مکہ نے آپ کو عہدۂ سفارت پر مامور کیا تھا۔ آپ کی عظمت و جرأت کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے اسلام لانے سے پہلے مسلمان پوشیدگی سے نماز ادا کرتے تھے مگر آپ کے اسلام لانے کے وقت مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کھلے میدان میں نماز ادا کی۔ ہر چند کہ اس وقت حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ ان میں موجود تھے مگر مسلمان پھر بھی فریضہ نماز پوشیدگی میں ہی ادا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چند سال بعد آپ نے حضور نبی کریم ﷺ کے حکم سے بیس آدمیوں کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف اعلانیہ ہجرت کی۔ مدینہ میں آپ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور ہر جنگ میں اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ عہد صدیقیؓ (حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ) میں آپ صلاح کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ آپ کی قابلیت اور اسلام کی بے لوث خدمت کے پیش نظر حضرت ابوبکر صدیق نے آپ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

عراق و ایران

اس وقت ایران کی مجوسی (آتش پرست) سلطنت کا شمار دنیا کی عظیم اور طاقت ور سلطنتوں میں ہوتا تھا۔ عراق اس وقت ایران کا ایک حصہ تھا۔ ایرانی سلطنت اور عرب کی اسلامی سلطنت کی حدود میں چند نیم آزاد ریاستیں تھیں جن میں عیسائی آباد تھے۔ ایرانیوں کے ظلم سے تنگ آ کر ان عیسائیوں نے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے امداد کی درخواست کی جس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی کمان میں ایک چھوٹی سی فوج بھیجی۔ حضرت خالدؓ نے ابھی دریائے فرات تک کا علاقہ فتح نہیں کیا تھا کہ انہیں ملک شام کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔

پھر جب حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالی تو انہوں نے ایک بڑا لشکر ایرانیوں کے مقابلے کے لیے بھیجا یہ لشکر قادسیہ تک پہنچا۔ ادھر ایران نے رستم کی ماتحتی میں ایک عظیم لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اس وقت اسلامی لشکر کے سالار مسعودؓ بن ابی وقاص تھے۔ انہوں نے رستم کے سامنے اسلام پیش کیا مگر رستم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں رستم مارا گیا اور ایرانی لشکر بابل تک ہٹ گیا۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے بابل، مدائن اور جلولا پر قبضہ کر لیا۔ اب شہنشاہ ایران یزدجرد خود خراسان پہنچا

اور اس نے مسلمانوں کے خلاف ڈیڑھ لاکھ کا لشکر روانہ کیا۔ ادھر حضرت عمرؓ نے تیس ہزار فوج مسلمانوں کو کمک کے طور پر بھیجی۔ چنانچہ نہاوند کے مقام پر ایک شدید میدانِ کارزار گرم ہوا جس میں مسلمان کمک کے کمانڈر حضرت نعمانؓ نے شہادت حاصل کی مگر اسلامی لشکر کو فتح حاصل ہوئی اور مسلمانوں کا سلطنت ایران پر قبضہ ہو گیا۔

اس جنگ کے نتیجہ میں کوفہ، بصرہ اور موصل کے شہر آباد ہوئے۔

فلسطین اور شام:

ادھر حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں اجنادین کے میدان میں رومی لشکر کو زبردست شکست دی اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اسلامی لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اسلامی لشکر نے دمشق، اردن اور حمص پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت شاہ روم ہرقل نے ایک متحدہ لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اس کا مقابلہ مسلمانوں سے یرموک کے میدان میں ہوا اور حضرت خالدؓ بن ولید نے رومیوں کو شکست دے کر سارے شام پر قبضہ کر لیا۔

دوسری طرف فلسطین کے محاذ پر حضرت عمروؓ بن العاص نے چند مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد ''بیت المقدس'' کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے صلح کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی اور ان کی درخواست پر خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

فلسطین کے بعد مصر جہاں شہنشاہ روم کا باجگزار مقوقس حاکم تھا۔ مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ اس طرح لیبیا سے ابی سینیا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

مورخ واقدی کے بیان کے مطابق مٹھی بھر صحرا نشینیوں نے حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بارہ برس کے قلیل عرصہ میں چھتیس ہزار شہر اور قلعے، ایک ایک دن میں نو نو شہر فتح کیے۔

واقعہ جسر کے سوا مسلمانوں نے کہیں بھی شکست نہ کھائی۔ مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات کا سبب عیسائیوں نے یہ بتایا کہ ایران و روم کی سلطنتیں اپنی خانہ جنگیوں، باہمی آویزشوں اور مذہبی اختلافات کے باعث اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ مسلمانوں کے لیے ان کو مغلوب کرنا آسان امر تھا۔ مگر یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ خانہ جنگیوں کے باوجود ایران اور روم کی سلطنتیں اپنے مادی ذرائع، اسلحہ و ہتھیار اور سپاہیوں کی تعداد کے لحاظ سے عربوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔ عرب جیسی بے مایہ قوم کسی جنگی معرکہ میں بیالیس ہزار سپاہیوں سے زیادہ جمعیت فراہم نہ کر سکی اور ان کا مقابلہ ڈھائی لاکھ سے چالیس لاکھ سپاہیوں کے لشکر جرار سے ہوتا تھا۔ فوجی تنظیم و تربیت اور آلات جنگ کے لحاظ سے ایرانیوں اور رومیوں کی برتری ایک مسلمہ حقیقت تھی۔

اس وقت کے آلاتِ جنگ مثلاً زرہ بکتر، جوشن، خود، چار آئینہ وغیرہ کے استعمال سے ان کے سپاہی بخوبی واقف تھے۔ اس کے برعکس مسلمان سپاہی چمڑے کی زرہیں استعمال کرتے تھے۔ ان کے تیر معمولی اور نیزے معمولی قسم کے ہوتے۔ جنگ قادسیہ کے شروع ہونے سے پہلے ایک ایرانی افسر نے عربوں کے تیروں کو دیکھ کر حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا کہ ''یہ تکلے ہیں۔''

ٹھوس حقائق کے پیش نظر خلفاء اربعہ کے زمانہ

میں عربوں کی فتوحات کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ مسلمانوں کی فتوحات کا حقیقی راز ان کے جذبۂ ایمان میں مضمر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کو وہ سعادت ازلی سمجھتے تھے اور اس کے حصول کی خاطر وہ ہر قسم کے مصائب جھیلنے پر کمر بستہ رہتے تھے۔ مسلمانوں کے آہنی عقیدہ اور عزم بالجزم کے سامنے پہاڑوں کی حقیقت رائی کے برابر تھی۔ اس عظیم الشان ہتھیار سے مسلح ہو کر مسلمان سپاہی اپنے حریفوں کے جرار لشکروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیتے تھے۔

۲۔ مسلمانوں کا اخلاق حسنہ ان کی عظیم الشان فتوحات کا دوسرا راز تھا۔ رسول ﷺ کی ۲۳ سالہ تربیت نے عرب قوم کے افراد کو بے چوں وچرا اطاعت، عزم واستقلال، سردار بننے کی قابلیت اور اعتماد نفس کا سبق پڑھایا تھا۔ آخری فتح حاصل کرنے میں کسی قوم کا بلند اخلاق اور مصیبتوں کے جھیلنے کا عزم سب سے پہلے اپنا کام کرتے ہیں۔ قوم کے مالی ذرائع یا ہتھیاروں کی کثرت کا مقام دوسرے یا تیسرے درجہ پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عرب کے مسلمان ایرانیوں اور رومیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھے۔ اس لیے ان کی آخری فتح یقینی تھی۔

۳۔ مسلمانوں کا جذبہ اتحاد واتفاق ان کی فتوحات کا تیسرا سبب تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی بے نظیر تعلیم کے باعث عرب کے جنگ جو قبیلے ایک ایسی متحدہ قوم بن گئے تھے جس کے افراد ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی مانند تھے۔ وہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوتے تھے۔ اس کے برعکس مخالفوں میں بغض و عناد تھا۔ ایران اور روم کی رعایا آقا وغلام اور امیر و غریب کی تمیز تھی۔ محکوموں اور حاکموں کے درمیان نفرت اور نفاق کی خلیج تھی۔ عربوں کے قومی اتحاد کے مقابلے میں ایرانیوں اور رومیوں کی شکست ان کے طبقاتی نزع کی وجہ سے یقینی تھی۔

۴۔ شام میں غسانی قبیلے کے لوگ اور سلاطین حیرہ (علاق) قومیت کی بناء پر عرب تھے۔ یہ لوگ قیصر روم اور ایران کے کسریٰ کے مظالم سے نالاں تھے۔ عیسائی ہونے کے باوجود ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ ابتدائی جھڑپوں کے بعد تعاون کیا اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے ان کے معاون بن گئے۔ ان کے تعاون سے مسلمانوں کو فتوحات حاصل کرنے میں آسانی ہوگئی۔

۵ مسلمان جرنیلوں میں مکمل اتفاق واتحاد تھا۔ ان کی اطاعت امیر کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیا تو انہوں نے بخوشی سالاری کے بجائے حضرت ابوعبیدہ کی ماتحتی میں کام کرنا پسند کیا۔ حضرت عمرؓ ذاتی طور پر تمام محاذاتِ جنگ اور فوجوں کی نقل وحرکت کے متعلق احکام جاری کرتے تھے۔ اس کے برعکس ایرانی اور رومی جرنیلوں میں آپس میں نفاق اور بغض تھا۔ اس لیے ان کی ریشہ دوانیاں ان کی شکست کا باعث ہوئیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی

حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی بھی ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس واقعہ یا حکم میں علم و حکمت، تسلیم ورضا اور حقوق اور ان کے استعمال کے کتنے ہی پہلو پائے جاتے ہیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی ۶۳۸ء مطابق ۱۷ ہجری میں ہوئی۔ کیونکہ ملک شام کی فتوحات اور واقعات میں حضرت خالدؓ کی معزولی کے مختلف پہلو نکلتے ہیں جن پر مورخین نے طرح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں۔ عام مورخین کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عنان حکومت

سنبھالتے ہی حضرت خالدؓ کو معزول کر دیا اور شاید یہ ان کی خلافت کا سب سے پہلا حکم تھا۔ ابن اثیر نے اس سلسلے میں یہ غلطی کی ہے کہ انہوں نے خود ہی ۱۳ ہجری میں خالدؓ کی معزولی بیان کی ہے اور پھر ۱۷ ہجری میں ان کی معزولی کا ایک الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی طرح کے واقعات نقل کیے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ حضرت عمرؓ جناب خالدؓ کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان سے ناراض ہوئے تھے مگر آغاز خلافت میں انہوں نے اس سے درگزر کیا تھا مگر خالدؓ بن ولید کی یہ عادت تھی کہ وہ حساب کے کاغذات دربار خلافت نہیں بھیجتے تھے۔ اس لیے ان کو تاکید کی گئی کہ وہ آئندہ اس کا خیال رکھیں مگر حضرت خالدؓ نے صاف جواب دینے کے بجائے بات کو الجھا دیا۔ انہوں نے خلیفہ حضرت عمرؓ کو لکھا۔

”میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔“

حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ کا یہ سخت جواب پسند نہیں آیا۔ وہ رقم کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ پھر بھلا وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیوں خالدؓ کے ہاتھ میں دے سکتے تھے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت خالدؓ کو لکھا۔

”تم اس شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو۔“

حضرت خالدؓ نے خلیفہ کی یہ شرط منظور نہیں کی اور اس بناء پر انہیں سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ انہیں ابوعبیدہؓ بن الجراح کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷ ہجرہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالدؓ نے ایک شاعر کو خوش ہو کر دس ہزار روپے انعام میں عطا کر دیے۔ چنانچہ اسی وقت پرچہ نویسوں نے حضرت عمرؓ کو پرچہ کے ذریعے اطلاع دی۔ اس اطلاع کی بناء پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا۔

اگر خالدؓ نے شاعر کو دس ہزار انعام میں دیے ہیں اور اپنی گرہ سے دیے ہیں تو اسراف کیا ہے اور اگر اس نے بیت المال سے لے کر دیے تو خیانت کی۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔“

خالد بن ولیدؓ جس کیفیت سے معزول کیے گئے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ قاصد جو معزولی کا خط لے کر دربار خلافت مدینہ پہنچا تھا۔ اس نے مجمع عام میں خالدؓ سے دریافت کیا۔

”یہ انعام تم نے کہاں سے دیا؟“

خالد اگر اقرار کر لیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ انہیں درگزر کیا جائے۔ لیکن حضرت خالدؓ خطا کے اقرار پر رضا مند نہ ہوئے۔ مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر حضرت خالدؓ کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لیے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی۔

یہ واقعہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ ایک ایسا سپہ سالار جس کی نظیر لشکر اسلام میں موجود نہ تھی۔ جس کی تلوار نے عراق وشام کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور وہ دم نہیں مارتا۔ یہ واقعہ ایک طرف تو حضرت خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی کھلی ہوئی شہادت ہے اور دوسری طرف خلیفہ اسلام کی سطوت و جلال کا بھی ایک کھلا ہوا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ نے حمص پہنچ کر ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا۔

”امیر المومنین عمرؓ نے مجھے شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجھے معزول

کردیا گیا۔"

حضرت خالدؓ کے اس کلام پر ایک سپاہی نے کھڑے ہوکر کہا۔

"اے سردار! چپ رہ، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔"

خالدؓ نے جواب دیا۔

"ہاں، مگر عمرؓ کے ہوتے ہوئے فتنہ کا کیا احتمال ہے۔"

پھر حضرت خالدؓ مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کی۔

"اے عمرؓ...... خدا کی قسم تم میرے معاملے میں ناانصافی کرتے ہو۔"

حضرت عمر نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟"

خالدؓ نے جواب دیا۔

"مالِ غنیمت سے۔" اس کے ساتھ ہی کہا۔

"ساٹھ ہزار سے زیادہ جتنی رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں۔"

چنانچہ بیس ہزار زیادہ نکلے اور وہ بیت المال میں داخل کردیے گئے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ سے کہا۔

"خالد تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے عمالان ملکی کو ایک سرکلر بھیجا جس میں لکھا گیا تھا کہ:۔

"میں نے خالد کو ناراضی یا خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا۔ لیکن چونکہ میں دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں اس لیے میں نے ان کو معزول کرنا بہتر سمجھا۔ تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔"

ان واقعات سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خالدؓ بن ولید کی معزولی کے کیا اسباب تھے اور اس میں کیا مصلحتیں تھیں۔

معزولی کے بعد حضرت خالدؓ مدینہ سے واپس حمص چلے گئے اور آپ نے بقیہ زندگی وہیں گزاری اور وفات پاکر وہیں دفن ہوئے

عمواس کا طاعون

۱۷ہجری کے آخر میں عراق اور شام میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ اس کا زور ۱۸ہجری تک رہا۔ عمواس، ملک شام کا ایک شہر ہے جہاں سے یہ وبا پھیلی تھی۔ اس وبا نے اسلام کی بہت سی مقتدر اور عظیم ہستیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں مقتدر صحابہ حضرت ابوعبیدہؓ، معاذ بن جبلؓ، یزید بن ابی سفیانؓ، حارثؓ بن ہشام اور عقبہ وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً پچیس ہزار مسلمان اس وبا کا شکار ہوئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس وبا کی خبر سے بڑا تردد ہوا اور خود انہیں بھی حفاظتی تدبیر کی خاطر وہاں سے شام جانا پڑا۔ لیکن مقام سرغ پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وبا کا زور بڑھتا جارہا ہے۔ چنانچہ آپ صحابہؓ کے مشورے سے ملک شام سے واپس آگئے۔ تاہم آپ نے ابوعبیدہؓ کو حکم دیا کہ نشیبی مقام کو چھوڑ کر بلند مقام پر افواج کو لے جائیں۔ چنانچہ وہ افواج کو جابیہ لے آئے۔ مگر وہ خود اس وبا کا شکار ہو گئے۔ وہ معاذؓ بن جبل کو اپنا جانشین بنا گئے۔ مگر معاذؓ بھی اس وبا کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے عمروؓ بن عاص کو اپنا جانشین بنایا تھا۔

وبا کے فرو ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے پھر شام کا سفر اختیار کیا کیونکہ اس وبا نے کئی نئے حالات پیدا کر دیے تھے۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں قیصر روم شام پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ فوج کے

ہزاروں افراد اس وبا کا شکار ہوئے جس سے کئی عہدے خالی ہو گئے۔ خلیفہ نے اکثر مقامات کا دورہ کر کے خالی جگہوں پر نئے افسر مقرر کیے۔ حضرت امیر معاویہؓ بن ابوسفیان کو اپنے بھائی یزیدؓ بن ابوسفیان کی جگہ شام کا گورنر مقرر کیا۔ ان انتظامات کے بعد آپ مدینہ واپس آ گئے۔

اس وبا سے نجات ملی تو دوسرے سال یعنی ۱۸ ہجری میں مدینہ اور اس کے نواحی علاقوں میں قحط پڑ گیا۔ حضرت عمرؓ نے نہایت مستعدی سے انتظامات کیے اور ہزاروں مسلمانوں کو بھوکوں مرنے سے بچالیا۔ آپ نے مفتوحہ علاقہ سے غلہ حاصل کیا اور اسے غرباء میں مفت تقسیم کرایا۔ انہوں نے اپنے گھر کے لیے اناج کا کوئی ذخیرہ نہ کیا۔ جب تک دوسروں کو کھانا نہ مل جاتا وہ خود بھی بھوکے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر میرا پیٹ بھر جائے تو مجھے ان کی تکلیف کا کیسے احساس ہوگا؟ چنانچہ آپ نے قسم کھائی کہ جب تک لوگوں کو سیر ہو کر کھانا نہ ملے گا وہ گھی، دودھ اور گوشت نہیں چکھیں گے۔

قیاریہ کی فتح

قیاریہ، بحر روم پر ملک شام کی ایک اہم بندرگاہ تھی۔ شام فتح ہو چکا تھا لیکن یہ شہر اب تک رومیوں کے قبضے میں تھا۔ یہاں سے رومی، شام میں فساد برپا کر سکتے تھے۔ پس ۱۷ھ میں عمروؓ بن العاص نے اس کا محاصرہ کیا مگر وہ شہر کو فتح نہ کر سکے۔ اگلے سال یزیدؓ بن ابوسفیان نے حملہ کیا مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ پھر ۱۹ھ میں امیر معاویہؓ نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر قبضہ کرلیا۔ اب ملک شام کی فتح مکمل ہو گئی تھی۔

بلاذری لکھتا ہے کہ قیاریہ میں تین سو بازار تھے۔ آبادی مخلوط تھی۔ یہاں سے بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ اس کے بعد فرما، بلبیس، قلعہ بابلیون اور فسطاط فتح ہوئے۔ اسکندریہ، مصر کا دارالسلطنت تھا اور رومی طاقت کا ایک اہم مرکز تھا۔ ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے اسکندریہ رومی بحریہ کا مستقر بھی تھا۔ یہاں سے ساحل شام پر بحری حملہ کا خطرہ تھا۔ سکندر اعظم کے مسکن کے علاوہ یہاں عیسائیوں کا سب سے بڑا گرجا سینٹ مارک کیتھڈرل بھی تھا۔ اس کی عمارت کو ملکہ قلوپطرہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اگرچہ وہ رومی مذہب کی عبادت گاہ تھی لیکن عیسائیوں نے اسے گرجا میں تبدیل کرلیا تھا۔

اسکندریہ میں رومی فوجیں بڑی تعداد میں جمع تھیں۔ جب رومیوں کو بابلیون میں شکست ہوئی تو اسکندریہ میں ہر طرف سے فوجیں آ کر جمع ہونے لگیں۔ رومیوں کو اس مضبوط قلعہ پر بڑا ناز تھا۔ رومی بحری بیڑہ بھی یہیں مقیم تھا۔ اسلامی لشکر اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ اسکندریہ سے پندرہ میل مشرق کی جانب رومیوں کے ہراول دستوں نے اسلامی لشکر کی پیش قدمی کو روکنا چاہا لیکن شکست کھا کر اسکندریہ میں پناہ گزیں ہوا۔ عمروؓ بن العاص نے آگے بڑھ کر اسکندریہ کا محاصرہ کرلیا۔ مسلمانوں کے پاس بحری بیڑہ نہ تھا اس لیے وہ رومیوں کو بحری راستے سے ملنے والی فوجی مدد کو نہ روک سکے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے پاس سامانِ حرب کی بھی کمی تھی اس لیے اسکندریہ کا محاصرہ طول کھینچ گیا۔

حضرت عمرؓ کو محاصرہ کے طویل ہو جانے سے پریشانی لاحق ہو گئی۔ انہوں نے جناب عمروؓ بن العاص کو حکم بھیجا کہ جس دن میرا خط پہنچے تمام فوج کو اکٹھا کر کے جہاد پر خطبہ دو اور فوراً حملہ کردو۔ عمروؓ بن العاص نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح ۲۰ھ میں چودہ ماہ کے محاصرے کے بعد اسکندریہ فتح ہوا۔ عمروؓ بن العاص نے اسکندریہ فتح ہونے کی خبر مدینہ بھیجی تو حضرت عمرؓ

فاروق نے مسجد نبوی میں نماز شکرانہ ادا کی۔ اسکندریہ مصر کی کنجی تھا اس لیے مسلمانوں نے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

حضرت عمرؓ سے پہلے اور بعد میں بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں لیکن جو جذبہ ہمت وشجاعت، عدل و انصاف اور حسنِ اخلاق کا فتوحاتِ فاروقی میں نظر آتا ہے وہ کسی اور فاتح کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ان فتوحات کا اگر جائزہ لیا جائے تو دس سال کے قلیل عرصہ میں صرف چین سے لے کر طرابلس تک تمام ممالک کی تسخیر کے واقعات ہی پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک ہی وقت میں اپنے وقت کی دو عظیم (مجوسی اور نصرانی) سلطنتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں جیسی حقیر اور بے سروساماں قوم کا روم اور ایران جیسی عظیم سلطنتوں کو دیکھتے ہی دیکھتے تہہ و بالا کردینا تاریخ کا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے۔

فتوحاتِ فاروقی کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ان ممالک کو زیرِ نگیں کرنے کے لیے وہ ہتھکنڈے ہرگز استعمال نہیں کیے جو فاتحین عالم مفتوحہ علاقوں کو زیرِ تسلط رکھنے کے لیے عام طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ یعنی وحشت و بربریت کا مظاہرہ، عام شہریوں کا قتلِ عام، بستیوں اور آبادیوں کو تاراج کرنا اور دشمن کو بے دست و پا کرنے کے لیے ان کے علاقے کو بالکل پامال کردینا۔ فصلوں اور عمارات کو نذرِ آتش کرنا۔ اس کے برعکس فتوحاتِ فاروقی میں شہروں کو تاخت و تاراج کرنا تو درکنار، درختوں اور فصلوں کو کاٹنے اور پامال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر تلوار اٹھانا قطعی ممنوع تھا۔ سوائے میدان جنگ کے دشمن کا کوئی شخص کہیں قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دشمن سے سوائے میدان جنگ کے اور کہیں دھوکا بازی، فریب اور بدعہدی کی سخت ممانعت تھی۔

فتوحاتِ فاروقی کے دوران مسلمانوں نے جس ملک میں بھی قدم رکھا۔ اپنے عدل وانصاف اور حسن اخلاق سے وہاں کے باشندوں کو اپنا ایسا گرویدہ بنالیا کہ وہ اپنی قوم کے بجائے مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے۔ انہیں شہری اور معاشرتی حقوق عطا کیے جاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے رحمت کا سایہ سمجھتے تھے اور ان کا ساتھ دیتے تھے۔ جنگ یرموک کے موقع پر جب مسلمانوں کو شام کے کچھ علاقے ایک قلیل عرصہ کے لیے خالی کرنا پڑے تو وہاں کے عیسائی روتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ مسلمان پھر وہاں واپس آئیں۔ یہودی ہاتھ میں ریت لے کے کہتے تھے کہ اب ہمارے جیتے جی قیصر یہاں نہیں آسکتا۔

یہ درست ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاتح مثلاً سکندر، چنگیز خان، امیر تیمور اور نپولین جیسے عظیم فاتحین نے ایک قلیل عرصہ میں کئی کئی ممالک ضرور فتح کیے ہیں لیکن ان کی فتوحات کو حضرت عمرؓ کی فتوحات سے نسبت دینا ایسا ہے جیسے زمین کو آسمان سے نسبت دی جائے۔ سکندر اور چنگیز خان وہ فاتح تھے جنہوں نے انسانیت کا بے دریغ قتل عام کیا اور انہوں نے ممالک کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فتوحات دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ وہ پانی کے بلبلے کی طرح آئیں اور مٹ گئیں۔ بے شک چنگیز خان اور سکندر ایک طوفان کی طرح دنیا پر چھا گئے لیکن جب طوفان تھما تو انسانی لاشوں اور عمارتوں کے کھنڈرات کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی فتوحات میں ایک قطرہ خون بلاوجہ نہیں بہایا گیا اور یہ

اس قدر دیرپا ثابت ہوئیں کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسلامی پرچم مفتوحہ علاقوں پر آج بھی لہرا رہا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق صرف ایک فاتح نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ پائے کے جہانگیر اور جہاندار بھی تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جہاں جہاں بھی اسلامی افواج پہنچیں وہاں فوراً نظم و نسق بحال ہوا اور حق وانصاف کا بول بالا ہوگیا۔

تمام بڑے بڑے فاتحین عالم مثلاً سکندر، چنگیز، تیمور، سیزر اور نپولین وغیرہ صرف سپاہی تھے اور انہوں نے اپنی عمریں جنگ کی نذر کردیں۔ وہ لوگ خود فوجوں کی کمان کرتے تھے۔ برخلاف اس کے حضرت عمرؓ فاروق ایک تجارت پیشہ انسان تھے۔ آپ اپنے دورِ خلافت میں ایک بار بھی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور نہ آپ نے کبھی فوج کی کمان کی لیکن ان کا لشکرِ اسلام میدانِ جنگ میں یوں لڑتا تھا جیسے اس لشکر کی پشت پر کوئی تجربہ کار سالار اس کی رہنمائی کررہا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنی جوانی میں ایک بہترین شمشیر زن اور اعلیٰ قسم کے سپاہی تھے۔ آپ نے تمام غزوات میں حصہ لیا تھا لیکن یہ سب کچھ خلافت کے زمانے سے پہلے ہوا تھا۔ جبکہ خلیفہ ہونے کے بعد آپ نے کبھی تلوار کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس لیے ہم اگر حضرت عمر فاروقؓ کو دنیا کا ایک عظیم بلکہ سب سے بڑا فاتح کہیں تو یہ غلط نہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی شہادت

۲۳ ہجری میں آپ حج سے واپس آئے تو جمعہ کے خطبہ میں فرمایا۔

"اے لوگو...... میں نے ایک خواب دیکھا ہے جسے میں اپنی موت کا پیغام سمجھتا ہوں۔"

نمازیوں نے حیرانی سے آپ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا۔

"میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لال رنگ کے مرغ نے مجھے تین ٹھونگیں ماریں۔"

علامہ طبری اور ابن اثیر وغیرہ کا بیان ہے کہ انہی دنوں آپ ایک دن بازار کا گشت لگانے نکلے۔ راستے میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام فیروز جسے ابولولو کہا جاتا تھا آپ کو ملا۔ اس نے شکایتاً آپ سے کہا۔

"مجھے میرے آقا مغیرہؓ بن شعبہ سے بچایئے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ ٹیکس (خراج) وصول کرتے ہیں۔"

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ "تم کتنا ٹیکس ادا کرتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "روزانہ دو درہم ادا کرتا ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ "تم کام کیا کرتے ہو؟"

اس نے بتایا۔ "میں بڑھئی، لوہار اور نقاش ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"تمہارے پیشوں کے پیشِ نظر خراج زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔"

وہ منہ بنا کے جانے لگا تو حضرت عمرؓ فاروق نے پوچھا۔

"سنا ہے تم ہوا سے چلنے والی بہت اچھی چکی بنا سکتے ہو؟"

اس نے "ہاں" میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا۔

"تو پھر ایک چکی میرے لیے تیار کردو۔"

وہ بولا۔ "اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہوگا۔"

حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ قتل کی دھمکی ہے۔ لیکن آپ نے کوئی توجہ نہ دی۔

دوسرے دن ۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ فجر کی نماز کے وقت جونہی حضرت عمرؓ فجر کی نماز کی امامت کے لیے کھڑے ہوئے تو فیروز ابولولو نے دفعتہً پیچھے سے آ کر آپ پر خنجر کے پے درپے چھ وار کیے۔ ایک وار پیٹ کے زیریں حصے میں پڑا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود زخموں کے صدمے سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے نماز پڑھائی مگر اس طرح کہ حضرت عمرؓ سامنے زخموں سے نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ فیروز کو گرفتار کرنے کے لیے بڑھے۔ اس نے ان میں سے تیرہ آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ جن میں سے چھ شہید ہو گئے۔ آخر ایک شخص نے کمبل ڈال کر اسے پکڑا مگر اس نے گرفتار ہوتے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ "میرا قاتل کون تھا؟"

لوگوں نے عرض کیا۔ "فیروز۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "الحمدللہ...... میرا قاتل ایسا شخص نہیں جس نے اللہ کو ایک بھی سجدہ کیا ہو۔"

نمازی آپ کو گھر لے گئے۔ زخم کاری تھا۔ جب دوا دارو سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اکابر ملت نے درخواست کی۔

"اپنا جانشین نامزد کر جائیے۔"

انہوں نے فرمایا۔

"اگر میں کسی کو نامزد کر دوں تو کر سکتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا۔ اور اگر خلیفہ نامزد نہ کروں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا۔

آخر لوگوں کے اصرار پر حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرت سعدؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، یہ چھ صحابہ کرام جن کی اسلام کے لیے بڑی خدمات تھی اور جنہیں حضور پاک ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی۔ نامزد کر کے فرمایا۔

"ان میں سے جس پر کثرت رائے ہو جائے اسے خلیفہ بنا لیا جائے۔"

اور یہ تاکید کی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے ہو جانا چاہیے اور حضرت صہیب رومی کو حکم دیا کہ میری تجہیز و تکفین کے بعد ان چھ اصحاب کو ایک مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک وہ کسی ایک پر متفق نہ ہو جائیں اس وقت تک نہیں کھولنا۔ پھر اپنے صاحب زادے عبداللہ کے متعلق فرمایا کہ وہ مشورے میں شریک رہیں۔ مگر خلافت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر ارکان دو گروہوں میں بٹ جائیں تو عبداللہ کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ نیز کثرت رائے کے بعد اگر کوئی شخص خلافت کا مدعی رہے تو اسے قتل کر دینا۔ فیصلہ ہونے تک صہیب رومیؓ نماز پڑھائیں گے۔

حضرت طلحہؓ اس وقت مدینہ میں نہ تھے۔ ان کے لیے فرمایا کہ تین روز تک انتظار کیا جائے۔ آ جائیں تو بہتر ہے ورنہ مزید انتظار نہ کیا جائے۔ اس کے بعد اپنے جانشین کے لیے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں فرمائیں۔ مہاجرین اور انصار اور ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی ہدایات تھیں۔ لوگوں کو حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

جب حضرت عمرؓ کو بچنے کی کوئی امید نہ رہ گئی تو آپ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہ کو حجرہ نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ عبداللہؓ، حضرت عائشہؓ کے پاس آئے۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ جب عبداللہ نے مدعا بیان کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا۔

"یہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی۔ لیکن آج عمرؓ کو اپنے اوپر ترجیح دوں گی۔"

عبداللہؓ نے واپس آ کر بتایا کہ حضرت عائشہ نے

اجازت دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"الحمدللہ۔ یہی سب سے بڑی آرزو تھی۔" بعد ازاں فرمایا۔

"میرے مرنے کے بعد جنازہ اٹھا کر لے جانا۔ حضرت عائشہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرنا اور کہنا کہ عمرؓ داخلہ کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ اجازت دیں تو بہتر ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔"

اس کے بعد ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے فرزند عبداللہؓ کو وصیت کی کہ میرے بعد میرا قرض ادا کر دینا۔ اگر میرے متروکہ مال سے ادا نہ ہو تو خاندان عدی سے درخواست کرنا۔ ان سے نہ ہو تو کل قریش سے۔ قریش کے علاوہ کسی اور سے نہیں۔" اس کے علاوہ بیٹے سے فرمایا۔

"مجھے اوسط درجہ کا کفن دینا۔ کیونکہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اسے اچھے لباس سے بدل دے گا۔ اور اگر اس کے برعکس ہوا تو وہ مجھ سے چھین لے گا اور بہت تیزی سے چھین لے گا۔ میری قبر بھی معمولی ہونی چاہیے۔ عورتیں میرے جنازے کے ساتھ نہ چلیں۔ اور میری تعریف میں وہ باتیں نہ کہی جائیں تو مجھ میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اللہ مجھے زیادہ جانتا ہے۔ جب تم میرا جنازہ لے کر نکلو تو تیز تیز قدم چلنا کیونکہ اگر مجھ میں اللہ کے نزدیک کوئی بھلائی ہے تو تم مجھے اس جگہ جلدی پہنچا دو گے جو میرے لیے زیادہ بہتر ہے اور اگر میں اس کے برعکس ہوں تو تم اپنے کندھوں سے وہ برائی اتار پھینکو گے جو تم اٹھائے پھرتے ہو۔"

ان وصیتوں کے بعد اور بروز بدھ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ ہجری مطابق ۴ نومبر ۶۴۴ء کو زخمی ہونے کے تین روز بعد حضرت عمر نے بروز ہفتہ ۹ ذی الحجہ وفات پائی اور بروز شنبہ یکم محرم الحرام ۲۴ ہجری کو اپنی خواہش کے مطابق جناب سرور کائنات ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ نماز جنازہ حضرت صہیب رومیؓ نے پڑھائی اور حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت زبیرؓ بن عوام نے آپؓ کو قبر میں اتارا۔ حضرت ابوبکرؓ کا سر شانہ رسالت ﷺ کے متوازی تھا۔ حضرت عمرؓ کا سر شانہ صدیقیؓ کے متوازی رکھا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس سے کچھ زیادہ تھی اور مدت خلافت دس سال چھ ماہ چار دن، وہ سب سے زیادہ عادل، سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے امیر تھے۔

❁❁❁

اب ہم ایک بار پھر فلسطین اور بیت المقدس کی طرف آ رہے ہیں مگر اس سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے۔ اس کی موٹی موٹی باتوں کو ایک بار پھر دہرا لیا جائے اور کتاب پڑھنے والے کو کسی طرح کی الجھن نہ محسوس ہو۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں رومی لشکر کو جنگ اجنادین میں شکست دی تھی۔ جنگ اجنادین جیتنے کے بعد اسلامی فوجوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس لڑائی کے تقریباً ایک ماہ بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسلامی فوجیں بدستور بڑھتی رہیں اور انہوں نے دمشق، اردن اور حمص کے مقامات پر قبضہ کر لیا۔

ہرقل شاہ روم نے مختلف صوبوں سے فوجیں اکٹھی کر کے مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجیں مگر یرموک کی فیصلہ کن جنگ میں حضرت خالدؓ نے انہیں شکست

دے کر منتشر کر دیا۔ اس لڑائی کے بعد مسلمانوں کا سارے شام پر قبضہ ہوگیا۔ ادھر محاذ فلسطین کے سپہ سالار عمروؓ بن العاص نے چند اہم مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ کرلیا۔ رومیوں نے صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی اور ان کی درخواست پر حضرت عمرؓ خود بیت المقدس تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ اس طرح بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

فلسطین کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد عمروؓ بن عاص نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے چار ہزار فوج کے ساتھ مصر پر حملہ کیا۔ ان دنوں مصر پر مقوقس کی حکومت تھی جو شہنشاہ روم کا باجگزار تھا۔ مسلمانوں نے چھوٹے چھوٹے شہر فتح کرنے کے بعد فسطاط کے مضبوط قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ پھر سات ماہ کے محاصرے کے بعد مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ فسطاط سے فارغ ہوکر اسلامی فوج نے اسکندریہ اور طرابلس پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح لیبیا سے ابی سینیا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

دشمنوں کے گٹھ جوڑ

ترقی کے اس دور میں دشمنوں کی کارروائیاں کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ آج کل بیت المقدس میں جو کچھ ہورہا ہے۔ اسے ہم اپنی کھلی آنکھوں سے روز ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ یہودی بے دھڑک فلسطینیوں کے احتجاجی جلسے، جلوسوں، مکانوں، دکانوں اور مسلم محلوں پر بمباری کررہے ہیں۔ بڑے کیا، بچے کیا، عورت کیا، ان یہودیوں کو کسی پر ترس نہیں آتا۔ یہ ٹینکوں کے زور پر محلوں کو بم مار کر ملبہ بنا دیتے ہیں۔ اسکول کے بچے بچیوں پر مشین گنیں کھول دیتے ہیں۔ روز صبح سے شام تک بیت المقدس کے کسی نہ کسی محلے میں مسلح یہودی یلغار کرتے گھس جاتے ہیں۔ توڑ پھوڑ اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔ انہیں کوئی روکنے یا منع کرنے والا نہیں۔

مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہودیوں نے بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ کبھی قبول نہیں کیا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جو حال مسلمانوں کا تھا وہی حال آج بھی ہے اور اس کا ثبوت ٹی وی کے وہ خوف ناک مناظر ہیں جو روز اسکرین پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہودیوں کے بلڈوزر مسلمانوں کے مکانات، دکانیں توڑ پھوڑ کر ملبہ بنا رہے ہیں۔ مگر وہ یہودی عمال کو دکھائی نہیں دیتے۔ اس لیے کہ طاقت کا توازن یہودیوں کے حق میں ہے۔ اس لیے کہ برطانیہ اور امریکا یہودیوں کے ساتھی ہیں۔ اس لیے کہ امریکا یہودیوں کا سرپرست ہے۔ اس لیے کہ امریکا کی پارلیمنٹ میں یہودیوں کا پورا پورا اثر ورسوخ ہے۔ اس لیے کہ امریکا کی حکومت دراصل امریکا کی نہیں بلکہ یہودیوں کی حکومت ہے۔ بظاہر حکومت میں عیسائی بھی ہیں مگر مسلمانوں کے خلاف عیسائی بھی یہودی بن جاتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ امریکا میں نصرانی حکومت نہیں بلکہ یہودی حکومت ہے اور وہاں یہودی قانون چلتا ہے۔

امریکا کے اس جانب دارانہ قانون نے امریکا کے رہائشی مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنادیا ہے۔

پاکستان کے ایک سابق ممتاز سفارت کار نے جن کا نام قطب الدین عزیز ہے، برطانیہ اور امریکا سے واپسی پر حکومت کی توجہ بھارت، اسرائیل اور انتہا پسند عیسائی لابی کے گٹھ جوڑ کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ حکومت پاکستان اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکا کو آگاہ کرے اور پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف سے

جماعتی گٹھ جوڑ اور اس کے زہر آلود پروپیگنڈے کا توڑ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس زہریلے پروپیگنڈے کا توڑ سفارتی اور ابلاغ عامہ کی سطح پر کرنا پورے عالم اسلام کی ذمہ داری ہے۔

پاکستانی سفارت کار نے ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد پاکستان کے علاوہ عام مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اسرائیل، امریکا، برطانیہ اور بھارت کی انتہا پسند لابی کے حوالے سے جن حالات کی نشان دہی کی ہے وہ کوئی راز نہیں۔ یہی لابی حال ہی میں ایک کنونشن کے دوران فلسطین کو مکمل طور پر اسرائیل کے حوالے کرکے عربوں کو فلسطین سے نکالنے کا مطالبہ کرچکی ہے اور اسرائیل آج کل اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔

حکومت مصر کے مطابق ہزاروں فلسطینی ہجرت کرکے مصر پہنچ چکے ہیں اور اسرائیلی فوج مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی املاک کی تباہی میں مصروف ہے۔ امریکا اور تمام بڑی عیسائی طاقتیں اس پر مہر بہ لب ہیں اور اقوام متحدہ بھی خاموش ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ پاکستان میں ''دینی جماعتوں'' کی کامیابی کو مغرب کے خلاف خطرے کی گھنٹی قرار دے رہے ہیں۔ امریکا، آسٹریلیا، فرانس اور برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ نہایت ناخوشگوار واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مساجد پر چھاپے اور شک وشبے کی بناء پر گرفتاریاں، مسلمانوں کے ساتھ توہین آمیز رویہ اور خواتین کی تذلیل نے ان ملکوں میں جمہوریت اور انسانی حقوق کے احترام کا پول کھول دیا ہے۔

اس حوالے سے سفارت کار کا یہ مطالبہ درست ہے کہ پاکستان کی حکومت کو جرأت مندی سے اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکا کو آگاہ کرنا چاہیے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے پورے عالم اسلام کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے ورنہ ذرائع ابلاغ کی دروغ گوئی اور الزام تراشی مسلمانوں کے لیے مزید مشکلات پیدا کرے گی۔ اس لیے ہنود، یہود اور نصرانیوں کی طرف سے عالم اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور سیاہ کاریوں کا جواب دینے کے لیے سفارتی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے ساتھ ساتھ امریکا اور یورپ میں دانش وروں اور اسکالروں کے ایسے وفود بھیجنے کی ضرورت ہے جو ان ممالک میں پاکستانیوں اور مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا موثر اور مستقل سدباب کرسکیں۔

ورنہ اگر امریکا نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو اختلاف کی یہ خلیج بڑھتے بڑھتے پھر کسی دوسرے ''ستمبر'' کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں کے مذہبی اختلاف کا مسئلہ ہے تو یہ آج کا نہیں بلکہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔ یہ اختلاف آغاز اسلام میں پیدا ہوا جب نبی کریم ﷺ نے ''خدائے واحد'' کا نعرہ بلند کیا اور دنیا کے تمام بتوں کو سرنگوں کردیا۔

بیبرس بند قدار

آیئے تیرہویں صدی میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ ہلاکو خان اور فرنگی متحدہ لشکر پیش قدمی کرتا ہوا ۱۲۵۹ء میں سرحد فلسطین تک پہنچا تھا کہ خاقان اعظم منگو خان اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ یہ خبر ہلاکو خان تک پہنچی تو وہ واپسی کے لیے مجبور ہوگیا۔ جاتے ہوئے وہ دس ہزار تاتاری فوج صلیبیوں کی مدد کے لیے چھوڑ گیا اس کا سردار کتغا خان تھا۔ یہ یروشلم سے ہوتا ہوا آگے بڑھا مگر غزہ کے میدان میں بیبرس بند قدار نے تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو زبردست شکست سے دوچار کیا اور تاتاری بلاد فلسطین سے نکل گئے اور بیبرس بند

قدار آگے بڑھ کر دمشق پر قابض ہو گیا اور اس کا ستارہ چمکنے لگا۔ یہ واقعہ ۱۲۶۰ء کا ہے۔

غزہ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے پاس انطاکیہ سے حمص الاکرار تک ساحل سمندر پر تیس قلعے بچ گئے تھے۔ ملک الظاہر بیبرس بند قدار اندرونی اصلاحات اور انتظامات سے فارغ ہوا تو اس نے صلیبیوں پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بیبرس بند قدار کو بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرح ہر وقت جہاد کا شوق لگا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۲۶۵ء میں صلیبیوں سے قیصریہ، عثلیث، حیفہ اور ارسوف کے قلعے چھین لیے اور دوسرے سال یافہ، انطاکیہ، بلفورٹ اور بعض دوسرے قلعوں پر قابض ہو گیا۔

یہ خبر جب یورپ پہنچی تو شاہ فرانس لوئیس نہم نے زبردست جنگی تیاریاں شروع کر دیں لیکن جیسے ہی وہ ساحل تیونس پر اترا۔ اسے اور اس کی فوج کو طاعون نے گھیر لیا۔ شاہ فرانس اس مرض کا شکار ہو گیا۔ اس مہم میں شاہ انگلستان ایڈورڈ اول بھی شریک تھا۔ وہ عکہ پہنچ چکا تھا کہ اسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی جس سے وہ بد دل ہو کر واپس چلا گیا۔

ادھر بیبرس بند قدار نے ۱۲۷۱ء میں حمص الاکرار اور عکہ کے سامنے نائٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر لیے اور عیسائی حملہ آوروں کے غرور کو توڑنے کے لیے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف بڑھا۔ وہ ایشیائے کوچک میں مصروف تھا کہ ۱۲۷۵ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اس پار سے حملہ آور ہوئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور ملک الظاہر بیبرس بند قدار کے ہاتھوں انہیں دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ملک الظاہر بیبرس بند قدار اس جنگ میں زخمی ہو گیا۔ افسوس کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور ۱۲۷۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن سلطان قلادون نے اسے الگ کر کے خود تخت و تاج سنبھال لیا۔

بار بار کی شکستوں سے صلیبیوں کے حوصلے پست ہو گئے لیکن ان کے دلوں میں بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھڑانے کی اب بھی آرزو تھی پس ۱۲۹۱ء سے ۱۳۱۰ء تک صلیبی جہاد کے نعرے لگاتے رہے۔ اس سلسلے میں انگلستان اور فرانس نے صلیبی جہاد کے لیے عشر بھی وصول کیا۔ نئے نئے منصوبے بنائے گئے مگر انہیں جنگ کی ہمت نہ ہوئی۔ ادھر ترکوں نے دریائے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنی دفاعی حیثیت خوب مضبوط کر لی۔

ایک صلیبی مورخ انتہائی مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے۔

"ہم یروشلم کی صلیبی ریاست بحال نہ کرا سکے جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد برسر پیکار رہے۔ اور آج بھی وہ مزار مسیح کے سائے تلے محو خواب ہیں۔"

اس کے بعد ۱۳۶۵ء سے ۱۳۶۷ء تک سائپرس، وارنا، نائیکو پوس وغیرہ مجاہد بن کر مصر و شام میں لڑتے رہے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بھی بہت سے پوپوں نے مذہبی جنگ کی تبلیغ کی مگر یورپ میں کسی جگہ کوئی حرارت نہ پیدا ہوئی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کی یلغار نے ترکی قبائل کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ ایشیاء کے مختلف علاقوں میں بھاگ نکلے۔ ان کا ایک قبیلہ جس کا سردار ارطغرل تھا اس نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کمزور فریق کا ساتھ دے کر اسے جنگ جتادی اور تاتاری بھاگ گئے۔ ارطغرل نے جس گروہ کی مدد کی تھی وہ سلطان علاؤالدین سلجوقی کی فوج تھی جسے ارطغرل نے مدد دے کر تباہی سے بچایا تھا۔

چنانچہ سلطان نے ارطغرل کو اس بروقت مدد کے صلہ میں دریائے سقاریہ کے بائیں جانب سفوت کا زرخیز علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔ ارطغرل نے اپنی شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ وہ ترکوں کے حلیف بن گئے۔ پھر اپنی قوتِ بازو سے ترقی کر کے سلطان سلجوق کا نائب بن گیا۔ پھر ارطغرل نے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو زبردست شکست دی۔ پس سلطان نے اس کی جاگیر میں اضافہ کر دیا۔

ارطغرل نے کبھی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا اور مرتے وقت تک سلطان قونیہ کا وفادار جاگیر دار رہا۔ ارطغرل کے مرنے پر اس کا بیٹا عثمان خان تخت نشین ہوا۔ اسی عثمان خان نے دولت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ سلطان علاؤالدین نے خوش ہو کر قراجہ حصار کا قلعہ اور نواحی مضافات عثمان خان کو دے دیے اور اپنا سکہ جاری کرنے، خطبہ میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جب ۱۳۵۹ء میں عثمان خان کا انتقال ہوا تو اس کا چھوٹا بیٹا اورخان ۴۲ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ یوں سلاطین عثمانیہ کا سلسلہ چل نکلا۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس خاندان کی پوری تفصیل بیان کی جائے مگر مجبوری یہ ہے کہ ہمارے اس ناول کا نام فلسطین (بیت المقدس) ہے اس لیے ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ مگر اس عثمانی سلطان اورخان کے زمانہ میں ایک ایسا تاریخ ساز اور رومان انگیز واقعہ پیش آیا جسے تقریباً ہر مورخ اور تاریخی ادیبوں نے کم و بیش پوری تفصیل سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس رومان کو اپنے قارئین کے گوش گزار کرنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔

اس رومانی کہانی کا نام بعض مورخین نے "تحفہ رونمائی"، اور بعض نے "جوزیفائن قیصران" لکھا ہے۔ بہرحال نام میں کیا رکھا ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ اب میں اس رومان کا آغاز کرتا ہوں۔

شاہی ہرکارہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قیصران کے پاس پہنچا۔

قیصران اپنے فوجی دستے کے ساتھ بروصہ کے میدان میں نیزہ بازی کی مشق کر رہا تھا۔ ہرکارے نے اسے پیغام دیا۔

"بارگاہ عالی میں آپ کو طلب کیا گیا ہے۔"

یہ اچانک اور بے وقت طلبی قیصران کے لیے پریشان کن تھی۔ قیصران نے اپنے سپاہیوں کو مشق جاری رکھنے کا حکم دیا اور ہرکارے کے ساتھ قصر سلطانی کی طرف روانہ ہوا۔

دولت عثمانیہ ترکی کا سلطان اورخان دربارِ خاص کے عقبی کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے قیصران کو وہیں باریابی کی اجازت دی۔

قیصران کمرے میں پہنچ کر تعظیم بجالایا۔ سلطان ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ اس کا چہرہ فکرمند تھا۔ قیصران سر جھکائے کھڑا تھا۔

سلطان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"قیصران! تم کبھی باب الامارت گئے ہو؟"

اس زمانہ میں قسطنطنیہ کو باب الامارت کہا جاتا تھا۔ یورشیا کے تمام سلاطین اور بادشاہوں کا خیال تھا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والا یورپ اور ایشیا کا شہنشاہ ہوتا ہے۔

قیصران نے ادب سے جواب دیا۔

"عالی جاہ! اس غلام کا بچپن تو قسطنطنیہ کی فضاؤں میں پروان چڑھا ہے۔"

"بہت خوب۔" یہ کہہ کر سلطان نے اس طرح سانس لی جیسے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہو۔ پھر

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ سلطان کی زبان سے قسطنطنیہ کا نام سن کر قیصران کا دل سینے میں اچھل پڑا تھا۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی دبا ہوا زخم ہرا ہوگیا۔

اس نے قسطنطنیہ میں آنکھ کھولی۔ پل بڑھ کر جوان ہوا۔ ماں بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئی تھی۔ خالہ نے قیصران کی پرورش کی تھی۔ خالہ کی بیٹی جوزیفائن اس کی منگیتر اور دل کی ملکہ تھی۔ دونوں کے باپ قسطنطنیہ سے دور ریاست نائیسا کی نصرانی فوج میں ملازم تھے۔ جس وقت عثمانی لشکر نے نائیسا پر حملہ کیا۔ قیصران اس وقت باپ اور خالو کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ وہ بھی فوج میں بھرتی ہونے کا خواہش مند تھا لیکن سلطان اور خان نے نصرانی فوج کو تہہ تیغ کر کے نائیسا پر قبضہ کرلیا۔ اس دارو گیر میں قیصران کا باپ اور خالو دونوں ہی مارے گئے اور وہ گرفتار ہوکر ترکوں کے صدر مقام "بروصہ" پہنچا دیا گیا۔

قیصران مسلمانوں کی بہادری سے پہلے ہی متاثر تھا۔ یہاں ان کا اخلاق دیکھا تو مسلمان ہوگیا اور خان کی نئی تنظیم ینی چری (انکشاری) میں شامل ہو گیا۔ انکشاریہ میں صرف وہ جوان قیدی شامل کیے جاتے تھے جو مسلمان ہوکر فوجی خدمات انجام دینا چاہتے تھے۔

سلطان کے خیالات کا سلسلہ شاید ٹوٹ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر قیصران کو مخاطب کیا۔

"قیصران! ہم تمہیں ایک اہم کام سونپنا چاہتے ہیں۔"

"یہ ظل سبحانی کی بندہ پروری ہے۔" قیصران نے جواب دیا۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہوسکتا تھا؟ سلطان کو یقیناً اس پر اعتماد تھا۔

سلطان کے چہرے پر کچھ بشاشت آئی۔ اس نے قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کوچ نما کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلطان نے ٹھہر ٹھہر کر پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"قیصران! آج کل قسطنطنیہ اور سلطنت بازنطین کے حالات ٹھیک نہیں۔ شہنشاہ قسطنطین کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ ملکہ اینا نے کمسن شہزادہ جان پلیوگس کو تخت نشین کیا۔ حکومت نادان بچوں اور ناتجربہ کار عورتوں سے نہیں چلا کرتی۔ ملکہ نے مجبور ہوکر ایک سردار کنٹا کوزین کو شہزادے کا ولی مقرر کیا۔ اب نام تو ملکہ اور شہزادے پلیوگس کا ہے لیکن تمام امورِ سلطنت بلاشبہ کنٹا کوزین کے سپرد ہیں۔ اب ملکہ اور کنٹا کوزین میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے اور کنٹا کوزین نے "نیکوڈیکا" پہنچ کر علم بغاوت بلند کیا ہے۔ اس وقت ملکہ کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے قسطنطنیہ کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہوجائیں۔ ہمارا فیصلہ سلطنت قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومت کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔"

سلطان خاموش ہوکر قیصران کو دیکھنے لگا۔ قیصران کو خیال گزرا کہ شاید سلطان اس کے جواب کے منتظر ہیں۔

"سلطان عالم ارشاد فرمائیں۔ میں اس سلسلے میں کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں؟"

"ہم تمہیں اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیج رہے ہیں۔" سلطان نے قیصران کو بغور دیکھا۔ "تم ملکہ سے مل کر یہ معلوم کرو گے کہ اس مدد کے معاوضہ میں وہ ہمیں کیا اور کہاں تک مراعات دیں گی؟"

قیصران نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد عرض کیا۔ "غلام اس حکم کی بجا آوری کے لیے کب روانہ ہوگا؟"

مگر سلطان نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک اور سوال کیا۔

"قیصران! تم نصرانی ہو؟"

"نہیں سلطان عالی مقام۔ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔" قیصران نے سنبھل کر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"ہم تمہارے جواب سے خوش ہوئے۔" سلطان بولا۔ "اور ہاں۔ قسطنطنیہ میں ٹھہر کر تمہیں یہ اندازہ لگانا پڑے گا کہ ملکہ کا عوام پر کس حد تک اثر ہے؟"

قیصران کی تو جیسے دل کی مراد بر آئی۔ ہر چند کہ اس نے قسطنطنیہ واپس جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا مگر کسی وقت اس کا دل قسطنطنیہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین ہوجاتا تھا۔ اس نے دل کے ایک کونے میں جوزیفائن کی یاد چھپا رکھی تھی۔ مسلمان ہوجانے اور عثمانی لشکر میں ایک ہزار انکشاری سردار ہوجانے کے باوجود وہ دل سے جوزیفائن کی یاد کو ختم نہ کرسکا تھا۔ اس کے دل میں کسی کسی وقت خیال آتا۔

"کیا جوزیفائن اب بھی میرا انتظار کررہی ہوگی؟"

پھر خیال آتا چار سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

دوسرے دن قیصران کو قسطنطنیہ جانے کا پروانہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی حکم تھا کہ روانگی سے پہلے وہ ایک بار سلطان کے سلام کو حاضر ہو۔

قیصران کو تنہا قسطنطنیہ جانا تھا۔ اس لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی مگر وہ یہ سوچ کر ضرور الجھ رہا تھا کہ سلطان نے اسے دوبارہ گفتگو کے لیے کیوں بلایا ہے۔

دوسری شام قیصران حسب الحکم پھر سلطان کی ملاقات کو قصر شاہی پہنچا۔ سلطان کو اس کی حاضری کی اطلاع دی گئی اور سلطان نے اسے فوراً طلب کرلیا۔ قیصران جب شاہ کے حضور پہنچا تو اس وقت سلطان بہت خوش نظر آرہا تھا۔ سلطان نے قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سنگ سرخ کے ایک ستون پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ قیصران کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ لوگ تو سلطان کی صورت دیکھنے کے لیے ترستے تھے مگر اس کی دو دن میں یہ سلطان سے دوسری ملاقات تھی۔

سلطان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے کہا۔

"قیصران! ہم نے کل رات ایک ہزار شکرانے کے نفل کا نذرانہ اللہ کے حضور پیش کیا۔ تم پوچھو گے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ذوالجلال نے آج سلطنت عثمانیہ کو یہ عزت و عظمت بخشی ہے کہ شہنشاہ بازنطین کی ملکہ ہم سے فوجی مدد کی خواستگار ہے۔"

قیصران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ پس اس نے شاہی ادب ملحوظ رکھتے ہوئے سلطان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سلطان، ستون سے ہٹ کر بالکل قیصران کے قریب آگیا۔ قیصران پاسِ ادب سے جھک گیا۔ سلطان مسکرایا اور بولا۔

"قیصران! تمہیں مبارک ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ ملکہ سے دوران گفتگو کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے سلطنت عثمانہ ترکی کے وقار کو ٹھیس پہنچے۔ ہم نے اپنے امراء پر تمہیں اس وجہ سے فوقیت دی ہے کہ تم ان سے زیادہ خلوص اور دیانت کے مالک ہو۔"

قیصران دراصل سلطان کے خسروانہ سلوک کی وجہ سے دبتا جارہا تھا اس لیے وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح سلطان کے سامنے سے ہٹ جائے مگر سلطان کی باتیں ختم ہونے کو ہی نہیں آرہی تھیں۔ چنانچہ قیصران نے سلطان کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

"اگر سلطان کا حکم ہو تو میں انکشاریوں کے لباس کے بجائے عام کپڑوں میں قسطنطنیہ کا سفر اختیار کروں؟"

سلطان نے چند لمحے قیصران کی تجویز پر غور کیا۔

پھر کہا۔

"بے شک...... بے شک۔ بلکہ یہ اور زیادہ بہتر ہو گا کہ تم ایک عام شہری کے لباس میں قسطنطنیہ میں داخل ہو۔ قیصران! ہم تمہاری عقل کے ابھی سے قائل ہو گئے ہیں۔ جو بات ہم بھول رہے تھے وہ تم نے یاد دلا دی۔"

سلطان اُورخان کے عہد میں سلطانی فوج میں دو طرح کے لشکر تھے۔ ایک تو عام ترکوں کا لشکر اور دوسرا انکشاریوں کا جو نصرانی اسیران جنگ پر مشتمل تھا۔ جس وقت اُورخان نے انکشاریہ کا لشکر ترتیب دیا تو شیخ المشائخ بکتاش کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کا طالب ہوا۔

شیخ نے اس نئے لشکر کے لیے دعا فرمائی اور خود انہوں نے اس کا نام "ینی چری" رکھا جو عربی میں انکشاری ہے۔ حاجی بکتاش اونچی ٹوپی پہنتے تھے جس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی تقلید میں سلطان نے حکم دیا کہ انکشاری لشکر کا ہر فرد سفید اونچی ٹوپی پہنے گا۔

قیصران جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی وردی یعنی سفید اونچی ٹوپی پہن کر قسطنطنیہ میں گیا تو فوراً پہچان لیا جائے گا کہ وہ نصرانی النسل ہے۔ اس لیے اس نے سلطان سے دوسرا لباس استعمال کرنے کی اجازت مانگی تھی اور سلطان اس وجہ سے اس کی دور اندیشی کا قائل ہوا تھا۔

پھر رات سونے سے پہلے قیصران ان تین بازنطینی سرداروں کے ساتھ قسطنطنیہ روانہ ہوا جو ملکہ اینا کا پیغام عثمانی سلطان کے پاس لے کر آئے تھے۔

❀❀❀

قیصران عام ترکی لباس میں بازنطینی سرداروں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ انہیں کسی طور پر بھی شبہ نہ ہوا کہ ان کا نیا ساتھی نہ صرف نصرانی النسل ہے بلکہ ان کا ہم وطن بھی ہے۔ بازنطینی سرداروں نے کئی بار قیصران سے گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر قیصران صرف ہاں، ہوں کر کے خاموش ہو جاتا تھا۔

قیصران عثمانی تربیت کی وجہ سے تیز رفتاری کا عادی تھا۔ اس کا گھوڑا بار بار ساتھیوں سے آگے نکل جاتا تھا اور اسے رک کر بازنطینی سرداروں کا انتظار کرنا پڑتا۔

بازنطینی اس کے قریب پہنچ کر پہلے اپنا سانس درست کرتے پھر آگے قدم بڑھاتے تھے۔ ایک بار تو قیصران کا گھوڑا اسے اس قدر آگے لے گیا کہ اسے ایک چشمے کے پاس ٹھہر کر کافی دیر تک ساتھیوں کا انتظار کرنا پڑا۔

بازنطینی قریب آئے تو وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان کے پیٹ میں سانس نہ سماتی تھی اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ قیصران کو ان کی حالت پر ہنسی آ گئی۔ اس نے سوچا مسلمانوں اور نصرانیوں میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے اسے یہ بات منہ سے نکالنا پڑی۔ جب نصرانیوں کے حواس درست ہوئے تو ان میں سے ایک سردار نے کہا۔

"قیصران! کیا تمہارا گھوڑا اتنی ہی تیز رفتاری سے دوڑتا ہے یا تم ہمیں پریشان کرنے کے لیے اسے تیز بھگا رہے ہو۔"

قیصران کو آخر دل میں آئی ہوئی بات کہنا پڑی۔ پس اس نے ہنس کے کہا۔

"معزز سردار! نصرانی سپاہی اور عثمانی سپاہی میں یہی سب سے بڑا فرق ہے۔ جو فاصلہ آپ تین دن میں طے کرتے ہیں وہ ہم ایک دن میں طے کر لیتے ہیں۔"

بازنطینی سردار کیا جواب دیتا۔ وہ تو بس قیصران

کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب بات آ ہی پڑی تھی تو قیصران نے خود ان سے کہا۔

"میرا نام قیصران ہے۔ مگر آپ کو یہ میرا نام کس نے بتایا؟"

ان سرداروں میں سے ایک نے جواب دیا۔

"ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ایک ہزار دستوں کے سردار ہیں۔"

قیصران کو بڑی حیرت ہوئی اور اب وہ سوچنے لگا کہ کہیں ان سرداروں کو یہ تو نہیں معلوم ہو گیا کہ میں نصرانی ہوں لیکن قیصران نے اپنے جذبات چہرے پر نہ آنے دیے اور صرف حیران نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

اور آخر ان سرداروں میں سے دوسرے سردار نے خود ہی اس معمہ کو حل کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "قیصران! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ باتیں ہمیں خود آپ کے سلطان نے بتائی ہیں۔"

قیصران کو قدرے اطمینان ہوا لیکن اس نے اپنے دل کی خلش دور کرنے کے لیے ان سے سوال کیا۔

"سلطان معظم نے میرے بارے میں آپ کو اور کیا کچھ بتایا ہے؟"

قیصران کے سوال پر سرداروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا پھر ان میں سے ایک بولا۔

"ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ سلطان کے بہت قریب ہیں۔ اتنے قریب کہ سلطان نے ملکہ قسطنطین کی درخواست پر جو کچھ فیصلہ کیا۔ آپ اس سے بھی آگاہ ہیں۔"

قیصران فوراً سمجھ گیا کہ مخالف سردار بڑی چالاکی سے سلطان کی آڑ لے کر اس کے منہ سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے مطلب کی ہو۔ چنانچہ جواب دینے سے پہلے قیصران جست لگا کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس کے فوراً بعد گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب قیصران کا گھوڑا آگے آگے اور مخالف سردار اس کے پیچھے پیچھے گھوڑے بھگاتے آ رہے تھے۔

بازنطینی سردار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ قیصران سے کچھ بھی نہ پوچھ سکے۔ قیصران نے کچھ آگے جا کر گھوڑا آہستہ کر لیا اور جب بازنطینی سردار اس کے پاس پہنچ گئے تو وہ سب ایک ساتھ چلنے لگے۔

قیصران کو قسطنطنیہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس نے اس سے پہلے سوچا بھی نہ تھا کہ اسے اپنا وطن دیکھنے کا موقع مل سکے گا یا وہ اس ارمان کو اپنے ساتھ ہی لے کر دنیا سے اٹھ جائے گا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کا دل کبھی کبھی یہ ضرور کہتا تھا کہ قیصران صبر کر۔ تو اپنی محبوبہ سے ضرور ملے گا۔ جوزیفائن بھی اسی آگ میں جل رہی ہے جس آگ میں تو سلگ رہا ہے۔

قیصران کو خود قسطنطنیہ پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ اس کا تیز رفتار گھوڑا بار بار زور کرتا کیونکہ وہ اور اس کا سوار اس سست روی کے عادی نہ تھے۔ قیصران مختلف راستوں سے بھی واقف تھا لیکن اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا پڑ رہا تھا۔ بازنطینی سواروں نے صاف اور طویل راستہ اختیار کیا تھا حالانکہ وہ اگر بحر اسود کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تو آبنائے باسفورس تک بہت جلد پہنچ سکتے تھے لیکن وہ بازنطینیوں کو شارٹ کٹ (مختصر راستہ) بتا کر کسی قسم کے شک وشبہ کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

آخر یہ لوگ خدا خدا کر کے تیسرے دن آبنائے باسفورس پر پہنچے۔ یہ آبنائے ایشیا اور یورپ کی حد فاصل ہے۔ آبنائے کے مشرقی جانب براعظم ایشیا اور مغرب میں براعظم یورپ ہے۔ اس وقت

بازنطینیوں کے تمام ایشیائی علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یورپ میں بازنطینی حکومت مقدونیہ اور یونان کے ایک مختصر اور محدود علاقے پر قابض تھی۔

قیصران کے پاس سلطنت عثمانیہ ترکی کا پروانہ راہداری تھا اور بازنطینی سرداروں کے پاس ملکہ قسطنطین کا اجازت نامہ تھا۔ اس لیے انہیں بارڈر پار کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ آبنائے باسفورس پار کر کے قسطنطنیہ کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی قیصران کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہی کوچہ و بازار، وہی رونقیں اور چہل پہل۔ پچھلے چار سال کے دوران قسطنطنیہ میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ شہر میں کہیں کہیں فوجی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔ امن کے زمانہ میں فوجی سواریاں یا گاڑیاں سڑکوں پر دکھائی نہ دیتی تھیں۔ لیکن آج کل فوجی سوار اور پیادے ادھر ادھر پہرہ دیتے اور گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ جنگ قسطنطنیہ سے ابھی بہت دور تھی۔ کنٹا کوزین نے نیکوٹیکا میں اپنا مستقر بنایا تھا اور فوجیں اکٹھی کر کے قسطنطنیہ پر ایک بڑے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا صرف اتنا ضرور تھا کہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کہیں نہ کہیں ہو جاتی تھیں۔

شہنشاہ قسطنطین کا شاہی محل ایک ایسی شان دار اور دیدہ زیب عمارت تھی جس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ایک زمانہ میں بازنطینی سلطنت یوریشیا (یورپ اور ایشیا) کی عظیم ترین حکومت تھی۔ اس لیے وہاں کے شہنشاہ کا محل بھی اس دور کے عظیم محلات میں سے ایک تھا۔ قیصران کو اس محل کو دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ لیکن کام کی اہمیت اور خیالات کے ہجوم نے قیصران کو اتنی مہلت نہ دی تھی کہ وہ اس نایاب اور نادرِ روزگار محل کی صناعیوں اور کاریگری کو اطمینان سے دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتا۔

شاہی محل پر جگہ جگہ پہرہ لگا تھا۔ بازنطینی سرداروں کو کئی جگہ رکنا پڑا۔ مگر دم کے دم میں پورے محل میں یہ بات پھیل گئی کہ ایک جوانِ رعنا سلطنت عثمانیہ کا سفیر بن کر قسطنطنیہ میں آیا ہے اور ملکہ عالیہ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ محل کی لونڈیاں، باندیاں، کنیزیں اور تمام ملازم ترک سفیر کو دیکھنے کے لیے روشوں، راہداریوں کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ کنیزوں کا یہ عالم تھا کہ وہ خوب صورت سفیر کو دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔

قیصران نے قبول اسلام کے بعد چھوٹی سی مگر خوب صورت داڑھی رکھ لی تھی۔ ہلکی ہلکی نوک دار مونچھوں نے اس کے چہرے کے رعب کو بڑھا دیا تھا۔ جنہوں نے منگولوں کو دیکھا تھا ان کے خیال میں ترک بھی منگولوں کی طرح بے ڈول اور بھیانک چہروں کے مالک ہوں گے۔ لیکن قیصران کو دیکھنے کے بعد انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ ان میں اور ترکوں میں صورت و شکل کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ اگر قیصران کی داڑھی کو نظر انداز کیا جاتا تو وہ بالکل نصرانی نظر آتا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ واقعی حقیقت میں نصرانی اور اسی شہر کا خاص باشندہ تھا۔

پتا نہیں قیصران کو کس کس نے دیکھا۔ لونڈیوں اور کنیزوں کا تو دیکھنے والوں میں میلہ سا لگ گیا تھا۔ پھر جب قیصران کو بازنطینی سردار اپنے ساتھ ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں لے گئے تب بھی قیصران کو دیکھنے آنے والوں کا تانتا سا بندھا رہا۔ قیصران نئے دلہا کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اگرچہ دلہا نہ تھا مگر مردانہ حسن و وجاہت کا پیکر ضرور تھا۔

اس دوران قیصران کو مطلع کیا گیا کہ ملکہ اپنا اس سے کل ملاقات کریں گی۔ ادھر قیصران اپنا گھر اور

محلہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھا مگر اب مجبوری تھی۔ وہ ملکہ سے ملے بغیر اور شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت حاصل کیے بغیر محل سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے اسے صبر کرنا پڑا۔ یا یوں کہیے کہ سینہ پر صبر کا پتھر رکھنا پڑا۔

اسی وقت محلات شاہی کا داروغہ حاضر ہوا اور اس نے ادب سے عرض کیا۔

”اے عالی مرتبت شاہی مہمان! مہمان خانہ میں تشریف لے چلیے۔“

قیصران کنیزوں کی تاک جھانک سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے داروغہ کی دعوت کو پذیرائی بخشی اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اگرچہ داروغہ محلات کے ساتھ جا رہا تھا مگر کنیزیں تھیں کہ اس کے اوپر ٹوٹی پڑتی تھیں۔ چنانچہ قیصران، کنیزوں کی بے تابی کا لطف اٹھاتا ہوا شاہی مہمان خانہ میں پہنچا۔ مہمان خانہ دیکھ کر قیصران کا دماغ گھوم گیا۔ ایسا سجا اور آراستہ و پیراستہ کمرہ اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فرش، دیواریں اور چھتیں ایسی کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ دنیا جہان کے نوادرات سے مہمان خانہ کو مزین کیا گیا تھا۔

قیصران کو تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر داروغہ بضد ہوا اور اس نے انتہائی خوشدلانہ انداز میں التجا کی۔

”اے معزز مہمان۔ شاہی حکم کے مطابق آپ کی دل بستگی کے لیے رقص و موسیقی کا تھوڑا سا انتظام کیا گیا ہے۔ آپ اجازت دیجیے تاکہ رقاصائیں اور مغنیاں حاضر ہو کر مہمان کی دل بستگی کا سامان کریں اور آپ کی تھکن دور ہو سکے۔“

قیصران کو رقص و موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے اس نے ہنگامہ ”ہاؤ و ہو“ کے بجائے داروغہ سے تنہائی کی درخواست کی۔ داروغہ نے مہمان کے حکم کے مطابق رقص و موسیقی کا پروگرام ختم کر دیا اور ذرا دیر میں کمرے میں سناٹا چھا گیا اور مہمان گاؤ تکیوں کے سہارے آرام کرنے لیٹ گیا۔

دراصل ملکہ نے حکم دیا تھا کہ مہمان کی تھکن دور کرنے کے لیے رقص و موسیقی کا دور ہو۔ پھر جام چھلکیں اور شراب و شباب کی محفل برپا ہو۔ یہ سب کچھ ملکہ کے حکم پر کیا جا رہا تھا تاکہ مہمان خوش ہو اور ملکہ کی عظمت کا اعتراف کر لے۔ مگر قیصران نے محفل ہاؤ ہو اور شراب و کباب سے انکار کر کے ملکہ کو پہلے ہی قدم پر شکست دے دی تھی۔ ملکہ بڑی جہاں دیدہ اور عیار عورت تھی۔ وہ قیصران کے انکار سے دل برداشتہ نہیں ہوئی اور دوسرے حملہ کے طور پر اُس نے یورپ کی اعلیٰ ترین مہنگی شراب گنگا جمنی صراحیوں میں بھروا کر یونان کی حسین و جمیل کنیزوں کے ہاتھ مہمان کے لیے بھجوائی۔

قیصران، ملکہ کے ان پے در پے حملوں سے قدرے گھبرا گیا۔ اس نے شراب و کباب اور محفل رقص و موسیقی سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ اب جو کنیزیں ساغر و مینا کے ساتھ مستانہ وار مہمان خانے میں داخل ہوئیں تو قیصران گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ حسن بے باک کے اس چمکتے دمکتے نظارے سے اس کا دماغ گھوم رہا تھا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے اس حسن بے باک کی اٹکھیلیوں سے بھی نظریں چرالیں اور داروغہ سے بڑی عاجزی کے ساتھ تنہائی اور قطعی تنہائی کی درخواست کی۔ یہاں تک کہ داروغہ کو مجبور ہونا پڑا۔ اس نے مہمان خانہ کو فوراً خالی کرنے کا حکم دیا اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ معزز مہمان کی طبیعت مکدر ہے۔ اس

لیے انہیں تنگ نہ کیا جائے۔

داروغہ محلات نے احتیاط کے طور پر دو حبشی غلاموں کا مہمان خانہ پر پہرہ لگا دیا اور سخت تاکید کی کہ کوئی کنیز مہمان خانہ میں نہ جانے پائے۔ کیونکہ قیصران نے داروغہ محلات سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر اسے شراب و کباب میں زبردستی الجھایا گیا تو وہ اس کی شکایت ملکہ سے کر دے گا۔ کیونکہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان اس قسم کی باتوں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب میں شراب حرام ہے اس لیے وہ یہ گناہ کرنے پر آمادہ نہیں۔

قیصران کو تنہائی میسر آ گئی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک تو اس کا وطن، دوسرے اس کے محبوب کا دیار۔ کھلے ہوئے دریچے سے آنے والا ہر جھونکا اس کے دل میں جوزیفائن کی یاد کو اور بھڑکا دیتا۔ کیونکہ وہ اس کے دل کی ملکہ اور منگیتر بھی تھی۔ بردصہ میں محبت کی چنگاری دبی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آ کر وہ چنگاری شعلہ بن کر اسے جلا رہی تھی۔

جوزیفائن کے خیالوں میں گم قیصران نہ جانے کب خواب کی نرم و نازک گود میں پہنچ گیا۔ مگر جوزیفائن نے خواب کی دنیا میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک پرفضا باغ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ سامنے قوس قزح کے رنگوں کی ایک بارہ دری ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جوزیفائن اس بارہ دری سے نکلی اور نازک نازک قدم اٹھاتی اس کی طرف آ رہی ہے۔ جوزیفائن کو دیکھ کر قیصران بے تاب ہو گیا اور جلدی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ سنگ مرمر کی نہر کے کنارے دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو گئے اور قیصران نے ”میری جوزیفائن“ کہہ کر اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

”ہوش میں آؤ قیصران! ہوش میں آؤ۔“

قیصران کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب میں اس کے سینے سے لپٹی ہوئی جوزیفائن اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”ہوش میں آؤ قیصران...... مجھے پہچانو...... میں ہوں تمہاری جوزیفائن۔ تمہاری جوزی۔“

قیصران کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیے۔ آنکھیں ملیں۔ دانتوں میں انگلی دبا کر زور سے کاٹی مگر جوزیفائن اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔ قیصران کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ اس نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جوزیفائن...... کیا واقعی تم جوزی ہو؟“

جوزیفائن مسکرا کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ آخر قیصران کو یقین کرنا پڑا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب قیصران نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔

”جوزی! تم یہاں کیسے آ گئیں؟ یہ تو شاہی مہمان خانہ ہے۔ پہرے داروں کو خبر ہو گئی تو غضب ہو جائے گا۔“

جوزیفائن نے قیصران کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ”گھبراؤ نہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اندر آ سکے۔“

”لیکن تم......“ قیصران کہتے کہتے رک گیا۔

”میں جوزیفائن ہوں۔ اور تمہاری آنکھوں کے سامنے بیٹھی ہوں۔ تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔“

جوزیفائن نے اس کے شک کو دور کرنے کی کوشش کی۔

قیصران کو یقین تو آ گیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ شاہی مہمان خانے کے اس کمرے میں جہاں ترکوں کا سفیر آرام کر رہا ہے۔ وہاں جوزیفائن کیسے پہنچی؟ کیا سارے پہرے دار اندھے ہو گئے ہیں یا پھر جوزیفائن انسانی پیکر کے بجائے......

"اچھا تو میں جا رہی ہوں۔ تم سوچتے رہو۔" جوزیفائن بستر سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔

قیصران کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے پھر سر کو ذرا سا جھٹکا دیا اور بولا۔ "اب مجھے بالکل یقین آ گیا ہے جوزی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں تمہارا تصور لیے ہوئے سو گیا۔ خواب میں تم سے ملا اور اب وہ خواب حقیقت بن کر میرے سامنے ہے۔ لیکن مجھے تمہیں اس جگہ دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی ہے اتنی ہی حیرت بھی ہے۔"

جوزیفائن مسکرائی اور بجلیاں گراتی ہوئی بولی۔ "تمہاری یہ حیرت بھی دور ہو جائے گی مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیسرین سے "قیصران" کس طرح بن گئے؟"

قیصران نے ادھر ادھر دیکھ کر جوزیفائن کو اپنے سے اور قریب کر لیا اور جواب دینے کی بجائے خود اس سے سوال کیا۔

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میرے آنے کی خبر کیسے ہوئی اور تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

جوزیفائن نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر اپنا سر قیصران کے سینے سے لگا دیا۔ جوزیفائن کو افسردہ دیکھ کر قیصران بھی افسردہ ہو گیا اور اس نے کہا۔

"جوزی! اب نہ گھبراؤ۔ اب ہم مل گئے ہیں تو کبھی جدا نہ ہوں گے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔"

"یہ اتنا آسان نہیں قیصران۔" جوزی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "تم سلطان ترکی کے سفیر ہو اور میں قسطنطین کے ولی عہد شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر جوزیفائن ہوں۔"

"شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر؟" قیصران نے دہرایا اور سوالیہ نظروں سے جوزیفائن کو دیکھنے لگا۔

جوزیفائن نے قیصران کے سینے سے سر اٹھایا اور آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"قیصران! پہلے تمہیں اپنی مختصر کہانی سنا دوں تا کہ تمہاری حیرانی دور ہو جائے اور تم اطمینان سے باتیں کر سکو۔"

قیصران گھبرا کے بولا۔ "ایسا نہ ہو کہ کہانی سناتے سناتے تمہارے جانے کا وقت ہو جائے اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔"

جوزیفائن بولی۔ "اس کی فکر نہ کرو۔ جب تک تم کہو گے۔ میں تمہارے پاس رہوں گی۔ ہاں تو میں نے کہا تھا کہ میں شہزادہ پلیوگس کی گرانڈ سسٹر ہوں اور شاہی محل میں میرا مرتبہ ملکہ اینا کے برابر ہے۔"

قیصران کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ حیران حیران نظروں سے جوزیفائن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے الجھتے ہوئے کہا۔ "مگر تم شاہی محل میں پہنچی کس طرح؟"

اور جوزیفائن نے اپنی کہانی شروع کی۔ اس نے بتایا۔

نائیسا کی جنگ میں خالو اور ابا کے مارے جانے کی خبر ہمیں ایک سپاہی کے ذریعہ ملی جو اس جنگ میں زخمی ہو کر یہاں آ گیا تھا۔ تمہاری اور دوسرے لوگوں کی گرفتاری کی خبر بھی ہمیں اسی شخص نے سنائی تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ عثمانی لشکر جس علاقے کو فتح کرتا ہے۔ وہاں بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو معاف کر دیتا ہے مگر جوانوں کو نہیں بخشتا۔ ان کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے ممی نے ابا کے ساتھ تمہیں بھی رو دھو کر صبر کر لیا تھا۔ مگر میرا دل اندر سے کہتا تھا کہ تم زندہ ہو اور ایک بار ہم ضرور ملیں گے۔"

(بلقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

دلّی کے بانکے

مشتاق احمد قریشی

زبانیں تاریخ مرتب کرتی ہیں اور تہذیب کا عکس ہوتی ہیں برصغیر میں ہر شہر اور صوبے کی اپنی زبان تاریخ اور ثقافت رہی ہے انگریز نے برصغیر میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے مسلمان اکثریت والے علاقوں اور شہروں میں زبان اور ثقافت پر حملے کر کے سب سے پہلے فارسی کو دیس نکالا کیا۔ پھر عربی کو مدارس تک محدود کر دیا۔ مقامی زبانوں کو گنوار اور جاہلوں کا کلچر قرار دیا اور خود ہندو بنیے کی مدد سے حکومت کرتے رہے۔ دلّی کے کرخنداروں کی بولی میں کیا لطافت، چاشنی اور خوب صورتی تھی اس کا اندازہ تو پاکستان تو دور کی بات ہے اب خود دلّی میں پیدا ہونے والی نسل بھی نہیں لگا سکتی۔ اس زبان پر عبور رکھنے اور سمجھنے والی اب آخری نسل کے چند بزرگ ہی رہ گئے ہیں آج کی نسل کو اس بولی سے آشنا کرنے کے لیے ہمارے بے حد اصرار اور ضد پر جناب مشتاق احمد قریشی قلم اٹھانے پر تیار ہوئے ہیں۔ یہ ایک صفحہ ابتدا ہے امید ہے قارئین کو یہ انداز تحریر پسند آئے گا اور محترم مشتاق احمد قریشی کو بھی مہمیز اور حوصلہ ملے گا کہ وہ اس بولی سے اپنے پڑھنے والوں کو محظوظ کرتے رہیں۔

"میاں زری سننا۔" آواز میرے پیچھے سے آئی تھی میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک بزرگ نما ہستی سفید براق کرتا پاجامہ میں نظر آئی پہلے تو میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا کیا شان تھی باریک ململ کا یا وائل کا کرتا، جس پر خوب صورت کڑھائی سے بیل بوٹے سجے تھے اس کے نیچے کروشیا سے بنا ہوا جالی دار بنیان سفید لٹھے کا پاجامہ چمک دار پمپ کا ورنش والا جوتا، جب وہ چلتے ہوئے قریب آئے تو جوتے کی چر چر کرتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"میاں آپ کس طرف جا رہے ہیں؟"

"کیوں۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میاں آپ تو ناراض ہو رہے ہیں۔ میں تو بس ذرا یہ پتا معلوم کرنا چاہ ریا تھا۔" اتنا کہہ کر انہوں نے ایک پرچہ میرے سامنے کر دیا جس پر کسی بھائی خلو (خلیل احمد) کا پتا درج تھا۔ میں نے پرچہ دیکھ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو بزرگوار ناراض ہو گئے۔

"میاں عجب آدمی ہو بھائی خلو کو نہیں جانتے، یہاں بڑے مشہور آدمی ہیں، دلی میں تو پورا محلّہ انہیں جانتا تھا یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالہ ہے جس سے پوچھو کچھ بتاتا ہی نہیں سب کے سب اپنی کھال میں مست چلے جا رہے ہیں کسی کو کسی کا ہوش ہی نہیں ہے۔ میاں ہماری دلی میں تو لوگ پورے شہر کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اگر کسی سے کوئی پتا معلوم کرنا ہو تو وہ نہ صرف پتا بتا دیتا ہے بلکہ پوچھنے والے کو اجنبی جان کر اُس پتے پر پہنچا بھی دیتا ہے۔ یہاں کی لنکا ہی نرالی ہے۔ یہاں تو سب ہی باون گز کے ہیں کسی کو کسی کا پتا ہی نہیں ہے۔ اچھا ان کا تو پتا ہوگا۔" اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پرچے کو پلٹ کر ہمارے سامنے کر دیا اور ساتھ گویا ہوئے یہ بھائی آشو اقو گھڑی ساز کا پتا ہے لیکن پرچے پر اشفاق احمد گھڑی والے لکھا تھا۔ کہنے لگے۔

"میاں یہ گھڑیاں مرمت کرتے ہیں بڑے پہنچے ہوئے کاریگر ہیں انہیں تو جانتے ہوں گے۔"

ہم نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا تو سامنے ہی سڑک کے پاس ایک گھڑی والے کی دکان نظر آئی جس پر ایک تختی پر لکھا تھا یہاں گھڑیوں کی تسلی بخش مرمت کی جاتی ہے۔ میں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بزرگوار سے کہا۔

"جناب آپ سامنے والی گھڑیوں کی دکان سے پتا کرلیں شاید انہیں پتا ہو۔" انہوں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔

وہ ایک دم سے چہک کر بولے۔

"میاں لو اسے کہتے ہیں بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا، وہ جو کہتے ہیں نہ دو گام چلو اور سامنے منزل آجائے۔ اس وخت تو یہاں وہی معاملہ ہوا ہے ہم اتی دیر سے جھک مار رہے ہیں لوگوں سے پوچھتے پھر رہے ہیں کوئی بتلاتا ہی نہیں، چلو میاں اللہ تمہیں خوش رکھے تم نے بڑا کام کیا ہے ہماری مشکل آسان کردی ہے آؤ اسی بات پر ایک پیالی چائے کی ہوجائے۔" اتنا کہتے ہوئے بزرگوار نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک پار چلنے کی کوشش کی۔ ہم نے لاکھ سمجھایا حضرت ہمیں آگے جانا ہے ضروری کام ہے۔

"تو میاں ہم کون سا تمہاری راہ کھوٹی کر رہے ہیں دو گھونٹ چائے کے بھر لینے میں کون سی دیر لگے گی کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی [illegible] آجاؤ تمہاری [illegible] کبھی کوئی گھڑی درست کرانا ہو یا خریدنا ہو تو تمہارا وہ بڑا خیال کریں گے۔ [illegible] ہم تو صبح سے پریشان ادھر اُدھر پھر رہے تھے رستہ ہی نہیں مل رہا تھا حالانکہ ہم آس پاس [illegible] رہے تھے۔ میاں [illegible] ایسے ہی چراغ تلے اندھیرا۔"

اب میں حیرانگی سے انہیں [illegible] تھا وہ [illegible] بولے جا رہے تھے [illegible] میں وہ ہمارا ہاتھ پکڑے بلکہ کھینچتے ہوئے سڑک پار دکان تک پہنچ چکے تھے [illegible] خود دکاندار بھی زیر لب مسکرا رہے تھے پھر انہوں نے مجھے اور ان بزرگوار کو [illegible] کے ساتھ رکھے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے ملازم کو چائے لانے کو کہا۔ میں نے تکلفاً اجازت چاہی کہ مجھے آگے اپنے کام سے جانا ہے دیر ہو رہی ہے۔ وہ بزرگ جھٹ سے بولے۔

"میاں ذری چھری [illegible] دم تو لو ایسی بھی کیا [illegible] کہ ابھی آئے ابھی چل دیے۔" تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہوگیا کہ بزرگ موصوف انڈیا کے شہر دلی سے اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں اور دکاندار کے وہ رشتہ میں ماموں لگتے ہیں۔ دلی میں وہ زردوزی کے کارخانے کے مالک ہیں ان کے کارخانے میں پندرہ بیس کاریگر کام کرتے ہیں دکاندار نے ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ دلی کے بڑے کرخنداروں میں شمار ہوتے ہیں درمیان میں بزرگوار بھی لقمہ دیتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے کارخانے میں چھ کارچوبیں لگتی ہیں جس پر پچیس سے تیس زردوز کام کرتے ہیں اور اگر کبھی زلدی (جلدی) کا کام ہوتا ہے تو اور کاریگر لگا دیے جاتے ہیں۔ پوری دلی میں چند ہی کرخانے ہیں جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے ان میں ہی ایک بڑا کرخانہ ہمارا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں سے کیسے اٹھ کر بھاگ نکلوں مجھے اپنے کام کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی بالآخر میں اچانک اٹھا اور سلام کہتا دکان سے نکل گیا۔